جرنیلی سڑک



رضا علی عابدی

BBC

جرنیلی سڑک

جرنیلی سڑک

پاک و ہند کی تاریخی شاہ راہ پر
مسافرت اور مشاہداتِ نو

بی بی سی لندن کی اُردو سروس کے
سلسلے وار پروگرام "جرنیلی سڑک" پر مبنی دستاویز

رضا علی عابدی

سعد پبلی کیشنز - کراچی

ناشر	سعد پبلی کیشنز ، ۲۱ ۔ اے محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔ ۷۵۳۵۰
سرِورق کی تخلیقی کاوش	مشیر صدیقی
خطاطی	عبدالشکور خرّم
پہلا ایڈیشن	مئی ۱۹۸۹ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں!

Hasnain Sialvi

عنوان

کتاب ایک خراج

جرنیلی سڑک تعمیر اور تقریر کے مرحلے سے گزر کر اب تحریر تک آ پہنچی ہے۔

وادیٔ پشاور سے سرزمین بنگالہ تک پندرہ سو میل لمبی یہ باضابطہ سڑک ساڑھے چار سو سال پہلے ہندوستان کے افغان بادشاہ شیر شاہ نے بنائی تھی۔ بعد میں اسے انگریز حکمرانوں نے وہ شکل دی جس میں آج یہ موجود ہے۔ ۸۶ء میں بی بی سی لندن کی اُردو سروس نے اس سڑک کو موضوع بناکر ایک ریڈیائی دستاویزی پروگرام نشر کیا۔ اب وہی پروگرام کتاب کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

یہ کتاب اُن دماغوں، اُن ہاتھوں اور اس خون پسینے کو ایک خراج ہے جنہوں نے راہ گیروں کو، جو ہمارے ہی آبا و اجداد تھے، ایک راہ گزر عطا کی جو ہماری سرزمینوں کی شہ رگ بن گئی اور جس میں صدیوں بعد آج بھی زندگی رواں دواں ہے۔

برصغیر کی ہتھیلی پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کھنچی ہوئی یہ لکیر تاریخ کے دست شناسوں نے بار بار دیکھی ہے، غور سے دیکھی ہے اور اس میں مستقبل سے زیادہ ماضی کے ایسے ایسے منظر دیکھے ہیں کہ آنکھ کبھی سراپا حیرت بنی اور کبھی دیر تک خون رویا کی۔ کیسے کیسے مسافر، قافلے، کاروان اور لشکر اسی راستے آئے اور یا تو خود اس کے رنگ میں رنگ گئے یا اس کا رنگ و روپ بدل ڈالا۔ کچھ خالی ہاتھ آئے اور آکر مالامال

ہوئے، کچھ بڑے بڑے عزائم سے لدے پھندے آتے اور اس راہ میں لٹ گئے اور کچھ ہاتھ جھلاتے آئے اور جھولیاں بھر بھر کر لوٹے۔

آنے جانے والوں کا یہ سلسلہ کبھی بند نہیں ہوا۔ یہ آج بھی جاری ہے اور کون جانے کب تک جاری رہے گا۔ اب سڑک کے راستے جو قافلے اور کارواں اِن سرزمینوں میں آتے گئے ہیں ان میں لاچار و مجبور انسان سے لے کر فکر و شعور کے رجحان تک سو طرح کے مسافر ہیں۔ ان میں ایسے لشکر بھی ہیں کہ نہ اُن کے قدموں کی چاپ ہے، نہ اُن کے اونٹوں کی گھنٹیاں۔ نہ انہیں راہ میں شجر سایہ دار درکار ہیں، نہ سرائے، باؤلی اور کوس مینار۔ نئے دور کے یہ نئے قافلے دلوں میں گھر کر رہے ہیں اور ذہنوں میں پڑاؤ ڈال رہے ہیں۔

یہ کتاب ان ہی نئے پرانے لشکروں کی داستان ہے۔

ایک داستان خود اس کتاب کی بھی ہے۔

میں نے ۸۲ء میں ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کر کے یہ دیکھا تھا کہ ہماری قدیم کتابیں، مخطوطے اور دستاویزیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس دورے کی بنیاد پر بی بی سی کی اردو سروس نے پروگرام کتب خانہ نشر کیا جس کی مقبولیت اور سامعین کے اصرار کو دیکھتے ہوئے "کتب خانہ" کو کتاب کی شکل بھی دی گئی۔ پھر میرے دوسرے دورے کا وقت آیا۔ یہ بات ۸۵ء کی ہے۔ اس وقت پہلا سوال یہ اٹھا کہ اس دورے کا عنوان کیا ہو، اب کس موضوع پر پروگرام ترتیب دیا جائے۔ بہت سے ساتھیوں نے بہت سے عنوان سوچے کہ ایک روز اردو سروس کے اُس وقت کے سربراہ ڈیوڈ پیج یہ تجویز لے کر آئے کہ کیوں نہ پشاور کو کلکتے سے ملانے والی گرینڈ ٹرنک روڈ کو اپنا موضوع بنایا جائے۔

یہ ایسی جی کو لگنے والی تجویز تھی کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ خود میرا تو یہ حال ہوا کہ اسی رات شیر شاہ کی تاریخ پڑھ ڈالی اور اگلے چند دنوں میں سارا بنیادی مطالعہ کر لیا اور جس وقت روانگی کی گھڑی آئی، میرا سارا ہوم ورک مکمل تھا۔

جی ٹی روڈ پر میں نے یہ سفر ۱۹۸۵ء کے موسم گرما میں کیا تھا۔ اس کتاب میں سارے مشاہدے اُسی برس کے اُسی موسم کے ہیں۔ اُس کے بعد اس خطّے پر جو کچھ گزری میں نے کتاب میں اُس کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ اُسی وقت لب پہ آچکا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دنیا کیا سے کیا ہو چکی تھی۔

یہ کتاب دیکھنے میں سفر نامہ ہے مگر یہ سفر نامہ نہیں۔ کبھی کبھی اس پر تاریخ کی داستانوں کا گماں بھی ہو گا۔ یہ تاریخ کی داستان بھی نہیں۔ یہ کتاب حالیہ دہائیوں میں آنے والے غیر معمولی سماجی تغیّر کا مشاہدہ ہے۔ معاشرے کو کن عوامل نے یک بیک بدل ڈالا، یہ ان عوامل کا تجزیہ ہے۔ جو نسل برصغیر کی حالیہ تاریخ کو بدل دینے والے حالات کی گواہ ہے، یہ اس کی گواہی ہے۔ اور جو نسل اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی ہے، یہ کتاب اُس نسل کے ذہنی کرب سے عبارت ہے۔ کتاب میں ان ہی سنجیدہ عبارتوں کو سفر ناموں اور داستانوں کے اسلوب میں لکھا گیا ہے تاکہ بات وہاں تک پہنچ جائے جہاں اسے پہنچنا چاہیئے۔

یہ کتاب دوسری کتابوں سے ایک اَور طرح بھی مختلف ہے۔

چونکہ یہ کتاب ایک ریڈیو پروگرام کے مسودے پر مبنی ہے اس لئے اس کی ساری تحریر گفتگو کی زبان میں ہے۔ پشاور سے کلکتے تک جن بیسیوں بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں کے انٹرویو اس میں شامل ہیں ان کا علاقائی لب ولہجہ اور روزمرہ بات چیت کا انداز جان بوجھ کر جوں کا توں رکھا گیا ہے۔ جو لوگ اسے تسلسل سے پڑھیں گے وہ جیسے جیسے آگے بڑھیں گے، لب ولہجے اور اندازِ بیاں میں آنے والی بتدریج تبدیلی سے محظوظ ہونگے۔

راہ میں جو انٹرویو لئے گئے ہیں ان کے بارے میں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ان میں سب نہیں لیکن میرے بیشتر راوی راستے میں ملنے والے عام باشندے، سادہ لوح لوگ

اور کہیں کہیں ان پڑھ دیہاتی بھی ہیں۔ اُن کے متعلق بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضعیف الاعتقاد ہیں، توہم پرست ہیں اور تاریخ کے جو قصّے سینہ بہ سینہ چلتے ہوئے ان تک پہنچے ہیں وہ مسخ شدہ ہیں اور سراسر غیر مصدقہ ہیں۔ ہوں گے۔ لیکن میں نے ان لوگوں کی باتوں کو رد نہیں کیا ہے بلکہ دیانت داری سے ویسا کا ویسا نقل کیا ہے۔ باشعور قاری اور تجسس کا مارا ہوا محقق، دونوں ان باتوں کا لطف اٹھائیں گے کیونکہ لوگ جو کہانیاں بنا لیتے ہیں وہ فضا میں معلق نہیں ہوتیں۔ یہ بات طے ہے۔

ایک اور بات بہت ضروری ہے۔ مہینے بھر کے اس سفر کے دوران میں نے بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ سنا اور ہر ذی شعور کی طرح اس کا اثر قبول کیا۔ اُسے بیان کرتے ہوئے میں مصلحتوں اور نزاکتوں کے الجھاوے میں نہیں پڑا۔ یہ میری تحریر ایک پیشہ ور صحافی یا براڈ کاسٹر سے زیادہ ایک حسّاس دل اور ذہن کی سیدھی سیدھی سی گفتگو ہے۔ اس میں جو رائے قائم کی گئی ہے اور جو نتیجے نکالے گئے ہیں وہ میرے ہیں، کسی ادارے کے نہیں۔

ایک اور ضروری وضاحت یہیں ہو جائے تو اچھا ہو۔ اس کتاب کے جو قاری راہ کے جن علاقوں سے آشنا ہیں ان کا حال پڑھتے ہوئے یقیناً یہ محسوس کریں گے کہ اس میں بہت سے مقامات کی بات چھوٹ گئی ہے اور بہت سے لوگوں کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ توضیح یہ ہے کہ اوّل تو راستے کے ایک ایک مقام اور ایک ایک قابلِ ذکر شخصیت کی مکمل، مفصل اور جامع فہرست ترتیب دینا نہ تو اس کتاب کا مقصد ہے، نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ اس لئے براہ کرم معاشرتی تغیر کے موضوع پر نگاہ رکھئے اور فروگزاشت کو میری کم نگاہی نہ سمجھئے۔ جو باتیں بالکل سامنے کی ہیں، جن حقائق سے ایک عالم واقف ہے ہیں اُن کی تفصیل میں نہیں گیا۔

اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پندرہ سو میل کے اس سفر کی یہ ساری داستان مجھے پندرہ پندرہ منٹ کے ۳۶ پروگراموں میں بہر طور کہہ دینی تھی۔ میں نے یہ حکمت اختیار

کی کہ جس چیز کا بیان ہو، اُس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو انصاف کیا جائے اور جس چیز کے بغیر کام چل جائے، اس کے ذکر کے بغیر کام چلایا جائے۔ ایسے مقام آتے ہیں جہاں اُلجھی ہوئی پوری گفتگو سے سلجھی ہوئی ادھوری گفتگو اچھی۔

'جرنیلی سڑک'، کے ہر پروگرام کا وقت یا دورانیہ محدود ہونے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کتاب کا کوئی باب طولانی نہیں۔ تھک کر چور ہو جانے کے لئے میں تنہا بہت تھا۔ اس بوجھ میں اپنے قارئین کو شریک کرنا مجھے منظور نہیں۔

اس کتاب میں جتنی باتیں صحیح اور دلچسپ ہیں وہ سب میرے میزبانوں رہبروں اور مددگاروں کی دین ہیں، اور جو کہیں نقص یا غلطی ہے، اس کا تمام تر ذمے دار میں ہوں اور ایسے مقامات چند نہیں، بہت سے ہوں گے۔

اس کتاب کی تکمیل میں اور اس سفر کے لئے میرے حوصلے بڑھانے میں جنہوں نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے امنگ عطا کی ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے سوچتا ہوں مگر لفظ نہیں ملتے۔ اجنبی شہروں، ان دیکھے قصبوں، دور دراز دیہات، تاریخی مقامات اور تعلیمی اداروں میں جن بے شمار احباب نے ہاتھ بٹایا اور ساتھ نبھایا، ان کی رفاقت اور محبت نے مجھے یہ احساس دلایا کہ مضامین نہیں، مضامین کا سبب بننے والے غیب سے آتے ہیں۔ ان کی فہرست طویل ہے مگر وہ جانتے ہیں کہ میرے دل و دماغ کی لوح پر ان کے نام کیسے احساس تشکر کے ساتھ ثبت ہیں۔

پھر اس کتاب کی ترتیب، تحریر، طباعت اور تقسیم میں میرے ساتھیوں، عزیزوں اور دوستوں کی مجھ پر بڑی عنایات ہیں۔ ان کے شکریے کی یہ سطر لکھ کر صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ ہاں اب یہ کتاب تکمیل کے قریب پہنچی۔

اور آخر میں اُن کا شکریہ جو شہروں میں، دیہات میں، پہاڑوں پر، صحراؤں میں، اجالے میں، اندھیرے میں، شور میں، سناٹے میں، کسی چھوٹے سے ریڈیو سے کان لگائے، کسی

دور کی آواز پر دھیان دیتے میرے پروگرام سنتے ہیں اور پھر دنیا کی مصروفیتوں سے وقت نکال کر وہ تھوڑی سی سطریں لکھ بھیجتے ہیں جو بہت سے حوصلے بڑھاتی ہیں۔ وہ جو میرے سامعین ہیں، سوچتا ہوں کہ وہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا، لہٰذا ان کا شکریہ کہ وہ مجھے عزیز رکھتے ہیں، میں انہیں عزیز جانتا ہوں۔

ان کے شکریے کی یہ سطریں لکھنے کے بعد، ہاں اب یہ کتاب مکمل ہے۔

رضا علی عابدی

جمعہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء

بی بی سی،

اردو سروس،

بش ہاؤس،

لندن۔ ڈبلیو سی ۲۔

حکمرانوں کی حکمت

کلکتے تک جرنیلی سڑک کا اپنا پندرہ سو میل کا سفر شروع کرنے کے لئے میں پشاور پہنچا۔ وہی صبح کی دُھند میں ڈوبا ہوا کسی پُرانے زمانے کا شہر، وہی سویرے سویرے روانہ ہونے والی بسوں کے شور میں دبی ہوتی مُرغ کی بانگ اور نئی نئی پیلی دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے مغلوں اور درّانیوں کی مسجدوں کے بلند قامت مینار۔

مجھے اُس جگہ کی تلاش تھی جہاں سے جرنیلی سڑک شروع ہوتی تھی۔ اُس پہلے پتھر کی جستجو تھی جو اس عظیم شاہراہ کا زیرو پوائنٹ کہلاتا ہوگا۔

کسی نے مجھے بتایا کہ صدر کے علاقے میں جس جگہ پرانا ڈاک بنگلہ تھا وہیں سڑک کے کنارے ایک بڑا سا سفید پتھر کھڑا نظر آیا کرتا تھا۔ جی ٹی روڈ شاید وہیں سے شروع ہوتی تھی، مگر اب کچھ عرصے سے وہ پتھر نظر نہیں آتا۔

یہ سُن کر میں زیرو پوائنٹ کے پتھر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جہاں سرکارِ انگلیشیہ کا ڈاک بنگلہ تھا، وہاں اب کنکریٹ کی اونچی عمارت کھڑی تھی اور اس کے سامنے سڑک کے کنارے ایک بڑا سا میل کا پتھر اوندھا پڑا تھا، جیسے اُسے دھکیل کر نالی کے اوپر پُل بنا دیا گیا ہو۔

میں لپک کر اُس کے قریب گیا اور جُھک کر غور سے دیکھا۔ ایک صدی پرانے

اس پتھر کے سارے نقوش اب مِٹ چکے تھے البتہ اُس پر کھُدا ہوا ایک بڑا سا گول صِفر یوں نظر آیا جیسے وہ پتھر حیرت سے مُنہ کھولے مجھے دیکھ رہا ہو۔

یہی جرنیلی سڑک کا پہلا پتھر تھا۔

اُس پر مجھے یوں جھکا دیکھ کر ایک آٹو رکشہ والا میرے قریب رُک گیا۔ میں نے اپنا تھیلا دوبارہ کاندھے پر لادا اور رکشہ والے سے بولا :- چلو گے ؟

اُس نے پوچھا : کہاں چلیں گے ؟

میں نے کہا : کلکتہ

اُس نے کہا : بیٹھ جائیے

وادیوں میں ، پہاڑیوں پر ، سبزہ زاروں اور سپاٹ کھیتوں میں دوڑتی ہوئی یہ سڑک اب ساڑھے چار سو سال پرانی ہو رہی ہے ۔ وادیٔ پشاور سے گزر کر ، دریائے کابل کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اور دریائے سندھ پار کرتی ہوئی یہ سڑک حسن ابدال پہنچتی ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں دِلّی اور کابل کے درمیان سب سے دل کش پڑاؤ تھا۔

پھر عظیم الشان شہر ٹیکسلا کے سنسان اور ویران کھنڈروں پر عبرت کی نگاہ کرتی ہوئی یہ سڑک مارگلا کی پہاڑی کے اُس کٹاؤ کے قریب پہنچتی ہے جس میں گزر کر کوہ ہندوکش کی طرف سے آنے والے اَن گنت کارواں ، قافلے اور لشکر ہندوستان میں اُترے ہوں گے اور جس کے راستے دولت لوٹ لوٹ کر لے جانے والی فوجیں لوٹی ہوں گی ۔

وہاں سے راولپنڈی کو چھوتی ہوئی اور شیر شاہ کے قلعہ رہتاس سے بچ کر نکلتی ہوئی یہ سڑک جہلم شہر میں عمارتی لکڑی کے آروں کا شور سنتی ہوئی گجرات پہنچ جاتی ہے اور محبوب سے ملنے کے آرزو مندوں کی طرح کچے گھڑے پر تو نہیں البتہ سو برس پرانے

آہنی پُل کے راستے پار اتر جاتی ہے اور پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ اور جیالوں کے شہر لاہور سے بغل گیر ہوتی ہوئی یہ جرنیلی سڑک پاکستان کو خیر باد کہتی ہوئی امرتسر میں داخل ہوتی ہے۔

پھر جالندھر اور لدھیانہ جیسے شہروں سے چلتی ہوئی اور تاحدِ نگاہ ہرے ہرے کھیتوں سے گزرتی اور نیلے نیلے دریاؤں کو پار کرتی ہوئی، سرہند کے آستانے پر جبینِ عقیدت دھرتی ہوئی یہ سڑک انبالہ پہنچتی ہے۔ اس کے آگے کروکشیتر، کرنال اور پانی پت ہے اور پھر دلّی!

یہاں سے انگریزوں کی جی ٹی روڈ علی گڑھ، ایٹہ اور گنگا سے ملنے کے اشتیاق میں قنوج کی طرف نکل جاتی ہے لیکن شیر شاہی سڑک جمنا سے اپنا رشتہ نہیں توڑتی اور سیدھی آگرہ پہنچ کر دم لیتی ہے۔

اس کے بعد کان پور آتا ہے اور پھر الہ آباد جس کے بیچوں بیچ گزرتی ہوتی اور باغی شہزادوں کی قبروں اور عظیم بادشاہوں کے قلعوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر یہ سڑک بنارس میں نکلتی ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہوئی یہ سڑک اب بہار میں داخل ہوتی ہے اور سہسرام پہنچتی ہے جہاں اس شاہراہ کا معمار اور خاندانِ سوری کا شیر اپنی جاگیر کی ٹھنڈی خاک پر رخسار ٹیکے سو رہا ہے۔

پھر کارخانوں اور معدنی کانوں کے علاقے سے گزرتی ہوئی یہ سڑک دھنباد سے رخصت ہوکر آسنسول سے جاملتی ہے اور بنگال کی بارشوں میں بھیگتی، آنچل نچوڑتی یہ جرنیلی سڑک اُس کلکتے پہنچ جاتی ہے کہ کوئی اس کا ذکر کرے تو سینے پر ایک تیر سا لگتا ہے۔

تو ہم اِسی راستے اپنا سفر طے کریں گے اور دیکھیں گے کہ راہ میں کیسے کیسے مقام آتے ہیں۔ مگر سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ سڑک کب بنی، کس نے بنائی اور کیوں؟۔ قدیم جرنیلی سڑک سے ذرا ہٹ کر جدید اسلام آباد میں نامور تاریخ داں ڈاکٹر احمد حسن دانی اس موضوع

اور مضمون کے بڑے دانا ہیں۔ میں ان سے یہی باتیں کر رہا تھا کہ اس سڑک کی تعمیر میں کیا حکمت تھی؟۔ غالباً ہندو کش کی طرف سے آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور ہندوستان کے دفاع کی خاطر اسے بنایا گیا ہوگا۔ دانی صاحب نے کہا:

"آپ نے یہ بجا فرمایا کہ اس کا پہلا مقصد تو دفاع ہی تھا اور چونکہ شیر شاہ خود پٹھان تھا اور اس کی فوج میں وہ پٹھان سپاہی بھرتی ہوتے تھے جو اُس کے اپنے علاقے سے آتے تھے، تو اُس علاقے کو جانے کے لئے ایک گزرگاہ بنانا ضروری تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُس کی سڑک اٹک نہیں گئی بلکہ نیلاب اور نیلم گئی۔ جہاں سے کہ نیازیوں کو، لودھیوں کو، سوریوں کو، شیرانیوں کو فوج میں بھرتی کر کے وہ لے جا سکتا تھا۔

دوسرا جو اہم مقصد تھا وہ تجارت تھی۔ قدیم زمانے سے ہندوستان میں جو چیزیں پیدا ہوتی تھیں یا جو صنعتیں وہاں قائم تھیں ان کا مال خشکی کے راستے جایا کرتا تھا۔ قدیم زمانے میں اشوک نے ایک سڑک بنائی تھی۔ اُس کے بعد کشانوں نے سڑک بنائی تھی اور ہندوستان کا سب سے زیادہ مال اُس خشکی کے راستے مغرب کی طرف جایا کرتا تھا۔

اسی کو فروغ دینے کے لئے شیر شاہ نے یہ سڑک بنائی"۔

اس کے علاوہ دانی صاحب نے بتایا کہ اُس زمانے میں سمندر کے راستے سفر کرنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ وسطی ایشیا اور ایران سے لوگ خشکی ہی کے راستے آتے تھے یا اسی راستے لوگ وہاں جاتے تھے۔ اُس وقت کی سواریاں مختلف تھیں۔ لوگ ہاتھی پر یا گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ بے شمار لوگ پیدل چلتے تھے۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ نہ صرف سڑک ہو بلکہ راستے میں کھانے پینے اور ٹھہرنے کا انتظام ہو چنانچہ کنوئیں، باولیاں، مسجدیں اور سرائیں بنوائی جاتی تھیں۔

سرائے دو کام آتی تھی۔ ایک تو ٹھہرنے کے، اور دوسرے کاروبار اور لین دین کے:
اُس وقت کی سرائے میں بڑے بڑے سودے طے ہوتے تھے اور بھاری لین دین ہوتا تھا۔
اسی لئے شیرشاہ نے یہ سڑک بنوائی تاکہ بنگال میں سُنار گاؤں سے لے کر، جو کہ مشرق میں
اُس کا صدر مقام تھا، دریائے نیلاب تک، جو اُس کے مُلک کی آخری حد تھی، آسانی سے
آیا جایا کریں۔ عام لوگ بھی، تاجر بھی اور فوجیں بھی۔

اس بارے میں الہ آباد یونیورسٹی کے تاریخ کے اُستاد ڈاکٹر رادھے شام نے بعض
بڑے اہم معاملوں پر روشنی ڈالی۔ بادشاہ یہ سڑکیں کیوں بناتے تھے؟ ان کے کنارے سرائے،
مسجدوں، مٹھوں، دائروں اور زیارت گاہوں میں کیا ہوتا تھا؟ مجھے اِن سوالوں کے دلچسپ
جواب ملے۔ پہلے میں نے ڈاکٹر رادھے شام سے پوچھا کہ کیا برِصغیر کا یہ علاقہ بہت ترقی یافتہ
تھا اس لئے یہ سڑک بنی یا اس سڑک کے بننے سے علاقے نے ترقی کی؟ انہوں نے کہا:

"یہ پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ شیرشاہ سے بہت پہلے ہی اس سڑک کی تعمیر شروع
ہوگئی تھی۔ ویسے تو قدیم دور ہی میں سارے ملک میں سڑکوں کا جال بچھانے
کی کوششیں کی گئی تھیں لیکن سلطنت کے دور میں خصوصاً بلبن کے زمانے سے
میں سمجھتا ہوں سڑکوں کی تعمیر کا یہ کام شروع ہوا۔ مثلاً یہ کہ سڑک کو قصبے سے ملانا
ہے، دیہات سے ملانا ہے، تاکہ شاہی کنٹرول دیہات تک پھیل جائے اور
دیہات سے پورا محصول سرکار کو مل سکے۔ تو، جب بھی انتظامیہ اپنے ضلعی نظام
کو منظم کرتی ہے اور اس کی رفتار تیز کرتی ہے تو سب سے پہلے اس کا دھیان
سڑکوں کو ترقی دینے کی طرف جاتا ہے۔"

ڈاکٹر رادھے شام نے مزید بتایا کہ اُس دور میں سرائے کی بڑی اہمیت تھی۔ مسافر وہاں
ٹھہرتے تھے اور بتاتے تھے کہ کہاں سے آ رہے ہیں اور کس مقصد کے لئے کہاں جا رہے ہیں۔
یہ ساری اطلاعیں بادشاہ تک پہنچ جاتی تھیں۔ اس سڑک پر تمام مٹھ ملیں گے، دائرے

اور خانقاہیں ملیں گی، مسجدیں ملیں گی۔ وہاں بھی مسافر قیام کرتے تھے۔ وہ بھی ہر قسم کی اطلاعات لاتے تھے جو بالآخر بادشاہ کو پہنچا دی جاتی تھیں۔ اس طرح نہ صرف ملک کے اندر کی خبریں بلکہ بیرونِ ملک خبریں بھی مل جاتی تھیں اور کبھی کبھی بغاوتوں کو کچلنے یا بیرونی حملے روکنے میں اِن اطلاعات سے بہت مدد ملتی تھی۔

یہ ہوئے ڈاکٹر رادھے شام کے خیالات۔ ان سے پہلے مجھے پشاور یونیورسٹی کے استاد پروفیسر حسین خان صاحب سے بات چیت کا موقع ملا۔ شیر شاہ کی زندگی پر انہوں نے تازہ تحقیق کی ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ یہ سڑک اور ایسی ہی دوسری سڑکیں پہلے سے کہیں موجود تھیں؟ انہوں نے کہا:

"وہ سڑکیں یقیناً ہوں گی لیکن اس قسم کا باضابطہ نظام جو شیر شاہ سوری نے قائم کیا، ایسے نظام کی مثال قدیم ہندوستان میں نہیں ملتی، اور قرونِ وسطیٰ میں جب سلاطینِ دہلی نے حکومت کی، اس قسم کا نظام نہیں ملتا۔ بلبن نے سڑکیں ٹھیک کرنے کی کوشش کی، انہوں نے سڑکوں کی مرمت کی، راہ زنی ختم کرنے کی کوششیں کیں لیکن سائنٹفک خطوط پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ باغ نیلاب اور حضرو سے لے کر سنار گاؤں تک یہ شیر شاہی سڑک ہے۔ بعد میں ضرورت کے مطابق اس میں ردو بدل ہوتی رہی لیکن اصل سڑک یہی ہے۔

اس کے علاوہ شیر شاہ نے بھکر تک ایک سڑک بنائی۔ آگرہ سے خاندیش اور چتوڑ تک بڑی سڑکیں بنائیں جن کا مقصد فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی پیدا کرنا اور عام لوگوں کو فائدہ پہنچانا تھا۔"

میں نے حسین خان صاحب سے پوچھا کہ شیر شاہ نے اگر یہ سڑک عوام کی بھلائی کے لئے بنوائی تھی تو اس پر مسافروں کے لئے کیا سہولتیں تھیں اور اُن کے لئے کیا اہتمام تھا؟ انہوں نے کہا۔

وہ اس نے سترہ سو سرائیں بنائیں۔ ایک کوس کے فاصلے پر ایک سرائے ہوتی تھی۔ یہ اہتمام صرف جی ٹی روڈ پر نہیں بلکہ ملتان، خاندیش اور چتوڑ جانے والی سڑکوں پر بھی سرائیں تھیں۔ ان میں کھانے کے وقت ہر مسافر کو کھانا ملتا تھا۔ بیماروں اور زخمیوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ سرائے میں طبیب مقرر ہوتے تھے۔ وہاں آنے والے تمام مسافروں کے ناموں کا اندراج ہوتا تھا۔ دو کاتب ہوتے تھے، ایک ہندی میں لکھتا تھا اور دوسرا فارسی میں۔ مسافروں کے تمام کوائف لکھے جاتے تھے۔ اُن کے مویشی کو خوراک دی جاتی تھی جس طرح مسافروں کو خوراک دی جاتی تھی۔"

پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر حسین خان کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے اُردو کے استاد ڈاکٹر عقیل رضوی نے بھی شیر شاہی سڑک کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتائی۔ انہوں نے کہا۔

"یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اس سڑک کی دونوں طرف جو گاؤں بسے ہوئے ہیں وہ زیادہ تر مسلمانوں کے گاؤں ہیں، آج بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ان دیہات میں رہنے والے لوگ وہ فوجی تھے جو حکمران یہاں سے حاصل کیا کرتے تھے اور اس لئے بادشاہوں نے ان کو یہاں بسایا تھا۔ ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ چونکہ یہ مسلمان حکمرانوں کے لئے رسدگاہ بھی تھی اس لئے بھی ان کو یہاں بسایا تھا کہ کسی قسم کا خلل نہ پڑ سکے اور ان کی رسد باآسانی دلّی تک پہنچ سکے۔ انہوں نے اور بھی سڑکیں بنائیں لیکن جو اہمیت اس شیر شاہی سڑک کی ہے وہ اہمیت کسی دوسری سڑک کی نہیں۔"

عقیل رضوی صاحب کی اس بات پر یاد آیا کہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب شیر شاہ نے لاہور سے ملتان تک ایک عظیم الشان سڑک بنوائی تو اس کی دونوں جانب کی زمینیں اپنے لوگوں کو بطور جاگیر دے دیں۔ اب ان لوگوں کا کام یہ تھا کہ اُس زمین سے پیسہ کمائیں اور اپنے

اپنے علاقے میں اس سڑک کی دیکھ بھال کریں۔ اس کے کنارے درست رکھیں، ان پر بھوسا یا پرال بچھائیں اور کوئی خاص سواری گزرنے والی ہو تو سڑک پر پانی کا چھڑکاؤ بھی کریں۔

کیا عجب کہ شیر شاہ کی سڑکوں کی دونوں جانب آج بھی اُن ہی لوگوں کی اولادیں آباد ہوں۔

تو یہ ہوئی اب تک کی بات۔

یہ سارا سفر طے کر کے میں کلکتہ پہنچا تو پشاور کی طرح وہ پتھر ڈھونڈنے چلا جو اس سڑک کا آخری پتھر رہا ہو گا۔ کسی نے بتایا کہ جی ٹی روڈ کا سرا کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن کے صدر دروازے کے سامنے ہے۔ میں کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن کے صدر دروازے پر پہنچا۔ وہاں ایک صاحب کھڑے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا:

"کیوں صاحب! کیا یہ درست ہے کہ جی ٹی روڈ اس جگہ ختم ہوتی ہے؟"

انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولے "ختم ہوتی ہے؟ ارے صاحب، جی ٹی روڈ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔"

میں سوچنے لگا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ جو بات وہاں پشاور والے کہتے ہیں وہی بات یہاں کلکتے والے کہتے ہیں۔ یہ بھی خوش ہیں، وہ بھی خوش۔

شاید اسی کو حکمرانوں کی حکمت کہتے ہیں۔

خوب ہیں پشاور والے

میں پشاور کی جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑا تھا۔ اب وہاں نہ سجے دھجے تانگوں کے تومند گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں، نہ چوڑے چکلے سینوں والے نوجوانوں کے جوتوں کی کھٹ کھٹ اور نہ یا قربان کی اونچی صدائیں۔ اب وہاں افغان ٹرک تھے، جرمن ویگنیں تھیں اور جاپانی موٹر گاڑیاں تھیں۔ ڈاکے بھی روسی کلاشنیکوف چلا کر ڈالے جا رہے تھے۔ پشاور کی سڑکوں پر اب شور بھی خود پشاور کا نہیں۔

میں جن دنوں وہاں پہنچا، جی ٹی روڈ پر ڈاکوؤں کے مارے جانے کی خبر گرم تھی۔ ہوا یہ کہ ایک روز ڈاکو آئے اور اِس بھری پُری سڑک پر ایک بینک لوٹ کر لے گئے۔ اس سے بھی بڑی خبر یہ تھی کہ پولیس تین ملزموں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا پشاور شہر کے ایک نامہ نگار سبز علی شاہ نے بتایا:

"جس دن یہ پولیس اور ڈاکوؤں کا تصادم ہوا اُس دن پولیس کو اپنے مخبروں کے ذریعے اطلاع ملی کہ آج ڈاکوؤں کا وہی گروہ آئل ڈپو کو لوٹنے کیلئے آئے گا۔ چنانچہ وہاں پہلے سے پولیس کی پارٹیاں سفید کپڑوں میں مقرر کر دی گئیں اور آپریشن کے لئے ان کو ہدایت کر دی گئی۔ یہ تقریباً چھ بجے شام کا وقت تھا۔ ڈاکو جب وہاں پہنچے تو انہیں پولیس کی سرگرمیوں پر شک گزرا اور وہ

وہاں سے واپس ہونے لگے۔ پولیس نے جوں ہی ڈاکوؤں کو للکارا تو انہوں نے روسی کلاشنیکوف رائفلوں سے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ اس دوران ڈاکوؤں نے ایک دستی بم پھینکا جو خوش قسمتی سے پھٹ نہ سکا اور پولیس کی فائرنگ سے ڈاکو موٹر کار ہی میں ڈھیر ہو گئے۔ اس آپریشن میں چار ڈاکو ہلاک ہو گئے۔ ڈاکوؤں کی موٹر کار سے تین کلاشنیکوف، آٹھ دستی بم اور بعض دیگر جدید قسم کے ہتھیار بھی برآمد ہوئے اور اس طرح اس آپریشن میں ڈاکوؤں کے اس خطرناک گروہ کا صفایا ہو گیا اور وہ اپنے انجام کو پہنچے۔"

میں نے سبز علی شاہ سے پوچھا کہ یہ جو آپ نے بڑے بڑے ڈرا دینے والے ہتھیاروں کے نام لئے یہ یہاں شہری علاقوں میں اتنی آسانی سے کیسے پہنچ رہے ہیں؟

انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا" یہ جناب، علاقہ غیر چونکہ یہاں پشاور سے بہت ہی قریب ہے تو درہ آدم خیل سے، باڑے سے، لنڈی کوتل سے، چور راستوں سے یہ ہتھیار بڑی آسانی سے یہاں پہنچ جاتے ہیں"

کلاشنیکوف رائفل کی بات تو ہم بعد میں کریں گے، پہلے افغان پناہ گزینوں کی بات کہ جن کے آنے سے وہ پرانا زمانہ لوٹ آیا ہے جب آریاؤں کے قافلے افغانستان کی طرف سے برصغیر میں اترتے تھے۔ پشاور والے ان کی مثال سن کر مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں" وہ بھی کبھی واپس نہیں گئے تھے"

میں نے سبز علی شاہ سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ شہر میں اِدھر جو جرائم ہو رہے ہیں اُن میں افغان پناہ گزینوں کا ہاتھ ہے؟

انہوں نے کہا" جی ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک جو وارداتیں ہوئی ہیں ان میں افغان مہاجرین بھی ملوث پائے گئے ہیں لیکن اس سلسلے میں چونکہ ہمارا متعلقہ

حکام سے رابطہ رہتا ہے اور ان سے جب اس بارے میں ہم نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ افغان مہاجرین بعض وارداتوں میں ملوّث ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بحیثیت قوم کے وہ یہ کام کر رہے ہیں۔ اچھے اور بُرے آدمی ہر معاشرے میں اور ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

میں جن دنوں پشاور پہنچا افغان پناہ گزینوں کا بہت چرچا تھا۔ اُن کا نام لیتے لیتے پرانے باشندوں کے منہ میں کڑوا گھونٹ آجاتا تھا۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ سُنا ہے پشاور میں پشتو بولنے والے اقلیت میں اور ہندکو بولنے والے اکثریت میں ہیں؟۔ اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا" صاحب پشاور میں اب افغان پناہ گزین اکثریت میں ہیں۔"

شہر کے کسی پرانے باشندے کو تلاش کرتے کرتے میں نمک منڈی میں پروفیسر امداد حسین بیگ صاحب کے گھر پہنچا۔ ہجرت کی تحریک سے لے کر پاکستان کی تحریک تک اُنہوں نے کتنے ہی زمانے دیکھے ہیں اور مولانا ظفر علی خاں کی نظموں سے لے کر قائدِ اعظم کی تقریروں تک سب کچھ زبانی یاد ہے۔

ہجرت کا قصہ تو یُوں ہے کہ افغانستان کو ' دارالاسلام ' قرار دے کر اٹھارہ ہزار جوشیلے مسلمان برطانوی راج کی مخالفت میں افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ قافلے کے قافلے خیبر کی سمت رواں تھے۔ اُن دنوں مولانا ظفر علی خاں پشاور آئے تھے اور انہوں نے ایک نظم پڑھی تھی جو امداد حسین بیگ صاحب کو اب تک یاد ہے۔ اُس روز سنا رہے تھے۔

تازہ انصار کی آئینہ روایات کرو
جس میں اسلام کی عزت ہو وہی بات کرو
ساتھ خیبر بھی ہے اور اس میں علی مسجد بھی
دور کیوں جاتے ہو مرحب سے یہیں بات کرو

صاف کہہ دو کہ نہیں تم سے کسی بات میں کم
کسی انگریز سے جس وقت ملاقات کرو

پروفیسر امداد حسین بیگ صاحب کی شخصیت بڑی دلچسپ ہے۔ ان کے گھر میں درجنوں موٹے موٹے البم ہیں جو دنیا بھر کے سیاست دانوں کی تصویروں سے بھرے پڑے ہیں۔ اُس روز پرانے پشاور کی باتیں بتا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ یہاں قدیم خاندان آباد تھے اور دور دور سے لوگ چلے آتے تھے۔ پنجاب، یوپی اور بنگال تک سے لوگ آتے اور یہیں رہ گئے۔ تجارت بہت تھی، آب و ہوا اچھی تھی، زمین آسانی سے دستیاب تھی چنانچہ پشاور کی آبادی بڑھتی گئی۔ اس شہر میں ہندو گھرانے بہت تھے۔ اندر شہر تمام علاقہ ہندو تھا۔ بیگ صاحب خود اپنے محلے کے بارے میں بتا رہے تھے کہ یہ محلہ جوگن شاہ ہندوؤں سے آباد تھا۔ پھر دفعتاً سکھ آئے اور پشاور پر چھا گئے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ محلہ جوگن شاہ کا نام بدل کر انہوں نے جوگا سنگھ کر دیا۔ برِصغیر تقسیم ہوا تو مہاجرین آئے اور پشاور کی زندگی کے ہر شعبے میں شامل ہو گئے۔ اور اب افغانستان میں روسیوں کا عمل دخل ہوا تو نئی قسم کے مہاجرین کی نئی لہر آئی ہے۔ امداد حسین بیگ صاحب نے بتایا:

دو لاکھوں کی تعداد میں افغان اپنا وطن چھوڑ کر پشاور آ گئے ہیں اور پھر پشاور سے آگے جوں جوں انہیں موقع ملتا ہے وہ پنجاب کی طرف بڑھ رہے ہیں اور حکومت بھی اُن کی پوری امداد کر رہی ہے، ان کی رہائش کے لئے۔ تو ہمارے پشاور سے کتنے ہی میلوں تک، چالیس پچاس میل کے علاقے تک مہاجرین آباد ہیں۔ سڑک کے کنارے جتنے علاقے ہیں تمام آباد ہو گئے ہیں۔ یہاں جو افغان مہاجر آتے ہیں ان کی رہائش کے لئے، ان کی دیکھ بھال کے لئے، ان کی تعلیم کے لئے، اُن کے کاروبار کے لئے، ان کی تجارت کے لئے حکومت اور عوام ان سے پورا تعاون کرتے ہیں اور اس طریقے سے صوبہ سرحد کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا

ہے اور جس کا لازمی ردِ عمل یہ ہے کہ گرانی حد سے بڑھ گئی اور عوام الناس میں بہت بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور رہائش کی جگہ نہیں ہے۔ غذائی حالت خراب ہے اور گرانی نے لوگوں کی کمر توڑ دی ہے۔"

جی ٹی روڈ پر ہی میں نے افغان پناہ گزینوں کے اندراج کا دفتر دیکھا۔ قبائلی علاقوں کی طرف سے وہ موٹر گاڑیوں پر بیٹھ کر جوق در جوق آ رہے تھے اور اپنے نام لکھوا رہے تھے۔ جرمنی کی بنی ہوئی مسافر بردار گاڑیاں تھیں جن پر جرمن زبان ہی میں کچھ لکھا ہوا تھا، غالباً امداد میں ملی ہوں گی۔ لیکن بہت سے افغان جو اپنے ملک میں ٹرک چلانے کا کاروبار کرتے ہوں گے، اپنے ٹرک بھی ساتھ لے آئے تھے جو پھر میں نے پشاور سے لاہور تک ہر جگہ دیکھے۔ افغان ٹرکوں کی پہچان بہت آسان تھی۔ بڑے بڑے تھے، بدہیئت تھے اور اُن پر کوئی رجسٹریشن نمبر یا نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ انہیں یہ رعایت تھی کہ اپنے ٹرک نمبر پلیٹ کے بغیر چلائیں۔

میں نے گوجرانوالہ میں ایک اعلیٰ پولیس افسر سے پوچھا کہ اتنا ٹریفک رجسٹریشن کے بغیر چل رہا ہے، یہ افغان پناہ گزین آپ کو پریشان نہیں کرتے؟ پولیس افسر نے منہ سے کوئی جواب نہ دیا۔ سر سے ٹوپی اتاری اور مئی جون کی شدید گرمی میں پسینے سے شرابور پیشانی پر جو ہاتھ مارا تو اُس کے چھپاکے نے ساری بات کہہ دی۔

پشاور میں اُن دنوں گفتگو کا انداز خوب تھا۔ جب بھی کسی سے بات کی ذرا دیر بعد اُس میں افغان پناہ گزین، ہیروئن، روسی فوج اور کلاشنیکوف رائفل کا ذکر ضرور آ گیا۔ ایک اسکول کے استاد مجھے بتا رہے تھے کہ جماعت میں بچے اپنے ساتھ پلاسٹک کی رائفل کے کھلونے لاتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ قصہ ہر گھر کا ہے کہ بچہ ایک روز مچل گیا کہ اسے فوراً سامنے والی دکان سے کلاشنیکوف رائفل دلائی جائے ورنہ وہ گھر چھوڑ کر علاقہ غیر میں یا کسی نئے کار کے کیمپ میں چلا جائے گا۔

بڑوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ انہوں نے دوسری عالمی جنگ کی فرسودہ بندوقیں

پھینک کر کلاشنیکوف رائفلیں اٹھالی ہیں - اب اس سے کم پر عزت نہیں ملتی - جس کے پاس پرانی یا دیسی بندوق ہے وہ اب شرم کے مارے گھر سے نہیں نکلتا - جس طرح پرانے شکاریوں کے گھروں میں دیواروں پر بارہ سنگھوں کے پتھرائی ہوئی آنکھوں والے سر سجے ہوتے ہیں، پشاور کے حجروں میں اب دیواریں کلاشنیکوف رائفلوں سے آراستہ ہوتی ہیں - اب معاملہ یہ نہیں کہ کس کے پاس ہیں ؟ اب سوال یہ ہے کہ کتنی ہیں ؟

پشاور میں ہیروئن کا بھی بڑا چرچا ہے - جیسے جیسے مغرب والوں کی جیبیں خالی ہو رہی ہیں - اِدھر والوں کی تجوریاں بھر رہی ہیں - لوگ راتوں رات مالدار ہو گئے ہیں - میں ایک بزرگ سے باتیں کر رہا تھا - کہنے لگے کہ یہ جو پڑوس کا بڈھا ہے، اپنے گدھے کرائے پر چلایا کرتا تھا - اب ہیروئن کا دھندا چلا کر کروڑپتی بن گیا ہے - جیسے چرس نے اُس کے دن پھیرے، بہت سے دوسرے لوگوں کے دن بھی پھیرے -

روسی، اب پشاور کے ہر گھر میں موضوع گفتگو تھے - جنہیں روکنے کی خاطر انگریزوں نے کئی جنگیں لڑیں اور کئی فوجیں کٹوائیں وہ پہاڑوں کے اُس پار آ پہنچے تھے - لوگ ہراساں تھے - پشاور یونیورسٹی کے ایک استاد سے گفتگو ہو رہی تھی - کہنے لگے کہ رہائشی زمینیں مل گئی ہیں لیکن بعض لوگ ڈر کے مارے مکان نہیں بنوا رہے ہیں -

پشاور والوں کو اب اُدھر سے آنے والوں کا خوف ہے -

پشاور والے اب پہلے جیسے نہیں رہے -

مگر خوب ہیں اس شہر والے - اس کا کلچر پٹھان کلچر نہیں - میں قصہ خوانی بازار میں چلا تو بھانت بھانت کی بولیاں سُنیں - پشتو، پنجابی اور سب سے بڑھ کر ہندکو - یہ ہندکو کون سی زبان ہے ؟ پشتو کے علاقے میں یہ کہاں سے آگئی ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ شہر ایک تاریخی گزرگاہ کے کنارے ہے اس لئے آتے جاتے قافلے اور کارواں یہاں اپنی اپنی بولیاں چھوڑ گئے ؟ - امداد حسین بیگ صاحب نے ہندکو کے بارے میں دلچسپ بات بتائی :

"اس زبان میں انگریزی کے الفاظ بھی ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں ARE YOU WELL? ۔ پشاوری کہتے ہیں: ویل تے؟۔ تو یہ ایسی زبان ہے جو دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تو یہاں کے لوگوں کی زبان بڑی آسان ہے اور اردو کے مشابہ ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں تم کیا کر رہے ہو؟۔ پشاوری میں کہا جائے گا: تو کیا کر رہا ہے؟ تو کے کردا اے؟۔ اسی طرح آپ کہتے ہیں: اِدھر آؤ۔ پشاوری کہتا ہے: اِدھر آ۔ اُردو میں کہتے ہیں: شور مت کرو۔ پشاوری کہتا ہے: شور نہ کرو۔"

پشاور کی آبادی کے بارے میں ملک کے بڑے مورّخ ڈاکٹر احمد حسن دانی نے دلچسپ بات بتائی۔ کہنے لگے کہ یہ شہر پٹھانوں نے نہیں بنایا بلکہ وہ تو شہر کے باشندوں کو حقارت سے اپنی زبان میں 'خاری' کہتے ہیں۔ پشاور کاروباری اور تجارتی شہر تھا اور یہ کام پٹھانوں کا نہیں۔ زیادہ تر تاجر پنجاب اور دوسرے علاقوں کے تھے۔ ان کے کاروبار کی زبان ہندکو بنی اور اب بھی اسی زبان کا غلبہ ہے۔ اصل پٹھان گاؤں میں رہتا ہے۔ پشاور میں پٹھان انگریزوں کے زمانے میں آئے۔ وہ بھی تجارت نہیں بلکہ ملازمت کرتے تھے۔ دانی صاحب نے کہا:

"یہ قصہ کہانی وہاں عام طور پر ملتی ہے خاص طور پر اُس علاقے میں جسے قصہ خوانی کہتے ہیں۔ کہ پشاور شہر کی بناوٹ پرانے قسم کی ہے اور یہ شہر بھی پاکستان کے اور شہروں سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کو آپ پٹھانوں کا شہر نہیں کہہ سکتے۔ اگر آپ کو اصلی پٹھانوں کا شہر اور پشتو کلچر دیکھنا ہے تو پھر آپ کو مردان جانا پڑے گا۔"

یہ تھی اس دور کے بڑے مورخ ڈاکٹر احمد حسن دانی کی رائے۔ اور کیسی عجیب بات ہے کہ جو کردار شہر پشاور کا ہے، جرنیلی سڑک کے دوسرے سرے پر وہی کردار کلکتے کا ہے۔ بنگالی زبان کی سرزمین کے بیچوں بیچ آباد ہے مگر خود شہر کی زبان بنگالی نہیں، لوگ اُردو بولتے ہیں؛

ہندی، گجراتی اور پنجابی بولتے ہیں۔

دانی صاحب پشاور کے جس قصہ خوانی بازار کی بات کر رہے تھے قدیم بغداد جیسی گلیاں ہیں آج بھی اس کی۔ کہتے ہیں کہ کبھی سڑک کے کنارے بڑی بڑی چوکیاں پڑی ہوتی تھیں۔ نہ صرف دور دور سے آتے ہوتے مسافر بلکہ شہر کے باشندے بھی راتوں کو اُن پر بیٹھ کر قصے کہانیاں کہا کرتے تھے اور لوگ دنیا زمانے سے بے خبر ہوکر سنا کرتے تھے۔

وہاں انگیٹھیوں میں کاوا اب بھی پکتا ہے۔ کوئلوں پر نہ سہی گیس کے چولہوں پر بھنتا ہوا گوشت اب بھی مہکتا ہے۔ تنوروں سے سرخ نان اب بھی نکلتی ہے اور گھروں کو لوٹتے ہوتے لوگ گجرے اب بھی خریدتے ہیں مگر قصہ گویوں کی وہ آدھی آدھی رات تک طرح طرح کا سماں کھینچنے والی آوازیں مدھم پڑتے پڑتے چُپ سی ہوگئی ہیں۔ اب تو ہر طرف کیسیٹ ہیں اور چنی چنی آوازوں میں بے سُری عورتوں کے گانے ہیں۔

البتہ کہانی کہنے کی روایت ابھی پوری طرح اُٹھی نہیں۔ پشاور میں رہتے رہتے ایک چھوٹی سی کہانی میں نے بھی سُنی تھی۔ یورپ یا شاید امریکہ سے پشاور آنے والے ایک جوڑے کی یہ کہانی سوکارنو چوک کے پچھواڑے ایک موٹر گیراج میں حاجی محمد یوسف صاحب نے مجھے سنائی تھی۔ حاجی صاحب کی بات تو آئندہ باب میں کریں گے۔ اِس وقت شہر پشاور میں دو اجنبیوں کا وہ قصہ جو انہوں نے مجھے سنایا، آپ بھی سنئے اور اُن ہی کی زبان میں!

"یہ غالباً سال کی بات ہے، یہاں یہ گیلیکسی ہوٹل ہمارے ساتھ ہی ہے اس ہوٹل میں وہ ٹھہرے تھے۔ انہوں نے کہیں دیکھ لیا کہ پشاور میں شادی کا طریقہ یہ ہے کہ دولہا گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ تو انہوں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے کہا کہ ہمارے لئے بھی یہی بندوبست کردو۔ انہوں نے جاکر بینڈ باجے کا انتظام کیا پھولوں کے سہرے بنائے اُس میاں بیوی کے لئے، تو انہوں نے ہوٹل میں سہرا باندھ کر اور گھوڑے پر بیٹھ کر بارات نکالی جس کے آگے آگے بینڈ باجا

تھا۔ وہ قصہ خوانی بازار کی طرف نکل گئے چکر لگانے کے لئے۔ شہر پشاور کے جو نوجوان تھے وہ بھی ساتھ شامل ہو گئے اور راستے میں بھنگڑا ڈالتے گئے اور ناچتے گئے اور پورے پشاور کا چکر لگا کر واپس آئے اور بہت خوش ہو رہے تھے کہ ہمیں بہت پسند آیا یہ رواج۔"

پھولوں سے پتھروں تک

پشاور کی کہانی اُس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اُن مصوروں کی بات نہ ہو جائے جو ٹرکوں اور موٹر گاڑیوں پر اوپر سے نیچے تک بیل بوٹے ، ملکوں کے جھنڈے ، خیبر کے قلعے ، جست بھرتے ہوئے شیر اور دریاؤں ، آبشاروں اور چمن زاروں کی تصویریں بناتے ہیں اور جو دو آنکھیں بنا کر ان کے نیچے لکھتے ہیں : چشم بد دور۔ شالا نظر نہ لگے ۔

بالآخر میں نے سوکارنو چوک کے پچھواڑے ایک بڑے موٹر گیراج کے احاطے میں حاجی محمد یوسف صاحب کو ڈھونڈ نکالا ۔ جہاں اب یہ گیراج ہے یہاں کبھی بہت بڑی تھیٹر کمپنی تھی ۔ وہ کمرے اب بھی موجود ہیں جن میں اداکار آکر رہتے تھے ۔ وہ کمرے بھی موجود ہیں جن میں کبھی لیلیٰ اور کبھی شیریں ، کبھی ہیر اور کبھی سسّی کے چہرے سرخی پاؤڈر سے رنگے جاتے تھے ۔ اب اس احاطے میں ٹرک رنگے جاتے ہیں ۔ وہ ٹرک جن کے ڈرائیوروں کے بارے میں مشہور ہے کہ پولیس سے ڈرتے ہیں لیکن موت سے نہیں ڈرتے ۔ شاید انہیں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ پینٹر نے ٹرک کی پیشانی پر لکھ دیا ہے:
یا اللہ خیر ، ہردم خیر ۔ پہ مخہ دی خہ !

حاجی محمد یوسف صاحب تقریباً چالیس سال سے موٹر گاڑیوں کو رنگتے سنوارتے

چلے آرہے ہیں۔ پشاور کے اِن پینٹروں کی شہرت دور دور تک ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں سے ننگ دھڑنگ گاڑیاں پشاور آتی ہیں اور دلہن بن کر لوٹتی ہیں۔ حاجی صاحب سے میں نے پوچھا کہ یہ کام کیا یہیں پشاور میں ہوتا ہے؟ جواب ملا:

"ہاں جی۔ پشاور ہی میں زیادہ تر۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی تمام لاریاں اور موٹریں یہاں آکر پینٹ ہوتی ہیں، اور وہ لوگ بیل بوٹے بہت پسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اِس صنعت کو یا اس کاروبار کو وسعت ملی ہے۔"

حاجی محمد یوسف صاحب کا تعلق اُس شہر سے ہے جس کے قصہ خوانی بازار کو کون نہیں جانتا۔ انہوں نے ایک موٹر گاڑی کے رنگے جانے کا بہت دلچسپ قصہ سنایا:

"ایک جرمن جوڑا تھا۔ میاں بیوی۔ تو وہ بہت اچھی سفید گاڑی لے کر آئے۔ وہ پہلے ایران پہنچے جہاں انہوں نے کابل کی گاڑیاں دیکھیں جن کے اوپر بیل بوٹے بنے ہوتے تھے۔ تو وہاں انہوں نے پوچھا کہ یہ بیل بوٹے آپ نے کہاں بنواتے ہیں تو ایران میں انہیں بتایا گیا کہ یہ گاڑیاں افغانستان کی ہیں اور یہ کام افغانستان والوں نے بنایا ہے۔ پھر وہ افغانستان آئے۔ وہاں بھی انہوں نے پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ یہ کام پشاور میں ہوتا ہے۔ تو پھر وہ پشاور آئے اور ادھر صدر میں کارخانہ ہے لالہ خیر محمد کا، اس سے رابطہ قائم کیا کہ کوئی ہماری گاڑی پر بیل بوٹے بنا دے۔ بہرحال ہمارے پینٹر وہاں پہنچے اور اتنی اچھی گاڑی کے اوپر انہوں نے کہیں پھول، کہیں مرغ، مور، تیتر اور آنکھیں بنائیں اور ان کے نیچے لکھا چشم بد دور، چشم بد لعنت۔ تو اُس گاڑی کا انہوں نے بیل بوٹے بنا بنا کر بیڑا غرق کر دیا۔ اور وہ بہت خوش ہو رہے تھے کہ یہ ہم نے بہت کمال کی چیز بنوائی ہے۔"

وہ خوشی خوشی اپنی سفید فوکس واگن واپس جرمنی لے گئے۔ خوب تماشا رہا ہوگا بعد میں اُس کا۔

میں حاجی محمد یوسف صاحب کے بال بچوں سے ملنا چاہتا تھا۔ اس تاریخی شہر کی پرانی اور پرپیچ گلیوں کے اندر مکانوں میں اب لوگ کیسے رہتے ہیں، مجھے یہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ چوک شادی پیر کا علاقہ ذرا بلندی پر تھا، محلے اونچے ٹیلوں پر آباد تھے مگر اس بلندی اور ان ٹیلوں کے نیچے چٹانیں نہیں، پرانا شہر پشاور تہ بہ تہ دفن تھا۔ البتہ میرے سامنے ہر طرف مغلوں اور درانیوں کے زمانے کی سرخ اینٹوں کی عمارتیں تھیں۔ بھاری بھرکم چوبی دروازے تھے جن میں سینکڑوں میخیں گڑی تھیں اور سیروں وزنی زنجیریں پڑی تھیں۔ یہ سارے جتن کچھ تو اس لئے تھے کہ باہر کا آدمی اندر نہ آجائے اور اس سے بھی زیادہ اس لئے تھے کہ اندر کا آدمی باہر نہ چلا جائے۔ ہر دروازے کے اوپر محرابیں تھیں، ہر محراب کے اوپر جھروکا تھا۔ دستک نیچے دروازے پر دی جاتی تھی، جواب اوپر جھروکے سے ملتا تھا: کون ہے؟

دو تین غلط دروازے کھٹکھٹانے کے بعد میں حاجی صاحب کا مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ فیل بانوں کی اس پرانی بستی میں ان کا مکان نیا تھا۔ ابھی پلاسٹر اور وارنش کا نیا پن ہوا میں رچا بسا تھا۔ روشن کمرے، اچھے فرش، آرائشی چھتیں، بجلی کے پنکھے، گیس کے ہیٹر، ریڈیو، ٹیلیویژن اور ریفریجریٹر صاف کہہ رہے تھے کہ آج کے نئے شہر پرانے شہروں کے اوپر نہیں بلکہ ان کے اندر آباد ہوا کرتے ہیں۔

میں پہنچا تو حاجی صاحب کا پورا کنبہ خیر مقدم کے لئے نکل آیا۔ ان کی خوش لباس اور خوش سلیقہ اہلیہ، ویسا ہی ہونہار اور خوش شکل بیٹا محمد ادریس اور دو بیٹیاں کہ ذہانت جن کے چہرے بشرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ پوری فضا گرمجوشی سے بھر گئی۔ سب کی خوشی کا احساس اس بات سے ہوتا تھا کہ سب بیک وقت بول رہے تھے۔

حاجی صاحب کی بڑی بیٹی نے اعلیٰ تعلیم مکمل کرلی تھی اور وہ بچوں کے ایک اچھے اسکول میں انگریزی کی معلمہ تھی۔ چھوٹی بیٹی اسلامیات میں ایم اے کر رہی تھی۔

"اس پورے علاقے میں اعلیٰ تعلیم پانے والی یہ پہلی لڑکیاں ہیں۔" حاجی صاحب مجھے بتا رہے تھے۔ جب یہ تعلیم پا رہی تھیں تو سب مخالف تھے، اب ایک ایک کر کے ہر گھر کی لڑکیاں پڑھنے جا رہی ہیں۔ وقت بدل رہا تھا، لوگ بھی بدل رہے تھے۔

حاجی صاحب کے بیٹے محمد ادریس نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پائی تھی اور اسی دوران انہوں نے خراد کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔ ایک تعلیم یافتہ اور ذمے دار مرد کی حیثیت سے گھر میں ہاتھ بٹانے کے لئے ادریس نے جی ٹی روڈ پر لیتھ مشین کا، خراد کا ورکشاپ کھول لیا تھا۔ اگلی صبح میں ادریس کا ورکشاپ دیکھنے گیا۔ وہ اپنی مشین پر جھکے ہوئے کام میں مصروف تھے۔ میں نے ادریس سے پوچھا کہ آپ کی بہنوں نے تو اعلیٰ تعلیم پالی، آپ نے یہ ورکشاپ کھولنے کے لئے انٹر کے بعد تعلیم کیوں چھوڑ دی؟

"جناب یہاں تعلیم کا معیار ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ ہم اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اس وجہ سے میں نے یہ کام سیکھ لیا ہے۔"

میں نے پوچھا "ایسا تو نہیں ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہوں کہ تعلیم پاکر ملازمت کرنے میں اتنی آمدنی اور اتنا فائدہ نہیں ہے جتنا ہاتھ کا کام کرنے میں ہے؟"

ادریس نے کہا "ہاں یہ بھی ہے لیکن تعلیم کا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ انسان تعلیم حاصل کر کے پیسہ کمائے بلکہ میرا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کرنے سے انسان کی فطری قابلیت اور بڑھ جاتی ہے۔ چاہے کوئی بھی کام کرے اس لئے میں نے تعلیم حاصل کی اور اسی وجہ سے یہ کام آسانی سے اور جلدی سیکھ لیا ہے، یعنی تعلیم کی وجہ سے۔"

میں نے کہا "تعلیم کا تو آپ کو پتہ ہے کہ نہ کوئی وقت مقرر ہوتا ہے نہ کوئی حد ہوتی

ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ جب کبھی آپ کو موقع ملا اپنی تعلیم اور آگے بڑھائیں گے؟"

جواب ملا" بالکل۔ کیوں نہیں؟ تعلیم کے لئے تو کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور نہ حد مقرر ہے۔"

میں چلنے لگا تو ادریس نے کہا: ڈھیر مہربانی۔ ڈھیروں تشکر کے اس احساس کو ساتھ لئے میں قلعہ بالا حصار کی طرف چلا۔ قلعے کی بنیاد میں ایک بزرگ کا مدفن دیکھا جو گرم پیر کہلاتے ہیں، اتنے گرم کہ اِدھر منت مانی، اُدھر پوری ہوئی۔ جھولی پھیلی بھی نہیں کہ بھر گئی۔ اسی طرح چوک شادی پیر میں بھی پیر صاحب کا مزار دیکھا جہاں صرف شادی کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ پشاور میں ایسے ایسے خدا جانے کتنے بزرگ دفن ہیں جن سے ایسے ہی قصے منسوب ہیں۔ قصہ خوانوں کا شہر جو ہوا۔

شادی پیر کے مزار کے پہلو سے لگی ہوئی ایک بڑی سی پرانی اور اندھیری دکان میں اندر تک کمپیوٹر کے کاریں دوڑانے اور ہوائی جہاز اڑانے کے الیکٹرانک کھیل لگے ہوئے تھے اور نئی نسل کے لڑکے ان میں سکّے ڈال ڈال کر یوں کھیل رہے تھے جیسے سر پر جن آگیا ہو۔ سب سے مقبول کھیل وہ تھا جس میں دوڑتے ہوئے جانوروں اور اڑتے ہوئے پرندوں پر گولی چلائی جاتی ہے۔

سکّے گرنے اور گولیاں چلنے کی مشینی آوازوں کا شور مچا ہوا تھا اور شادی پیر کے مزار پر سناٹا تھا۔

لیکن شہر پشاور کے بارے میں کہتے ہیں کہ دو ہزار سال کے دوران اس میں ایک روز بھی سناٹا نہیں ہوا۔ پاکستان کا یہ سب سے قدیم آباد شہر ہے۔ یونانی اور عربی مورخوں اور چینی سیّاحوں نے اپنی کتابوں میں پشاور کا ذکر بڑے چاؤ سے کیا ہے اور اس شہر کے عجیب و غریب نام لکھے ہیں: پُسکا پورس، پولوشاپولو اور پرشاور۔ لیکن پرانی دیواروں کی تحریر آج کے مورخوں نے پڑھ لی ہے۔ بڑے تاریخ داں ڈاکٹر احمد حسن دانی اس بات پر بہت

مسرور تھے کہ پرانے پتھروں نے پشاور کا بھید کھول دیا ہے۔ کہنے لگے:

"خوش قسمتی سے کشان زمانے کا ہم کو ایک کتبہ ملا ہے جو دوسری صدی عیسوی کا ہے اور جس میں سب سے پہلے پشاور شہر کا نام آتا ہے۔ اُس میں نام آتا ہے: پوش پور۔ جس کو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ پراکرت لفظ ہے جس کی اصل شکل ہے: پُشپ پور۔ یعنی پھولوں کا شہر۔ بہرحال یہ نام کس نے دیا اور کیونکر پڑا، اس کا ثبوت ہمارے پاس نہیں، البتہ اتنا ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کنشک کے زمانے سے لے کر آج تک یہ شہر آباد ہے، قریب قریب دو ہزار سال ہو گئے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ پشاور شہر پاکستان میں سب سے پرانا آباد شہر ہے۔"

جہاں تک پرانے پتھروں کا تعلق ہے، پشاور شہر کی بنیاد ہی پرانے پتھروں کے اوپر رکھی ہے۔ حاجی محمد یوسف صاحب نے اپنا نیا مکان بنوانے کے لئے بنیادیں کھودیں تو اُن میں کُشان دور کے مٹی کے برتن اور بچّوں کے کھلونے ٹوکرے بھر کے نکلے۔

اس شہر میں تاریخ کی ایک اور بڑی یادگار تھی۔ جی ٹی روڈ اور ریلوے لائن کے درمیان یہاں وہ پنج تیرتھ تھا جہاں گوتم بدھ کا پیالہ رکھا تھا جس میں انہیں بھیک ملتی تھی اور یہیں اُس پیپل کی قلم لگی تھی جس کے نیچے گوتم کو اپنے سوالوں کے جواب ملتے تھے۔ مجھ سے سولہ سو [۱۶۰۰] سال پہلے جب چینی سیاح فاہیان پشاور آیا تھا اُن دنوں پنج تیرتھ میں سات سَو بودھ بھکشو رہتے تھے۔ وہ ہر دوپہر گوتم بدھ کا کشکول نکال کر اس میں بھیک مانگتے تھے اور شام ہونے سے پہلے پہلے اُسے واپس رکھ دیتے تھے۔

وہ سب کبھی کا ختم ہوا۔

البتہ جرنیلی سڑک کے کنارے بالا حصار کا قلعہ اب تک سینہ تانے کھڑا ہے۔ شاید جتنا پرانا شہر پشاور ہے اتنا ہی قدیم یہ قلعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ وادی پشاور کا جیسا نظارہ اس

قلعے کے اوپر سے ہوتا ہے، کہیں اور سے نہیں ہو سکتا۔ مگر صدیوں کی طرح آج بھی اس قلعے کے اندر فوج رہتی ہے۔ ہم اور آپ اس کے اوپر نہیں جا سکتے۔ پشاور کے قلعہ بالا حصار کے بارے میں دانی صاحب نے دلچسپ باتیں بتائیں:

"یہ قلعہ کئی دفعہ مسمار ہوا، پھر بنا، لیکن مغلوں نے اسے چھوڑا نہیں۔ اور ہمیں داد دینا چاہیئے کہ پہلا راستہ خیبر کے ذریعہ اکبر کے زمانے میں اُس کے انجنیئروں نے بنایا تھا اور پشاور کو گرینڈ ٹرنک روڈ کے ذریعے کابل سے اکبر کے زمانے میں ملایا گیا۔"

پشاور کی تاریخ دلچسپ ہے، اور یوں دلچسپ ہے کہ یہ آنے والوں کی اور جانے والوں کی تاریخ ہے۔ کنشک آئے، کُشان آئے، ساسانی آئے، ہُن آئے، ترک اور ہندو آئے، مسلمان اور پھر مغل آئے۔ اُن کے بعد درانی اور پھر سکھ آئے۔ وہ گئے تو انگریز آئے اور بالآخر آزادی آئی۔ صدیوں تک پشاور بنتا رہا اور بگڑتا رہا۔ ہماری جرنیلی سڑک پر کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک عظیم الشان شالیمار باغ بھی تھا۔ ڈاکٹر دانی نے اُس کے بارے میں بتایا:

"شاہ جہان کے زمانے میں یہاں پر ایک شالیمار باغ بنا تھا۔ جس کو بعد میں کننگھم پارک کہا گیا اور اب جناح پارک کہتے ہیں، یا شاہی باغ کہتے ہیں جس کے درمیان سے اب یہ جی ٹی روڈ گزرتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک شالیمار باغ تھا جس کے حسن اور جس کی دل کشی کا ذکر ۱۸۱۰ء میں وہاں سب سے پہلے پہنچنے والے ایک انگریز نے کیا تھا۔ اُس وقت پشاور پر سکھوں کا نہیں بلکہ درانیوں کا قبضہ تھا۔ یہ شالیمار باغ تقریباً دو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ سکھوں نے جب ۲۴-۱۸۲۳ء میں قبضہ کیا تو شالیمار باغ کا خاتمہ کر دیا اور اس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ آج بھی وہاں نہیں ہے۔"

پشاور کو اب دیکھیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ کبھی پھولوں کا شہر رہا ہوگا - اب یہ مٹیالا سا پتھریلا سا شہر ہے - انگریزوں نے اپنے کنٹونمنٹ کو خوب نکھارا تھا - وہ نکھار اب بھی ہے مگر پرانا شہر اَور پرانا ہوتا جا رہا ہے ، قدیم عمارتیں گر رہی ہیں - سیمنٹ کی اونچی اونچی عمارتیں بلند ہو رہی ہیں - اَور کچھ روز کی بات ہے ، یہ شہر پہچانا بھی نہیں جائے گا - کچھ ایسی ہی بات اُس روز ڈاکٹر دانی نے کہی :

"آج پشاور شہر بہت بدل گیا ہے - پہلے پشاور شہر ایک قلعے کے اندر تھا - قلعے کی فصیل تھی - شہر پناہ تھی - یہ گھرا ہوا شہر تھا - اب پشاور شہر کھلا ہوا شہر ہے - ساری دیواریں سارے دروازے توڑ دیے گئے ہیں - سارے جنگلات ختم ہو گئے ہیں بلکہ جنگلات کی جگہ اب وہ کالے پہاڑ نظر آتے ہیں ۔"

لڑی میں پروئے ہوئے منظر

عجیب سڑک ہے یہ جرنیلی سڑک بھی۔

آپ اس پر چلیں اور شعور کی آنکھیں کھلی رکھیں تو جتنے اور جیسے منظر اس راہ میں آتے ہیں، شاید ہی کہیں آتے ہوں۔

آپ چلتے جاتے ہیں اور ایک نہایت آباد سرزمین کی معاشرت، معیشت اور تاریخ آپ کے ہمراہ چلتی ہے۔ کہیں حیرت آپ کے قدم سے قدم ملاکر چلنے لگتی ہے اور کہیں عبرت۔ منظر بدلتے جاتے ہیں مگر وہ لڑی نہیں بدلتی جس میں وہ سارے کے سارے پروئے ہوتے ہیں۔

میں پشاور سے چلا تو بالا حصار کے نیچے ایک پتھر لگا ہوا نظر آیا۔ اُس پر بڑے حرفوں میں شاہراہِ پاکستان لکھا تھا اور کسی وزیر کا نام لکھا تھا جس نے کبھی وہ پتھر وہاں لگایا ہوگا۔ کیسا دلچسپ اتفاق ہے۔ سڑک اور وزیر دونوں آنی جانی چیزیں ہیں۔

وادیٔ پشاور اب بھی بہت سرسبز نظر آرہی تھی۔ جن زمینوں کو آتے جاتے لشکروں نے بار بار روندا ہوگا وہ اب تک ہری بھری تھیں۔ کبھی ریلوے لائن سڑک کے قریب آجاتی تھی۔ کبھی بجلی کے بڑے بڑے کھمبے اور موٹے موٹے تار ساتھ ساتھ دوڑنے لگتے تھے۔ بستیاں آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں۔ رمضان کا مہینہ تھا، اُن کے چائے خانے بند پڑے

تھے۔ اس تمازت کے عالم میں کہیں سے اچانک دریائے کابل آگیا۔ یہ نوشہرہ کے قریب آجانے کی پہچان تھی۔

یہ شہر شاید اکبر نے آباد کیا تھا۔ کبھی یہاں دریا کے دائیں کنارے پر نوشہرہ خُرد اور بائیں کنارے پر نوشہرہ کلاں، یہ دو گاؤں تھے۔ ایک سرائے بھی تھی جس میں جہانگیر ٹھہرا تھا۔ ایک قلعہ بھی تھا مگر تمام سرائیں اور تمام قلعے گزرتے قافلوں کی گرد میں مل کر خود بھی گرد ہوجایا کرتے ہیں۔

۱۸۲۳ء میں یہیں پٹھانوں اور سکھوں کی وہ فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی جس کے بعد پوری وادیٔ پشاور سکھوں کے تصرّف میں آگئی تھی۔ اُس روز پٹھان جی توڑ کر لڑے تھے۔ ان کا مقابلہ رنجیت سنگھ اور کھڑک سنگھ سے تھا۔ وہ دن بھر لڑتے رہے اور مرتے رہے۔ وہ قریبی ٹیلوں پر جمع ہوتے تھے اور یلغار کرتے ہوئے اترتے تھے۔ سہ پہر کو سکھوں کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس پر رنجیت سنگھ نے خود پرچم اٹھایا اور فوج کی قیادت سنبھال لی۔ آخری معرکہ مغرب کے وقت ہوا۔ اُس وقت لڑنے کے لئے صرف دو سو یوسف زئی بچے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی نہ بچے۔ قریبی ٹیلوں پر آج بھی دور دور تک قبریں نظر آتی ہیں۔

اب ہم دریا دریا چل رہے تھے۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی وہاں تک زمین تھی، اس کے آگے بھی زمین تھی اور ان ہی زمینوں میں وہ چھوٹا سا گاؤں، لہور، آج بھی آباد تھا جس میں سنسکرت قواعد کا سب سے بڑا عالم پانینی پیدا ہوا تھا۔

کچھ اور آگے ایک اور گاؤں، ہنڈ، تھا۔ اس مشینی دور میں یہ جاننے کی فرصت کسے ہے کہ یہی ہنڈ کبھی گندھارا کا پایۂ تخت تھا۔ یہیں آکر سکندر نے سندھ پار کیا اور چنگیز خاں یہیں سے دریا کا پاٹ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ یہیں محمود غزنوی نے پنجاب کے راجا جے پال کو شکست دی تھی۔ اسی کو مورخوں نے ہندوستان کا دروازہ کہا تھا اور اگر اسی کا نام کبھی اوہند تھا تو کیا عجب ہے کہ ہندوستان کا اپنا نام اسی شہر سے نکلا ہو۔ مگر اب یہ دریائے

سندھ کے کنارے ایک گمنام سا گاؤں ہے جس کا ماضی تاریخ کی دھندلی چادر اوڑھ کر کبھی کا سو چکا ہے۔

اچانک خیر آباد آگیا۔

سامنے دریائے سندھ شاہانہ انداز میں بہا چلا جا رہا تھا جس کے دوسرے کنارے پر عظیم الشان قلعہ اٹک تھا، اکبر اعظم کا اٹک بنارس، چار صدیوں کا عینی شاہد، کتنے ہی زمانوں کا چشم دید گواہ۔

اٹک کے قلعے میں اب فوج رہتی ہے اس لئے عام لوگوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں بہت سوچتا ہوں کہ اندر سے یہ قلعہ کیسا ہوگا۔ یہ بات خدا کے بعد شاید فوجیوں اور سیاسی قیدیوں کو معلوم ہوگی۔ اوّل الذکر سے دعا کرتا ہوں کہ قلعے کے کو اندر سے دیکھوں مگر آخر الذکر کا حال سُنتا ہوں تو وہ اپنی دعا واپس لے لیتا ہوں۔

یہاں ہماری گاڑی نے نئے پل کے راستے دریا پار کیا۔ انگریزوں کا بنایا ہوا لوہے کا پُل سامنے نظر آتا رہا۔ کبھی سارا ٹریفک اُس مضبوط پُل کے اوپر چلا کرتا تھا اور یُوں محسوس ہوتا ہوتا تھا کہ گاڑی لوہے کے جنگل سے گزر رہی ہے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ انگریز چلتے وقت بتا گئے تھے کہ ان کے تمام پلوں کی عمر پورے ایک سو برس ہوگی، اس کے بعد نئے پُل بنانا۔ جس روز میں اٹک پہنچا یہ پُل ایک سو دو سال پرانا ہو چکا تھا۔ موٹر گاڑیاں نئے پُل پر چلتی ہیں ریل گاڑیاں اب بھی دعائیں دم کر کے اُسی بوڑھے پُل پر سے گزاری جاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ اٹک کا یہ نام اکبر بادشاہ نے رکھا تھا۔ نام رکھنے کا اُسے بڑا شوق تھا۔ کسی جگہ کا خوبصورت منظر دیکھ کر اس کے منہ سے بے ساختہ ، واہ ، نکلی۔ اُس مقام کا نام واہ رکھ دیا گیا۔ پھر چلتے چلتے اُس کا قافلہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر اٹک گیا، وہ جگہ اٹک کہلائی۔ پھر قافلہ خیر سے پار اتر گیا، وہ مقام خیر آباد کہلایا۔

اس کی ایک کہانی اور بھی ہے۔ اکبر نے اپنے پیش رو شیر شاہ سے بہت کچھ سیکھا تھا

بہت سے کام جو اکبر نے کئے ان کی بنیاد شیر شاہ رکھ گیا تھا۔ شیر شاہ کی مملکت بہار سے پنجاب تک پھیل گئی تھی۔ اس کے ایک سرے پر بہار میں قلعہ رہتاس تھا۔ اس کے دوسرے سرے پر پنجاب میں گکھڑوں کی سرزمین پر شیر شاہ نے دوسرا قلعہ بنوایا تو اس کا نام بھی رہتاس رکھا۔ بالکل اسی طرح اکبر کی مملکت کے ایک کنارے پر کٹک تھا، دوسرے کنارے کا نام اس نے اٹک رکھا۔ یہاں کشتیاں چلانے اور دریا پار کرانے کے لئے اکبر بنارس سے ملاح لایا اور اس خیال سے کہ وہ اب اسی جگہ کو وطن سمجھیں، اس چھوٹے سے شہر کو اٹک بنارس کا نام دے دیا گیا۔ ملاحوں کی گزر بسر کے لئے جاگیر اور رہنے کے لئے شہر میں ایک محلہ دیا گیا جو ملاحی ٹولہ کہلاتا ہے اور جہاں پرانے ملاحوں کی آل اولاد اب تک آباد ہے۔

اس کے پاس جہانگیر کے زمانے کی سرائے ہے۔ بہت بڑا احاطہ ہے جس کے گرد مسافروں کے لئے سینکڑوں کمرے ہیں۔ اس کے بعد کلکتے تک اتنی اچھی حالت میں کوئی سرائے نظر نہیں آئی۔

خود قلعے کا قصہ یہ ہے کہ مغلوں سے اسے کابل والوں نے چھینا، کابل والوں سے اسے سکھوں نے چھینا، انگریزوں نے سکھوں سے چھینا، سکھوں نے دوبارہ انگریزوں سے چھینا، انگریزوں نے دوبارہ سکھوں سے چھینا۔ اس چھینا جھپٹی کے باوجود یہ قلعہ آج تک کھڑا ہے۔ اور جو اس سے بھی زیادہ مستعدی سے کھڑا ہے وہ دریا پار پنجاب کے علاقے میں داخل ہونے والی گاڑیوں کی تلاشی لینے والا کسٹم اور ایکسائز کا عملہ ہے۔

ہمیں یاد ہے کسی زمانے میں جب ہمیں جیسے چھوٹے لوگ لنڈی کوتل سے غیر ملکی کپڑا، بلیڈ، صابن اور سگریٹیں لے کر لوٹتے تھے تو اس جگہ تلاشی میں پکڑے جاتے تھے۔ اس زمانے میں بڑے لوگ الٹے جانے کیا کیا لے کر لوٹتے ہیں اور اس جگہ سے صاف نکل جاتے ہیں جبکہ آج بھی چھوٹے ہی لوگوں کی ٹولی جاتی ہیں۔

مئی کے آخری ہفتے کی بھری دوپہر میں ہماری گاڑی روک کر اس کی تلاشی لی گئی۔ میرے برابر میں ایک تنومند خان صاحب بیٹھے تھے جو کچھ دیر پہلے چھپ کر پانی پینے والے ایک مسافر اور سگریٹ سلگانے والے کنڈکٹر کو صرف اس لئے کچا نہیں چبا سکے کہ اُن کا روزہ ٹوٹ جاتا۔ اِس پہلی تلاشی پر انہوں نے پہلو بدلے اور جیسے بھی بن پڑا اپنے غضب پر قابو پایا کہ یہی روزے دار کی شان ہے۔

کچھ دور چل کر حسن ابدال میں چونے کی بھٹیوں کے پاس گاڑی روک کر دوبارہ تلاشی لی گئی۔ اِس مرتبہ خان صاحب کے سینے میں کھولتا ہوا لاوا ہونٹوں تک آیا اور تھوڑا سا اُبل کر رہ گیا۔ لیکن قیامت اُس وقت ٹوٹی جب ٹیکسلا سے آگے مرگلا کے پاس شامت کے مارے آبکاری والوں نے تیسری تلاشی شروع کر دی۔ ایک باوردی شخص گاڑی میں اندر تک جا کر اور کچھ برقع پوش خواتین کے سامان کی تلاشی لے کر لوٹ رہا تھا کہ جوں ہی خان صاحب کے قریب سے گزرا وہ پھٹ پڑے "اس قدم قدم پر تلاشی کا کیا مطلب ہے؟" اور پھر سور کا عربی ترجمہ کرتے ہوئے بولے "فلاں کے بچے۔ مستورات سے تو نے کتنا پیسہ کھایا ہے؟"

اُس روز کسی باوردی شخص کو جیسا گھگھیاتا ہوا میں نے دیکھا، دوست یا دشمن، خدا کسی کو بھی نہ دکھائے۔

سنا ہے کہ چوتھی تلاشی مرگلا کے پار سنگ جانی کے پاس ہونے والی تھی، غالباً تلاشی لینے والوں کو وائرلیس پر خبردار کر دیا گیا کہ ہوشیار! عید قریب ہے، دیکھنا کہیں تمہاری بیویاں بیوائیں نہ ہو جائیں۔

راستے میں حسن ابدال کا پڑاؤ تھا۔ کبھی یہ شہر اتنا دلکش رہا ہوگا کہ مغل مؤرخ لکھتے ہیں کہ لاہور سے کابل جانے والی شاہراہ پر یہ حسین ترین منزل ہے۔ مگر آج کے حسن ابدال میں جھرنوں کے شور اور چڑیوں کی چہکار سے زیادہ جو چیز گونجتی ہے وہ سڑک کی دونوں طرف ہوٹلوں کے لاؤڈ اسپیکر ہیں جن پر دن رات فلمی گانے بجا کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے مالکوں کا خیال ہے

کہ جس کے لاؤڈ اسپیکر کی آواز زیادہ اونچی ہوگی اس کے ہاں گاہک بھی زیادہ آئیں گے۔ اُس روز رمضان کی وجہ سے گانا بجانا بند تھا، شیطان کی طرح!

اس میں شک نہیں کہ حسن ابدال رونق کی اور عبرت کی جا ہے۔ دونوں طرف انگریزوں کے زمانے کے اونچے اونچے درخت، دور تک سبزہ، نالیوں میں بہتا ہوا چشمے کا شفاف پانی، اِدھر اُدھر پرانی عمارتیں اور مسجدیں، ایک طرف سکھوں کا مشہور گوردوارا پنجہ صاحب، دوسری طرف بابا ولی قندھاری کی چلّہ گاہ۔ کشمیر کی طرف مڑ جانے والی سڑک پر کسی مغل بی بی کی قبر۔ کوئی کہتا ہے کہ اکبر کی بیٹی لالہ رخ تھی وہ یہاں عالم شباب میں مر گئی تھی۔ بعد میں طامس مور نے اپنی ایک نظم میں اسے زندہ کر دیا۔

یہیں قلعہ اٹک کے معمار خواجہ شمس الدین خوافی کا مقبرہ ہے جو اس نے اپنی زندگی میں تعمیر کرایا تھا مگر وہ کہیں دور مرا اور یہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔ اس کے برعکس اکبر کے چہیتے مصاحب اور محرم راز حکیم ہمام نے کہیں دور وفات پائی لیکن بادشاہ کے حکم پر اس کی میت حسن ابدال لے جا کر اس کے بھائی حکیم ابوالفتح گیلانی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

حسن ابدال کے قریب اُس مغل باغ کے آثار اب بھی موجود ہیں جس کے تالاب سے جہانگیر نے مچھلیاں پکڑی تھیں اور ان کی ناک میں موتی پرو کر پھر پانی میں چھوڑ دیا تھا۔

یہیں وہ بڑی سی چٹان ہے جس کے بارے میں سکھوں کا عقیدہ ہے کہ اسے بابا ولی قندھاری نے پہاڑی کے اوپر سے لڑھکا دیا تھا اور نیچے بابا گرو نانک نے چٹان کو اپنے ایک پنجے پر روک لیا تھا۔ چٹان پر نانک کے پنجے کا نشان بن گیا تھا جو آج تک موجود ہے۔

تاریخ کا حساب کتاب رکھنے والے کہتے ہیں کہ جب گرو نانک پشاور جاتے ہوئے حسن ابدال آئے تھے، بابا ولی قندھاری اُس سے بہت پہلے نہ صرف حسن ابدال سے بلکہ اس عالم فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ پُرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ پانچ انگلیوں کا یہ نشان حسن ابدال والوں نے تراشا تھا۔

حسن ابدال والوں کی تراشی ہوئی ایک اور داستان بہت دلچسپ ہے۔ ۱۸۵۰ء میں انبالہ کے منشی امین چند سفرنامہ لکھنے کی غرض سے سیاحت پر نکلے تھے اور حسن ابدال سے گزرے تھے۔ اپنی کتاب "سفرنامہ" میں منشی صاحب لکھتے ہیں:

"بلندی پہاڑ پر شاہ ولی قندھاری کا مکان ہے۔ وہاں پر کوئی مزار نہیں ہے، صرف ان کی نشست گاہ بنی ہوئی ہے۔ جب کوئی وہاں جاتا ہے تو مجاور لوگ سفید سُرمہ بطور تبرّک دیتے ہیں۔ اُس مکان پر ایک بڑا چراغ ہے۔ ہر جمعرات کے دن وہ چراغ جلایا جاتا ہے۔ ان مجاوروں کا بیان ہے کہ کیسا ہی مینہ برسے یا آندھی چلے وہ چراغ گُل نہیں ہوتا۔ اگر اتفاقاً ہو جاوے تو اس وقت حاکم یہاں کا بدل جاتا ہے۔ راست و دروغ برگردنِ راوی۔"

میں نے قریب کی ایک بستی والوں سے چراغ کی حقیقت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ پہاڑی کے اوپر رات بھر ایک چراغ کی روشنی نظر آیا کرتی تھی لیکن اب وہاں کسی نے 'ٹیوب لائٹ' لگوادی ہے۔ اب کام پکا ہوگیا۔

حسن ابدال سے آگے بڑھیں تو واہ چھاؤنی ہے۔ وہاں مغلوں کے دور کی بہت بڑی باولی ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے۔ کسی زمانے میں لوگ، اُن کے مویشی اور ہاتھی گھوڑے باولی کی سینکڑوں سیڑھیاں اتر کر سیراب ہوا کرتے تھے۔ اب لوگ یہ مشقت نہیں کرتے بلکہ پمپ کے ذریعہ پانی کھینچ لیتے ہیں۔

واہ سے آگے سرائے کالا ہے۔ جی ٹی روڈ پر یہ چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں کالے پتھر کی کونڈیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے باہر کے کناروں پر بیل بوٹے کھود کر ان میں رنگ بھر دیا جاتا ہے اور پھر اوپر تلے چن کر ان ہانڈیوں کے مینار سے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی سرائے کالا کی پہچان ہے۔

ظاہر ہے کہ کبھی اس جگہ مسافروں کے لئے سرائے رہی ہوگی۔ جہانگیر نے بھی یہاں

پڑاؤ ڈالا تھا۔ اُس وقت اِس جگہ کا نام کالا پانی تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ شیر شاہ اور مغلوں کے زمانے میں جو ہزاروں سرائیں بنائی گئی تھیں بعد میں ان کے گرد بستیاں آباد ہوتی گئیں۔ خود سرائیں نہیں رہیں البتہ آبادیوں کے نام کے ساتھ لفظ 'سرائے' جُڑا رہ گیا۔ مردم شماری کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان پاکستان میں کئی سو شہروں، قصبوں اور دیہات کے ناموں کے ساتھ لفظ 'سرائے' لگا ہوا ہے۔ اگر نقشے پر اُن تمام مقامات کو لکیروں سے ملایا جائے تو کیا قدیم سڑکوں کا نقشہ خود بخود نہیں اُبھرے گا؟

جہاں یہ سرائے کالا ہے وہاں سے صرف چند کیلو میٹر دور ٹیکسلا کے کھنڈر ہیں۔ وہی ٹیکسلا جو ہندوستان کے تاج میں ایسے نگینے کی طرح جڑا تھا جس سے پھوٹ کر گیان دھیان کی کرنیں ایک عالم کو منور کیا کرتی تھیں۔ وہ شہر اب یہیں آنکھیں موندے سو رہا ہے۔

سرائے کالا سے چار میل آگے مرگلا کی پہاڑی دیوار بن کر کھڑی ہے۔ پہاڑی میں ایک کٹاؤ ہے لیکن اُس دن میں سوچنے لگا کہ اِس پچیس تیس ہاتھ چوڑے پہاڑی شگاف کے راستے ہزاروں برسوں کے دوران ان گنت قبیلے، قافلے اور لاؤ لشکر گزرے ہوں گے چین، افغانستان، وسطی ایشیا، ایران اور ایشائے کوچک سے چاہے ایک تنہا مسافر آیا ہو چاہے ایک لشکرِ جرار، وہ سب مرگلا کے اس کٹاؤ پر چڑھے ہوں گے اور اوپر پہنچ کر انہوں نے دوسری طرف کا نظارہ کیا ہوگا تو تاحدِ نگاہ ہندوستان ہی ہندوستان دکھائی دیا ہوگا۔ مرگلا کا یہ تاریخی کٹاؤ ابھی موجود ہے۔ جسے دیکھنا ہو فوراً جا کر دیکھ لے کیونکہ پہاڑی پتھر کاٹ کاٹ کر فروخت کرنے والے بیوپاریوں کی جدید مشینیں اس پہاڑی پر اس طرح ٹوٹی پڑ رہی ہیں جیسے قند کی ڈلی پر بھوکی چیونٹیاں۔

بعد میں جب انگریزوں نے گرینڈ ٹرنک روڈ کی تعمیر شروع کی تو انجینئروں نے اس کٹاؤ سے ہٹ کر پہاڑی میں گہرا درّہ کاٹ دیا۔ اس سے آنا جانا آسان ہوگیا۔ البتہ بلندی پر اس سڑک کے آثار ابھی موجود ہیں جو غالباً اکبر نے بنائی تھی تاکہ کابل پر حملے کے لئے یہاں

بھاری توپیں آسانی سے چڑھائی جا سکیں۔ اس درّے کے اوپر پہاڑی کی چوٹی پر نکلسن کی لاٹ میلوں دور سے نظر آنے لگتی ہے۔

یہ اُسی نکلسن کی یادگار ہے جسے سرکش پٹھانوں کے علاقے کا منتظم بنا کر بھیجا گیا تھا اور کہتے ہیں وہ پٹھانوں میں نہ صرف گھل مل گیا تھا بلکہ ایسی 'کرامات' دکھانے لگا تھا کہ بنّوں اور کوہاٹ والے اسے 'گورا پیر' ماننے لگے تھے۔

مگر پھر اس کا بلاوا آ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں جس برطانوی فوج نے دہلی کا محاصرہ توڑا اس میں نکلسن آگے آگے تھا۔ لاٹ کے نیچے لگی ہوئی تختی پر لکھا ہے کہ اِس چڑھائی میں وہ زخمی ہوا اور آٹھ دن بعد چل بسا۔

اُس پرانی تختی کے نیچے اب ایک نئی تختی لگی ہے جس پر لکھا ہے:

"نکلسن کو ۱۸۵۷ء میں دہلی میں مجاہدِ آزادی، کالے خان نے مارا تھا"

کسے خبر تھی کہ گورا پیر کالے خان کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

جن دنوں میں راولپنڈی پہنچا، شہر کی ایک بڑی شخصیت، ڈاکٹر اجمل کے گھرانے کے ایک خوبرو اور ہونہار نوجوان کے قتل کی خبر گرم تھی۔ ڈاکوؤں نے گوجر خاں کے قریب جی ٹی روڈ پر اس کی کار کو روک کر اُسے نہ صرف لوٹا بلکہ نوجوان کو قتل بھی کر گئے۔ ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے، قانون انہیں ان کے انجام کو پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ میں مری روڈ پر کمپنی باغ کے سامنے ڈاکٹر اجمل کی گلی میں پہنچا۔ یہ گلی میں نے چوتھائی صدی پہلے بھی دیکھی تھی۔ وہی ٹین کی چادروں کا بڑا سا گیٹ، وہی اینٹوں کے فرش والا دالان اور اس کے گرد مطب کے وہی کمرے۔ مگر اب نہ ڈاکٹر صاحب تھے، نہ مریضوں کا وہ مجمع اور نہ آنے جانے والوں کی وہ رونق۔ پورے شہر کی طرح یہ گلی بھی اب بدل گئی تھی۔ اگر کوئی نہیں بدلا تھا تو وہ تھے گلی میں کھیلنے والے چھوٹے

چھوٹے بچے جو تمام عالم سے بے خبر، تمام زمانے سے بے نیاز آج بھی ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اپنے کھیل میں مگن تھے۔

میں نے دعا مانگی کہ یہ ہاتھ کبھی نہ چھوٹیں، ہمسائیگی کے یہ رشتے کبھی نہ ٹوٹیں۔ یہ گلیاں یوں ہی آباد اور ان میں کھیلتے ہوئے بچے یوں ہی شاد رہیں۔

Hasnain Sialvi

وہ راولپنڈی خواب ہوا

ہاں تو بات ہو رہی تھی راولپنڈی کے ایک ہونہار نوجوان کی جسے جی ٹی روڈ پر ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔

"چوہدری صاحب یہ کیا ہو رہا ہے آپ کے شہر میں؟" میں نے چوہدری مولاداد سے سوال کیا۔ وہ راولپنڈی کے پرانے باشندے ہیں اور باپ دادا سے اتنا بہت سا علاقہ ورثے میں ملا ہے کہ میں نے پنڈی کو "آپ کا شہر" کہا تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔ میرا سوال سن کر چوہدری صاحب صوفوں، کوچوں، لیمپوں، گل دانوں، تصویروں، قالینوں اور فانوسوں سے مرصع اپنے مکان کی چھت کو دیر تک دیکھتے رہے اور گویا ستاسی برس کا خارش بائیسکوپ چند لمحوں میں اپنے سارے منظر دکھا گیا۔ کہنے لگے "نہیں جی، کوئی ایسی بات نہ تھی، عورتیں سڑک کے اوپر سونے سے لدی ہوئی جاتی تھیں، کبھی کسی نے ان کو نہیں چھیڑا۔ ڈاکہ زنی کبھی ہوتی ہی نہیں تھی، اگر کبھی ہوتی تو ایک چپراسی، ایک سپاہی جاتا تھا تو اگلوں کو ڈر ہوتا تھا۔ اُس وقت انصاف تھا۔ اُس زمانے میں تھا انصاف۔ انصاف تو اُسی زمانے میں تھا۔ آج کل تو خدا کا فضل ہے، سب جگہ، انڈیا میں کیا، اِدھر کیا اُدھر کیا۔ لوگ پڑھ زیادہ گئے ہیں، تعلیم زیادہ ہو گئی ہے۔ لوگ مذہب کی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف چلے گئے ہیں، خدا کا ڈر کم ہو گیا ہے۔"

چوہدری صاحب بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک پورا دور بول رہا ہے۔ ستاسی برس کی عمر میں بھی آنکھوں سے عیاں چونچالی اور ذہن کے گوشوں میں چھپی جولانی کا یہ حال تھا کہ جہاں بیٹھتے ایک سرشاری کا عالم ہوتا۔ اُس شام اُن سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ چکلالہ روڈ جیسی ٹوٹی پھوٹی اور اذیت ناک سڑک پر چلنے کی ساری کلفتیں جاتی رہیں۔ میں اُن سے پُرانی راولپنڈی کی ایک ایک بات تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کے زمانے میں عدالتوں اور انصاف کا کیا حال تھا؟ انگریزوں نے راولپنڈی میں بڑی چھاؤنی ڈالی تھی، اُن کا زمانہ کیسا تھا؟ کہنے لگے:

"انگریزوں کا جب زمانہ تھا تو وہ اگرچہ راج انگریزوں کا اور عیسائیوں کا تھا جو بائبل کو مانتے تھے لیکن وہ کام قرآن اور حدیث کے مطابق کرتے تھے۔ جو قرآن کی شرائط ہیں کام وہ تھا مگر نام انگریز کا تھا۔ بس وہی حال تھا کہ

قدم جرمن کا بڑھتا ہے
فتح انگلش کی ہوتی ہے

اس طرح انگریز کا راج مگر اسلام کا نظام تھا۔ ایک سیشن جج تھا جس سے میری بڑی دوستی تھی۔ اُس کو میں ایک جنگلی مرغ دینے گیا تو کہا تھا کہ مولاداد۔ ایک بات کہتا ہوں۔ سچ بتاؤ کسی کی سفارش کرنے آئے ہو؟ میں نے کہا نہیں صاحب، میں سفارش کیوں کروں۔ آپ کو پتہ ہے میں آپ کے ساتھ دو سال سے اسیسر ہوں، میری رائے کو آپ تسلیم کرتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ اگر سفارش نہیں ہے تو تم میرے دوست ہو، ورنہ نکل جاؤ، میں نہیں آپ سے بات کرتا!"

چوہدری صاحب ساٹھ ستر سال پرانی راولپنڈی کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ اب جو شہر کے بیچوں بیچ قدیم علاقہ ہے بس یہی کُل شہر تھا۔ تھوڑے سے محلے۔ تھوڑی سی گلیاں اور تھوڑے سے لوگ۔ وہ بتا رہے تھے:

"راولپنڈی کی آبادی اُس وقت کوئی پچاس ہزار کے قریب تھی۔ اور ہمارا محلہ چوہدری وارث خاں تھا۔ یہ بہت بڑا محلہ تھا۔ ایک سید پوری گیٹ تھا وہ ہندوؤں کا محلہ ہوتا تھا۔ بھابڑا بازار تھا۔ پشاوریوں کی گلی تھی۔ سرداروں کا باغ، پشاوری باغ، نیا محلہ، بنی محلہ یہ چند محلے تھے۔"

ان بزرگوں کی باتوں میں بلا کی سادگی ہوتی ہے۔ مثلاً سب کے سب دعویدار ہیں کہ ان کے زمانے میں نوجوان بہت پارسا ہوتے تھے اور سب کو اس بات پر اصرار ہے کہ ضرورت کی چیزیں کوڑیوں کے مول ملتی تھیں۔ میں نے چوہدری صاحب سے پوچھا کہ مہنگائی کا کیا حال تھا آپ کے زمانے میں۔ جواب ملا:

"آنے کا ایک سیر دودھ تھا۔ کوئی ملاوٹ کا نام نہیں تھا۔ اور گوشت بکرے کا چار آنے سیر تھا۔ گائے کا گوشت ہوتا نہیں تھا کیونکہ ہندوؤں نے فیصلہ کیا تھا کہ پنجاب کی حدود میں گائے کُشی مسلمان کے لئے نہیں ہوگی۔ انگریزوں کے لئے ہوتی تھی۔ اُن کے سلاٹر ہاؤس تھے۔ فوجوں میں انگریزوں کے لئے گائے کے گوشت کی سپلائی ہوتی تھی لیکن مسلمانوں کو بکرے کا گوشت ملتا تھا۔ ایک پیسے کا پاؤ۔ روپے کی چار سیر مٹھائی۔ یہ میں ۱۹۲۲ء کا ذکر کر رہا ہوں۔ اُس وقت سمجھ لو کہ دو روپے من گندم تھی۔ اور آٹا ڈھائی روپے من۔ ایک پیسے کی روٹی کے ساتھ دال مفت ملتی تھی۔ چند مسلمانوں کی دکانیں تھیں، دو کپڑے والوں کی تھیں اور جوتے والوں کی تھیں کیونکہ ہندو چمڑے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اس لئے لوگ مسلمانوں کی دکانوں کی جوتی پہنتے تھے۔"

ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب میں نے گاؤ کشی کی ممانعت پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ سکھوں کے دور تک گائے ذبح کرنے کی ممانعت تو سمجھ میں آتی ہے مگر انگریزوں کے راج میں گائے کا ذبیحہ کیوں بند رہا تو چوہدری صاحب بولے: "ہاں۔ نام انگریز کا تھا۔

راج ہندو کا تھا۔"

راولپنڈی کی جامع مسجد پرانے شہر کے بیچوں بیچ ہے۔ اگر اس علاقے میں غیر مسلموں کا بہت اثر تھا تو یہاں اتنی بڑی مسجد کا ہونا تعجب کی بات ہے۔

لاہور کی ایک مسجد کے بارے میں تو سُنا تھا کہ ایماں کی حرارت والوں نے شب بھر میں بنا دی تھی، چوہدری صاحب کہتے ہیں کہ راولپنڈی کی جامع مسجد کا قصہ بھی کچھ مختلف نہیں:

"راولپنڈی کی سب سے بڑی جامع مسجد میرے والد نے بنائی تھی اور وہ بھی صرف ایک رات میں۔ سکھوں نے کہا کہ ہم نہیں بنانے دیں گے۔ مگر وہ زمین ہماری تھی۔ اس پر سردار موہن سنگھ نے کہا کہ ہم نقشہ پاس نہیں کریں گے۔ اس پر تمام دُنیا آگئی اور ہر عورت اور مرد نے وہ مسجد بنا دی۔"

مگر جو مسجد مرگلا کے سبز دامن میں سفید کنول کی طرح کھِل اٹھی ہے وہ اسلام آباد کی مسجد شاہ فیصل ہے جس کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ نگاہ نہیں ہٹتی۔ شدید گرمی میں جب لوگوں نے بھیگے تولیے سروں پر لپیٹ لئے تھے اور اوپر پہاڑوں پر سوکھے جنگل سلگنے لگے تھے اور زمین سے اٹھنے والی حرارت میں سارے منظر تیرتے ہوئے سے دکھائی دے رہے تھے، دور سے اس مسجد کے اونچے میناریوں لگے جیسے تپتی دھوپ سے بے نیاز ہو کر وحدت کی شہادت دیئے جا رہے ہوں۔

اور پھر ایک اَور مسجد میں نے جرنیلی سڑک کے کنارے گوجر خان کے قریب دیکھی! اُس کی پیشانی پر سیاہی سے لکھا تھا: یہ مسجد فلاں مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے لئے ہے۔

پیشانیوں پر سیاہی کا سلسلہ پھر جہلم کے چوک اہل حدیث اور اُس سے بھی آگے تک چلا۔ پھر کسی مینار نے وحدت کی قسم نہ کھائی۔

ہاں تو راولپنڈی کے ماضی کا حال کننگھم صاحب نے کھولا۔ عجب انسان تھے۔ ہندوستان میں عمر گزاری اور ایک ایک پتھر الٹ کر دیکھا کہ شاید اس کے نیچے تاریخ کی کوئی گواہی چھپی ہو

انہوں نے سب سے پہلے پرانے شہر کے کھنڈرات دریافت کئے ۔ جہاں اب اوجھڑی کیمپ ہے ۔ یہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے بھی پہلے کے آثار موجود تھے ۔ یہ شہر کوہ ہندوکش سے اتر کر ہندوستان کے میدانوں کی طرف جانے والے لشکروں کے راستے میں پڑتا تھا چنانچہ بڑی مشکل سے آباد ہوتا تھا اور بڑی آسانی سے لُٹ جاتا تھا ۔ بالآخر یہاں گکھڑوں نے پڑاؤ ڈالا ۔ کہتے ہیں کہ یہ اصفہان ہیں کیان کے سلطان کیگوہر کی اولاد ہیں ، اسی لئے کیانی کہلاتے ہیں ۔

گکھڑوں نے یہاں رہتے رہتے جینے کا ہنر سیکھ لیا ۔ وہ شمال سے آنے والوں کو اپنا مہمان بناتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ آگے بڑھ جائیں گے ، البتہ دلّی کی طرف سے آنے والوں کو وہ قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے کیونکہ انہیں احساس تھا کہ یہ اُن کی خود مختاری میں نقب لگائیں گے ۔ دلی کی طرف سے آنے والوں نے انہیں کچلنے کی بڑی کوشش کی ۔ کسی نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور کسی نے کھال کھنچوادی مگر سب سے مؤثر ہتھیار اکبر کا تھا ۔ اس نے گکھڑ سلطان کی پوتی سے اپنے بیٹے جہانگیر کی شادی کردی ۔ یہ الگ بات ہے کہ بادشاہ بن کر جب جہانگیر راولپنڈی آیا تو اپنی توزک میں لکھا کہ "یہ گکھڑ عجیب حیوان صفت لوگ ہیں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں ۔ میں نے ہر چند چاہا کہ اس لڑائی جھگڑے کو ختم کیا جائے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا"

بالآخر فائدہ ہوا تو سکھوں کو ۔ گکھڑ سردار مقرب خان کو سکھ سردار گجر سنگھ نے تہ تیغ کیا ۔ علاقہ وہی رہا ۔ سردار بدل گئے ۔ میں جن دنوں راولپنڈی پہنچا ، علاقے پر سردار ملکھا سنگھ کے قبضے کی بات پورے دو سال پرانی ہو رہی تھی ۔ کہتے ہیں کہ اس نے راولپنڈی کو بہت جی لگا کر آباد کیا تھا ۔ البتہ پاکستان بننے سے اٹھانوے برس پہلے سکھوں نے خاموشی سے اپنے ہتھیار اور اپنا یہ شہر انگریزوں کو سونپ دیا ۔ اُس وقت کوئی سکھ آہستہ سے بولا تھا کہ "آج مہاراجا رنجیت سنگھ مر گئے" ۔ اعتراف شکست کی اس تقریب پر کیسا سناٹا طاری رہا ہوگا کہ

ایک ذرا سا فقرہ دور دور تک سنا گیا۔

مگر پھر فرنگیوں کے ساتھ فراوانی آئی۔ کشادہ سڑکیں بنیں۔ دورویہ درخت لگے۔ ندی نالوں پر پُل بندھے۔ بڑے بڑے باغ لگے۔ مدرسوں، کالجوں، کچہریوں، گرجوں اور ہسپتالوں کی سرخ اینٹوں اور کھپریل کی چھتوں کی عمارتیں بنیں۔ جہاں سکھوں کا پرانا قلعہ تھا وہاں راجا بازار بنا اور جس جگہ حضرت عیسیٰ سے بھی پہلے کے کھنڈر تھے وہاں چھاؤنی بنی، چنانچہ ۱۹۰۰ء کے گزیٹر میں لکھا ہے کہ راولپنڈی شمالی ہندوستان کا سب سے صاف ستھرا شہر تھا۔

وہ شہر اب گر رہا ہے، کچھ یوں بھی کہ مرگلا کے دامن میں ایک نیا شہر اٹھ رہا ہے۔

میں اسلام آباد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جہاں کبھی صرف برساتی نالے بہا کرتے تھے اور جس علاقے کے سکوت کو صرف سید پور جانے والے یاتری اور نور پور شاہاں جانے والے ملنگ توڑا کرتے تھے، اُس کی چٹانوں کو توڑ کر لوگوں نے ایسی لبتی تراشی ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی۔

لوگوں کی طرح شہروں کے بھی کردار ہوا کرتے ہیں۔ اسلام آباد کا عجیب کردار ہے جہاں چھوٹے چھوٹے مکانوں میں چھوٹے چھوٹے گریڈ والے آباد ہیں وہاں بڑی رونق ہے اور چہل پہل بھی ہے مگر جہاں کئی کئی ہزار گز کے پلاٹوں پہ لاکھوں کی لاگت سے بنے ہوئے مکان کئی کئی لاکھ ماہانہ پہ اٹھے ہوئے ہیں وہاں دل دہلا دینے والی ویرانی ہے اور اگر وہاں ڈراوڑں پہ باوردی دربان نہ کھڑے ہوں تو آدمی آدمی کی صورت دیکھنے کو ترس جائے۔

اس کے برعکس چھوٹے گریڈ کے سرکاری ملازموں کے لئے جو مکان حکومت نے بنوائے ہیں وہ غریب کے دامن سے بھی زیادہ تنگ ہیں۔ ان ہی مکانوں کے بارے میں مشہور ہوا تھا ان کے تنگ دروازوں سے میت بھی نہیں نکل سکتی چنانچہ ایک سرکاری وزیر معائنے کے لئے گیا تو ایک دروازے سے خالی تابوت نکال کر دکھایا گیا، تب کہیں اہل شہر نے اطمینان کی سانس لی۔

ادھر شہر راولپنڈی سے وہ پہلا سا اطمینان کبھی کا رخصت ہوا۔ پورے شہر میں لوگ پرانی

عمارتوں کو توڑ توڑ کر فلیٹ، آفس، مارکیٹیں اور دکانیں بنائے چلے جا رہے ہیں۔ تمام بڑی سڑکوں کے کنارے اب دکانیں ہی دکانیں ہیں۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ عالم میں نے پشاور سے کلکتے تک دیکھا۔ کیا گوجرانوالہ، کیا آگرہ، کیا کانپور اور کیا بنارس، اس ڈیڑھ ہزار میل کی پٹی میں اتنی مارکیٹیں اور اتنی دکانیں تعمیر ہو رہی ہیں کہ ان کی قطار کو شمار کرنا مشکل ہے۔ راہ میں پڑنے والے دیہات میں بھی دکانوں پر دکانیں بن رہی ہیں۔ ہر شخص کچھ نا کچھ بیچ رہا ہے۔ جو بیچ نہیں رہا ہے وہ کچھ نہ کچھ خرید رہا ہے۔ رات ٹیلیویژن پر مہارانی ہیر آئل کا اشتہار آتا ہے، صبح سارا شہر مہارانی ہیر آئل خریدنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ رات ٹیلیویژن پر فولاد مارکہ پریشر کُکر کی کرامات دکھائی جاتی ہیں، پھر اگلی صبح طلوع ہونے والا دن اس اشتہار کی کرامات دیکھتا ہے۔ نپولین نے انگریزوں کے بارے میں کہا تھا کہ دوکانداروں کی قوم ہے۔ نپولین دنیا میں دوبارہ آجائے تو اپنے مقولے پر اُسے نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔

پنڈی کا حال اب یوں ہے کہ پہلے جہاں پنساریوں کی، عطاروں کی، کپڑے اور جوتے والوں کی، حقے اور تمباکو کی دکانیں ہوا کرتی تھیں وہاں اب کمپیوٹر کی، ویڈیو کی اور الیکٹرانکس کے جدید آلات کی دکانیں مال اسباب سے بھری پڑی ہیں۔ جہاں لوگ کھڑے کھڑے مالٹے اور گنے کا رس پیتے تھے اور روٹی کے ساتھ مرغ چھولے کھایا کرتے تھے وہاں اب وہ کھڑے کھڑے جدید مشینوں پر فوٹو کاپی نکلوا رہے ہیں، ایک کیسٹ کے گانے پلک جھپکتے دوسرے کیسٹ میں اتروا رہے ہیں۔ جاپانی کیمروں سے نکلی ہوئی امریکی رنگین فلمیں اپنے سامنے دھلوا کر کمپیوٹرائزڈ مشینوں سے چمکدار تصویریں نکلوا رہے ہیں۔ مرغ چھولے اب ائر کنڈیشنڈ ریستورانوں کے اندر ملتے ہیں اور گنّے کے ساتھ نہ صرف لیموں بلکہ پودینے کے پتے اور ادرک کے ٹکڑے بھی پس رہے ہیں۔

ہاتھ ہاتھ بھرے لمبے گلاسوں میں لسّی پیتے پیتے دنیا کہاں جا پہنچی۔

وہ بات زیادہ پرانی تو نہیں جب راولپنڈی والے گاتے ہوئے، مستانہ وار رقص

کرتے ہوئے امام برّی شاہ لطیف کی درگاہ پر جایا کرتے تھے اور جہاں اب اسلام آباد ہے وہاں پہاڑی چشموں کا شور ان کے نغموں سے ہم آہنگ ہو جایا کرتا تھا۔ جب کمپنی باغ میں میلہ لگا کرتا تھا اور اونچے اونچے درختوں پر جھولے ڈالے جاتے تھے اور پوٹھوہار کے دیہاتی نوجوان جب پینگیں لیا کرتے تھے تو لڑکیاں بھول جاتی تھیں کہ چادر سر سے سرک گئی ہے۔ اور پھر رات رات بھر عنایت حسین بھٹی گایا کرتے تھے اور لوگ کیسے بج دھج کے آیا کرتے تھے۔ جب گرمیوں میں لوگ بسوں میں بھر بھر کر مری جایا کرتے تھے اور رستے میں بسوں کے گرم پہیوں پر چشموں کا شفاف پانی ڈالا جاتا تھا تو پوری فضا میں بھاپ کے بادل اڑا کرتے تھے اور چائے لمحہ بھر میں ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھی۔ لوگ جی ٹی ایس کی بسوں میں بیٹھ کر ٹوپی رکھ، جاتے تھے اور جھاڑیوں میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے اور جھیل میں کرائے کی کشتیاں چلایا کرتے تھے۔ سردیوں میں صدر کی بیکریوں سے وہ ہنٹرز بیف خرید کر لایا کرتے تھے اور راجا بازار سے تازہ پنیسا آتا تھا، گھر گھر مکئی کی روٹی، چنے کا ساگ اور پالک گوشت پکتا تھا اور بوریاں بھر بھر کر مالٹے چوسے جاتے تھے۔ پھر سردیوں کی صبحوں میں موٹے موٹے کنٹوپ اور دستانے پہنے، مفلر پیٹے اور منہ سے بھاپ کے بادل اڑاتے ہزاروں ملازمین سائیکلوں پر بیٹھ کر جی ایچ کیو جایا کرتے تھے اور خدا جانے وہ کون تانگے والا تھا جو راہ گیروں کو خبردار کرنے کے لئے صدا لگاتا جاتا تھا: بچ — بچ!!

وہ سب باتیں خواب ہو گئیں۔ اب جاپان کی بنی ہوئی ویگنیں چل رہی ہیں اور ان میں ٹھنسے ہوئے مسافر ویگنوں کے مالکوں کو کوس رہے ہیں کہ پوچھا نہ گچھا جب جی چاہا کرایہ بڑھا دیا۔ کنڈکٹر اور ڈرائیور بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر بحث میں شریک ہیں۔ وہ شور ہے کہ خدا کی پناہ۔ سب بیک وقت چلا رہے ہیں۔ اور بیچ بیچ میں کوئی مسلسل کہے جا رہا ہے: اوئے بکواس نہ کر، اوئے بکواس نہ کر!!

رُہتاس تنہا کھڑا ہے

قلعہ رہتاس کہنے کو تو برصغیر کے تاج میں نگینے کی طرح جڑا ہے ۔مگر انسان کی طرح بستیوں کی، آبادیوں اور عمارتوں کی بھی تقدیر ہوا کرتی ہے ۔ رہتاس کی تقدیر میں تنہائی لکھی ہے ، کم لگا ہی لکھی ہے ۔ یہ قلعہ جرنیلی سڑک سے صرف چار پانچ کیلومیٹر دور ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہے مگر چپ سادھے ۔ عظمتِ رفتہ کے اِس شاہکار کو کوئی دیکھنے بھی نہیں آتا ۔ ایک پٹھان بادشاہ نے اس خطّۂ زمین پر جو فصیلیں اٹھائی تھیں وہ اپنی قدامت کے باعث نہیں بلکہ دوسروں کی بے توجہی کے سبب سے یوں جھکی جارہی ہیں کہ اب گریں اور اب گریں ۔

ہم سنتے آئے تھے کہ بستیوں کے مقدر دریاؤں سے بڑے ہوتے ہیں ۔ دریا اپنا کنارہ چھوڑ کر دور چلے جائیں تو آبادیاں ویرانوں میں بدل جایا کرتی ہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عظمتوں کی نشانیوں کے مقدر سڑکوں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں ۔ سڑکیں اپنی راہ بدل جائیں تو یہ نشانیاں راہ میں ماری جاتی ہیں ۔

شیر شاہ کی شاہراہ اعظم پاکستان میں جہلم کے قریب اسی قلعہ رہتاس کے پہلو سے لگی رہا کرتی تھی ۔ رات دن سینکڑوں ہزاروں قافلے اور کاروان اِدھر سے گزرا کرتے تھے ، کسی شہ رگ میں دوڑنے والے خون کی طرح ۔ مگر بعد میں انگریزوں نے اس سڑک کو ندی نالوں

کے اس علاقے سے ہٹاکر پانچ میل دور دینا کی طرف موڑ دیا۔ اب جدھر سے سڑک گزرتی ہے، اُدھر سے خلق خدا گزرتی ہے اور رہتاس تنہا کھڑا ہے۔

میں صبح تڑکے راولپنڈی سے جیپ میں بیٹھ کر رہتاس پہنچا۔ ابھی اتنا سویرا تھا کہ دینا سے جہاں ہماری گاڑی رہتاس جانے والی تنگ اور خستہ حال سڑک پر مڑی وہاں گاڑیوں سے محصول لینے والا شخص بھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ اور جس وقت ہم قلعے کے دروازہ خواص خانی پر پہنچے تو صبح کے سورج کی پہلی کرنوں میں یہ ساڑھے چار سو سال پرانی عمارت یوں لگی جیسے سونے کے پانی میں نہائی ہو۔

جہلم سے سولہ کیلو میٹر شمال مغرب میں قلعہ رہتاس شیر شاہ سوری نے اس وقت بنوایا تھا جب ہمایوں ہندوستان چھوڑ کر جا چکا تھا اور شیر شاہ کی حکمرانی بنگال، بہار، آگرہ، دلی، ملتان اور لاہور سے پھیلتی ہوئی جہلم اور راولپنڈی کے علاقے تک جا پہنچی۔ مگر یہاں کا معاملہ مختلف تھا۔ اس سارے علاقے میں گکھڑ آباد تھے جو ہمایوں کے دوست تھے لہٰذا شیر شاہ کے دشمن تھے۔ اپنا یہ علاقہ انہوں نے دلی کی فوجوں کے لئے بند کر رکھا تھا۔

شیر شاہ نے ان کے اس علاقے کو اپنی حکمرانی میں ملانا چاہا اور گکھڑ سرداروں کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور اُس کی اطاعت قبول کریں۔ گکھڑوں نے انکار کر دیا۔ شیر شاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اُس نے گکھڑوں سے کہا کہ خدا نے چاہا تو تمہارے سینے میں ایک ایسی میخ ٹھونکوں گا جسے کوئی قیامت تک نہیں نکال سکے گا۔ اس کے بعد شیر شاہ نے اپنے وزیر مال ٹوڈرمل کو حکم دیا کہ گکھڑوں کی سرزمین کے بیچوں بیچ قلعہ تعمیر کرے۔ اس کے لئے اُس نے پیسہ دیا اور واپس آگرہ چلا گیا۔

اس پر گکھڑ سردار جمع ہوئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ علاقے کا کوئی بھی شخص مزدوری نہیں کرے گا، پھر دیکھتے ہیں قلعہ کیسے بنتا ہے۔ تمام گکھڑ آبادی سرداروں کی تابع تھی۔ کس کی مجال کہ اس حکم سے سرتابی کرے، چنانچہ ٹوڈرمل کو پتھر ڈھونے والے اور تراشنے

کے لئے ایک بھی مزدور نہ ملا اور قلعے کی تعمیر شروع نہ ہو سکی۔ اُس نے شیر شاہ کو اس معاملے سے آگاہ کیا تو جواب آیا کہ میں تو تمہیں ہوشیار اور تجربہ کار آدمی سمجھتا تھا۔ تمہیں پیسہ مل چکا ہے۔ کسی بھی قیمت پر قلعہ تعمیر کرو، خزانے سے رقم نکلواؤ، چاہے جتنی رقم ہو، مجھے پروا نہیں۔

بادشاہ کا یہ حکم ملتے ہی ٹوڈر نے تمام علاقے میں اعلان کر دیا کہ پتھر لانے والوں کو ہر پتھر پر ایک اشرفی دی جائے گی۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ چہار جانب سے لوگ پتھر لاد لاد کر پہنچنے شروع ہو گئے۔ اشرفیاں بٹنے لگیں اور اب تو مزدوروں کی ایسی یلغار ہوئی کہ ایک ایک پتھر کا معاوضہ گھٹتے گھٹتے ایک دام، پھر دس ٹکا اور بالآخر صرف ایک بہولی رہ گیا۔

دیکھتے دیکھتے رہتاس کے دروازے، بُرج اور فصیلیں آسمان کو چھونے لگیں۔ قلعے کی تعمیر غالباً اتوار ۲۵ مئی ۱۵۴۲ء کو صبح سات بجے شروع ہوئی اور آج ہم اس کی عمارت جو دیکھ رہے ہیں یہ آٹھ نو سال میں بن کر تیار ہوئی اور اس پر جو خرچ آیا، آج کے روپوں میں خدا جانے کتنا رہا ہوگا، اس وقت کے بہولی سکے میں اس کی تعمیر پر چوبیس کروڑ پندرہ لاکھ پانچ ہزار ڈھائی دام اُٹھے۔

رہتاس کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ سرکش گکھڑوں کو دبایا جائے اور افغانستان کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کا راستہ بند کر دیا جائے۔ اس کے لئے شیر شاہ نے جو جگہ چُنی اس کا انتخاب ہی پٹھان بادشاہ کی اعلیٰ ذہانت اور تدبر کا ثبوت ہے۔ یہی راستہ تھا جس پر سکندر اپنی کشتیاں اور بابر اپنی توپیں کھینچتا ہوا گزرا تھا۔

ہماری جیپ اُس صبح خستہ حال سڑک پر چل کر، پھر ایک کچّی سڑک پر اتر کر، اس کے بعد نالہ کہان پار کر کے اور اونچے ٹیلے کی پتھریلی راہ طے کر کے وہاں پہنچی۔

قلعے کے اندر جو پرانی بستی ہے اُس کے باشندوں نے صبح صبح جو ایک اجنبی کو آتے دیکھا تو وہ گھروں سے نکل آئے۔ ان میں قلعے کے ایک بزرگ سوار الدین شیدا بھی تھے۔

خود اس قلعے کی طرح ضعیف ہو گئے ہیں اور زیادہ تر عمر قلعے کے اندر گزاری ہے وہ مجھے قلعے کی سیر کرانے چلے تو دیکھا کہ صبح کی دھوپ میں کچھ عورتیں روشن لالٹینیں لئے چلی جا رہی ہیں۔ میں نے حیرت سے سوار الدین صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے عجیب واقعہ سنایا۔

رہتاس کے قلعے میں بارہ بڑے بڑے دروازے ہیں جن میں سے ایک سوہل دروازہ یا سہیل دروازہ کہلاتا ہے۔ یہ افغانستان کی طرف کھلتا ہے اور اتنا عظیم الشان ہے کہ بعد میں مغل عمارتوں نے اپنی عظمتیں اور رفعتیں اسی دروازے سے مستعار لی ہوں تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔

سہیل دروازے کی دونوں جانب دو بہت بڑے بڑے بُرج ہیں۔ اُن میں سے ایک بُرج کے اندر کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ کی قبر ہے جن کا نام سہیل خاں غازی بتایا جاتا ہے اور اُن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ احمد نگر کے شہزادے تھے۔ وہ سُوریوں کے زمانے میں اپنا تخت و تاج چھوڑ کر رہتاس آ گئے تھے اور یہاں کی پُر سکون فضا میں خدا سے لو لگائی تھی۔ دور دور تک ان کے زہد اور تقوے کا چرچا تھا۔ جب ان کی وفات ہوئی تو انہیں بُرج کے اندر دفن کیا گیا اور اس طرح قلعے کا یہ دروازہ ان کے نام پر سہیل دروازہ کہلایا۔

روایت یہ ہے کہ پنجاب کے گورنر سر رابرٹ مٹکاف اپنی بیوی کے ساتھ قلعہ رہتاس میں آئے۔ اُسی دوران سہیل خان غازی کی قبر کی بے حرمتی ہوئی اور سر رابرٹ کی بیوی پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ گورنر نے اس قبر اور بُرج کو خطرناک قرار دے کر اُس دروازے میں پتھر چنوا دیئے جس سے گزر کر لوگ قبر تک جایا کرتے تھے۔ البتہ اوپر بُرج کی چھت پر قبر کا نشان بنا دیا گیا۔ خلقت اُسی پر فاتحہ پڑھنے لگی حالانکہ نہ اُس کا رخ درست تھا، نہ اس پر کوئی کتبہ لگا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ پُرانی اور اصل قبر کو بھول گئے اور وہ بند برج کے اندھیرے

میں کھو گئی۔

جس روز میں وہاں پہنچا ان ہی دنوں کسی دوسرے شہر میں کسی بااختیار شخص نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جنہوں نے کہا کہ میں سہیل ہوں اور رہتاس کے بُرج میں بند ہوں۔ یہاں اندھیرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اس کا دروازہ سیڑھیوں کے پاس ہے۔ اُسے کھولو تاکہ مجھے روشنی اور تازہ ہوا نصیب ہو۔

وہ شخص رہتاس آیا۔ مزدور لگائے گئے اور سیڑھیوں کے پاس پتھر گرا کر پرانا دروازہ پورے اسّی سال بعد دوبارہ کھول دیا گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا اور ایک تنہا قبر کے سوا کچھ نہ تھا۔ آناً فاناً اس کی خبر دور دور تک پھیل گئی اور لوگ رہتاس پہنچنے لگے۔ بُرج کے اندر بے حد اندھیرا تھا اس لئے لوگ دن کے اُجالے میں بھی لالٹینیں لے کر آ رہے تھے۔

اس بزرگ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر ہم لوگ باہر نکلے اور اُس بُرج پر پہنچے جس کا نام پیرا غیب ہے، یہ بھی کوئی بزرگ تھے جن کی قبر نہیں ملتی کیونکہ وہاں یہ داستان آج تک چلی آ رہی ہے کہ وہ ایک روز لوگوں کی موجودگی میں نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ بُرج پیرا غیب کہلایا۔ اُس بُرج کی بیرونی دیوار پر، تقریباً پچاس فٹ کی بلندی پر بیری کا ایک پودا پھوٹا جو تناور درخت بن گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ درخت دو سو سال پرانا تھا۔ جس روز میں رہتاس پہنچا اس بیری کے ساتھ عجیب واقعہ ہو چکا تھا۔ سوار الدین صاحب نے وہ مجھے بھی سنایا:

"پچھلی بارش ہوئی ہے پانچ چھ دن ہوئے ہیں۔ وہ بارش آئی اور بڑے زور و شور سے۔ اوپر دیوار پر یہ بیری تھی۔ پندرہ فٹ اس کا گھیرا تھا۔ وہ اِس پتھر سے نکل کر اتنی بڑی بنی اور عرصہ دو سو سال سے زائد ہے۔ اور رات کو پھر بارش آئی، بجلی کڑکی، اس قدر بجلی کڑکی کہ پتہ لگا کہ یہاں پڑی ہے۔ یہاں پڑی ہے۔ وہ اِس درخت پر پڑی۔ بارش بھی برستی رہی درخت جلتا بھی رہا۔ یہ خدا کی قدرت

ہے کہ پتھر سے اتنا بڑا درخت اگا، اور پھر بارش بھی برستی رہی، آگ بھی جلتی رہی، دو دن تک وہ جلتی رہی۔ پتہ نہیں کیا معاملہ ہے۔ اِسے کہتے ہیں خدا کی قدرت۔"

قلعہ رہتاس کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کے اندر اور آس پاس پہنچے ہوئے بزرگوں کی بہت سی قبریں ہیں۔ سید کمال چشتی، سید جمال چشتی، نور چشتی، شہید مرزان، مراد علی شاہ، سید حسین، سائیں ستار، شاہ چانن ولی، شاہ دارا، ناصرالدین، شاہ محمد شہید وغیرہ سب یہیں محو آرام ہیں، یہ بزرگ کون تھے؟ کب اور کہاں سے رہتاس آئے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے چل کر یہاں کیوں پہنچے۔ کہیں یوں تو نہیں تھا کہ جس طرح یہ علاقہ کئی ہزار برس سے جوگیوں کا مرکز رہا ہے اُسی طرح یہ تصوف کا مرکز بھی رہا ہو۔ تاریخ خاموش ہے، لوگ بول رہے ہیں۔ دور دور سے بیمار یہاں آرہے ہیں اور پیرا غیب بُرج کی خاک لے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس سے بیماروں کو شفا ہوتی ہے اور جب شفا ہو جاتی ہے تو وہ یہاں نمک رکھ جاتے ہیں۔ نمک کا اس علاقے سے گہرا تعلق ہے۔ کھیوڑا کی نمک کی کانیں آس پاس ہیں اور سنا ہے کہ قلعے کی تعمیر سے پہلے اس جگہ نمک کی بڑی منڈی ہوا کرتی تھی۔ سکندر جب یہاں آیا تھا تو اُسے نمک کی کانوں کا علم تھا اور اُس وقت بھی یہاں جوگیوں کا پڑاؤ تھا۔

ایک اور دروازے میں خدا رسیدہ بزرگ جمال چشتی دفن ہیں، کہتے ہیں کہ وہ قلعے کی تعمیر میں خود شامل تھے اور اُن سے زیادہ اُن کی دعائیں شامل تھیں۔ یہی حال اُن کے چھوٹے بھائی کمال چشتی کا تھا جن کا چھوٹا سا روضہ قلعے کے بالکل سامنے بنا ہوا ہے۔ عین اُن دنوں جب یہ قلعہ بن رہا تھا ان کی وفات ہوئی۔ کہتے ہیں کہ خود شیر شاہ کو اُن سے گہری عقیدت تھی۔

قلعے کا ایک اور دروازہ چانن ولی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے سامنے ایک اور

بزرگ چاندولی کا مزار ہے جو خاموشی سے آکر قلعے کے مزدوروں میں شامل ہو گئے تھے۔ دن بھر کام کرتے تھے اور مزدوری بھی نہ لیتے تھے۔ رات بھر عبادت کرتے تھے لیکن اتنی خاموشی سے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ جب قلعہ بن گیا تو وہیں دھونی رمالی اور قلعے کی تعمیر آخری مرحلوں میں تھی کہ مر گئے۔ اُس وقت شیر شاہ کے بیٹے سلیم شاہ کی حکمرانی تھی۔ اس نے چاندولی کی یادگار کے طور پر اس جگہ ایک بڑا دروازہ بنوا دیا جہاں سے اُٹھ کر وہ جنت کے دروازوں میں گئے ہوں گے۔

قلعہ رہتاس میں سب سے دلچسپ مزار شیر شاہ کے بے حد چہیتے سپہ سالار خواص خاں کا ہے۔ شیر شاہ نے اسے پورے پنجاب کا کمان دار بنا دیا تھا اور صوبے کی کل آمدنی کا دسواں حصہ اُسے سونپ دیا تھا۔ آج اگر آپ قلعہ رہتاس جائیں تو جس بڑے دروازے سے آپ قلعے میں داخل ہوں گے وہ خواص خانی دروازہ کہلاتا ہے۔ اس دروازے سے ملی ہوئی ایک قبر بھی ہے۔ اس کا جو قصہ قلعے کے باشندے سناتے ہیں وہ ایسا ہے کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کہتے ہیں کہ اس قبر میں خواص خان کا صرف سر دفن ہے۔ اس کا دھڑ کہیں اور گجرات کے علاقے میں دفن ہے۔ ہوا یہ کہ خواص خان شیر شاہ کو جتنا عزیز تھا، اس کے بیٹے سلیم شاہ کو اس سے اتنی ہی نفرت تھی۔ تخت سنبھالنے کے بعد سلیم شاہ نے خواص خاں کے خاتمے کا منصوبہ بنایا اور سات آدمیوں کو دلی سے رہتاس بھیجا کہ منہ اندھیرے جب خواص خاں تنہا کمال چشتی کی قبر پر حاضری دینے جاتا ہے اُسی وقت اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔ یہ ساتوں آدھی رات کے بعد رہتاس پہنچے اور خواص خان کی گھات میں بیٹھ گئے۔ صبح تڑکے خواص خاں بڑے دروازے سے باہر نکلا۔ یہ دروازہ ابھی ابھی بن کر تیار ہوا تھا اور چشتی دروازہ کہلاتا تھا۔ خواص خان کو دیکھتے ہی اُس کے قاتل اس پر جھپٹے اور تلوار کا ایسا وار کیا کہ سر کٹ کر گر گیا البتہ تن بدستور چلتا گیا اور رُکے بغیر روضے سے بھی آگے نکل گیا۔ اس

کے قاتل یہ منظر دیکھتے رہ گئے۔ اب جو دن نکلا اور لوگ ادھر سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ پنجاب کے سپہ سالا کا سر خون میں لت پت پڑا ہے۔ فوراً ہی کہرام مچ گیا کیونکہ خواص خان تنہا شیر شاہ کا نہیں، تمام آبادی کا چہیتا تھا۔

اب جو قاتلوں کو پتہ چلا کہ انہوں نے ایک ایسے نیک شخص کو قتل کیا ہے تو وہ ساتوں وہیں دروازے کے برابر والی فصیل پر چڑھے اور وہاں سے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ خواص خاں کو ہم نے قتل کیا تھا، اوپر سے نیچے چھلانگ لگادی قلعے کی دیوار کے پاس سات قبریں آج بھی موجود ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قاتلوں کی ہیں۔

خواص خان کا سر دروازے کے اندر دفن کر دیا گیا اور اس کے دھڑ کا قصہ لوگ یہ سناتے ہیں کہ ضلع گجرات میں لالہ موسیٰ کے علاقے میں خواص پور کے قریب چند عورتوں نے دیکھا کہ ایک دھڑ، سر کے بغیر چلا آرہا ہے، چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خواص خان کا تن وہاں گاؤں میں دفن ہے۔

تاریخ میں اس قصے کی ذرا سی بھی شہادت نہیں ملتی لیکن تاریخ کے ساتھ ایک عجب معاملہ ہے۔ اس کی دو داستانیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو کتابوں میں رہا کرتی ہیں اور دوسری وہ جو ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوتی جاتی ہیں۔ وہ قصے جو عام لوگ سناتے ہیں اس سفر میں ایسے بہت سے قصے آئیں گے۔ اُن میں سچ کتنا ہوتا ہے، یہ ایک الگ بات ہے لیکن کیا وہ کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس پر بھی غور کیا جانا چاہیئے۔

مگر شیر شاہ کی سڑک کے احوال میں یہ پیروں فقیروں کا ذکر کیوں؟ یہ تمہید ہے اس گفتگو کی کہ پندرہ سو میل لمبی اس قدیم سڑک کے دونوں کناروں پر اَن گنت بزرگانِ دین کے مزار ہیں جو اسی راستے خیبر سے بنگالہ تک آیا جایا کرتے ہوں گے اور اپنے عہد کے ہندوستان کی سماجی زندگی پر اس طرح اثر انداز ہوا کرتے ہوں گے کہ آج ہم سوچ

بھی نہیں سکتے۔

اگر جرنیلی سڑک کو شہرِ عشق، تصور کر لیا جائے تو میر تقی میرؔ کے یہ شعر سمجھ میں آتے ہیں۔

جہاں آ گئے بہاریں ہو گئی ہیں
وہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں
سنا جاتا ہے شہرِ عشق کے گرد
مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں

ہم نے دیواریں پڑھیں

رہتاس کا ایک اور قصہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ یہ کانوں سُنا نہیں آنکھوں دیکھا ہے۔

قلعے کے بارہ شاندار دروازے، ستر کے قریب بُرج، دو ہزار سے ذرا کم کنگرے، ساڑھے نو ہزار سیڑھیاں، پانچ نقار خانے، تین باؤلیاں، ایک شاہی مسجد، پھانسی خانہ اور شیر پنجرہ دیکھتے ہوئے ہم آگے چلے۔ بہت بلند رانی محل کا نظارہ کرتے ہوئے ہم سفید محل کی سیڑھیاں چڑھے۔ وہ عالم اس خواب جیسا تھا کہ جس میں کتنی ہی سیڑھیاں چڑھیں وہ ختم ہونے کو نہیں آتیں۔

ایسی ہی عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک کمسن بیٹے نے اپنے باپ سے پوچھا تھا کہ اب اللہ میاں کتنی دور ہیں؟ اس روز کی سیڑھیاں طے کرتے جب ہم اس بلندی پر پہنچے جہاں ایک بڑا کمرہ تھا اور جس میں ہر طرف جھروکے کھلتے تھے اور ٹھنڈی ہوا فراٹے بھرتی تھی اور ترکی کے پہاڑوں سے راجا پورس کے میدان جنگ تک تلے اوپر منظر ہی منظر دکھائی دیتے تھے تو ہمیں صاف لگا کہ اللہ میاں کہیں آس پاس موجود ہیں اور وہ ہمیں یہاں بلا سبب نہیں لائے ہیں۔

یہ عمارت اب حویلی مان سنگھ کہلاتی ہے۔ کبھی اکبر کا یہ سپہ سالار یہاں رہا ہوگا۔

کابل جانے والی تازہ دم فوجیں اور وہاں سے لوٹتی ہوئی تھکی ہاری سپاہ یہیں کہیں دم لیا کرتی ہو گی۔ اس کا تو کوئی ثبوت نہیں ملا لیکن قندھار جانے والی مہم اور وہاں سے واپس آنے والی شکست خوردہ فوج کا حال اُس روز اچانک یوں کھُلا کہ اس شہادت میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

اینٹوں کی اس عمارت کے اندر کبھی چینی کے برتنوں جیسا روغنی پلاسٹر کیا گیا ہوگا جو کبھی کا گر گرا کر برابر ہوا البتہ اُس پلاسٹر کا ایک حصہ ایک جھروکے کی چھت میں بچا ہے۔ میں قریب جا کر اُسے غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا خبر پرانے زمانے کے لوگ اُس دیوار پر کچھ لکھ گئے ہوں۔

اچانک میری نگاہ کچھ تحریروں پر جم گئی۔ وہ جو پرندوں کے پر تراش کر قلم بنائے جاتے تھے اور انہیں سیاہی میں ڈبو کر لکھا جاتا تھا، اُن ہی قلموں سے جھروکے کی چھت پر کچھ لکھا ہوا تھا۔

" یہ دیکھو، یہ دیکھو، مہم قندھار" میں چھوٹے بچوں کی طرح چلّایا اور قلعے کے وہ تمام باشندے جو ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے وہاں آ گئے۔ کسی نے اوپر چڑھ کر ان تحریروں کو پڑھا تو 'مہم قندھار' کے علاوہ وہاں فارسی شعر لکھے تھے۔ کچھ لوگوں کے نام اور کچھ تاریخیں درج تھیں۔

قلعے والے حیران تھے۔ انہوں نے یہ تحریریں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں نے جھٹ اپنا کیمرہ نکالا اور ان تحریروں کا عکس محفوظ کر لیا۔ نئے زمانے کے نوجوان اُن کے اوپر اپنے نام لکھ چکے تھے اور بعض من چلے یہ آزمانے کے لئے کہ وہ سیاہی مٹ سکتی ہے یا نہیں، کئی جگہ سے اُسے مٹا چکے تھے، تھوک لگا کر۔

میں ان بچی کھچی تحریروں کی تصویریں اتار کر اپنے ساتھ لندن لے آیا اور یہاں وہ تصویریں تاریخ کے اور قدیم فارسی کے استاد اور محقق ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کو

دکھائیں۔ انہوں نے سوجتن کر کے وہ عبارتیں پڑھیں، پھر لائبریری جاکر تحقیق کی اور یوں ان کا حال کھلا۔ شکیب صاحب نے بتایا:

"یہ کوئی باقاعدہ کتبے تو نہیں ہیں، ظاہر بات ہے کہ وہاں کچھ دیر کو جو سپاہی یا امرا ٹھہر گئے تھے ان لوگوں میں غالباً شعر و شاعری کا مشغلہ تھا تو اُن لوگوں نے جو شعر کہے وہ دیوار پر لکھ دیئے۔ اور جھروکے کی چھت پر اس لئے لکھے کہ مٹ نہ جائیں اور بہت عرصے باقی رہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مٹے نہیں اور آپ اُن کی تصویریں لے کر آئے ہیں۔

یہ شعر بہت دلچسپ ہیں۔ ان میں بے ثباتی دُنیا کا احساس ملتا ہے، مثلاً کہا گیا ہے کہ "ماو زمانہ خون گریم" یعنی ہم اور زمانہ خون رو رہے ہیں۔ ایک جگہ تو اس نے کہا ہے کہ "چوں سنگ فلاخنم بگرد سرخویش" یعنی پورے شعر میں انہوں نے کہا ہے کہ جس طرح گوپن میں پتھر رکھ کے پھینکا جاتا ہے، انسانوں کے سر ویسے پھینکے گئے ہیں۔

غرض یہ کہ ان تمام مصرعوں میں ہارے ہوئے سپاہی کا احساس ہے اور اس کے پیچھے کچھ شہادتیں بھی ہیں۔ ان عبارتوں کی جو سب سے اہم خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تاریخ دی ہوئی ہے۔ وہ تاریخ دیتے ہیں: "درایں راہ در آمدنِ از مہم قندھار بتاریخ ہزار و شصت نوشتہ شد"۔ یعنی یہ کہ مہم قندہار سے واپس ہوتے وقت ۱۰۶۰ھ میں یہ اشعار لکھے گئے۔

جس تاریخ کی یہ تحریر ہے اس سے پہلے قندھار میں ایک واقعہ ہوا تھا۔ قندھار کے قلعے پر شاہ جہاں نے اس زمانے میں دولت خاں نامی ایک امیر کو مقرر کر رکھا تھا جو بڑا وجیہ تھا لیکن بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ وجاہت کی بنیاد پر تقرر کر دیا۔ چونکہ شاہ عباس ثانی اور جہانگیر میں بڑی دوستی تھی یہ گمان بھی

نہیں تھا کہ حملہ ہوگا۔ لیکن شاہ عباس ثانی شکار کھیلتے ہوئے قندھار پہنچ گئے اور پہنچتے ہی انہوں نے قلعہ بھی لے لیا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مغل سپاہ تھی وہ پسپا ہو کے وہاں سے بھاگی، اُسی میں یہ لوگ بھی آتے اور انہوں نے رہتاس میں پڑاؤ ڈالا۔

دیوار پر جو نام لکھے ہیں ان میں کچھ نام تاریخی ہیں، جیسے شیخ نعمت اللہ۔ شاہ جہاں نامے میں ان کا تذکرہ ہے کافی۔ یہ پانچ سو ذات اور پچاس سوار کا مالک تھا۔ ایک اور نام ہے میر شریف کا۔ یہ بارہ سو سوار کے آدمی تھے۔ لیکن جو شعر صاف لکھے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں وہ کسی سرور نقلانی کے ہیں۔ ان کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ ان کا منصب کیا تھا۔ مگر ظاہر بات ہے کہ یہ بھی کچھ ہوں گے۔"

اتنے بڑے قلعے میں ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ پرانے کتبے بہت کم ملتے ہیں۔ بس کہیں اس کی تعمیر کی تاریخیں اور اخراجات کا حال لکھا ہے اور ایک جگہ کہتے ہیں کہ کسی کتبے میں لکھا ہے کہ قلعے کی تعمیر کے وقت یہاں اتنے بہت سے مزدور اور سپاہی رہتے تھے کہ ان کے لئے روزانہ جو دال پکائی جاتی تھی اس کی مقدار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس دال میں جو ہر روز ہینگ ڈالی جاتی تھی اس کا وزن کئی من ہوتا تھا۔

مجھے یقین نہیں آیا مگر سوارالدین شیدؔ صاحب مُصر تھے کہ انہوں نے یہ تحریر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔

سوارالدین صاحب کے بغیر رہتاس کی داستان مکمل نہیں ہوتی۔ جو کوئی قلعے کو دیکھنے آتا ہے اُنہیں بھی ضرور دیکھتا ہے ان کی باتیں توجہ سے سنتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ قلعے کی تاریخ کے وہ راوی اور باشندوں کے وہ نمائندے ہیں۔ قلعے کے اندر زندگی بہت دشوار تھی۔ پانی کی شدید قلت تھی اور پچاس پیسے میں پانی کا ایک گھڑا ملا کرتا تھا۔ اتفاق سے پنجاب

کے سابق گورنر عتیق الرحمان رہتاس آئے۔ سوار الدین صاحب نے، جو شیدا تخلص کرتے ہیں، گورنر کو اپنا منظوم سپاسنامہ پیش کیا جس میں پانی کی قلت کی ایسی تصویر کھینچی گئی کہ گورنر نے وہیں پانی کی فراہمی کا حکم جاری کر دیا۔

اب صورت یہ ہے کہ قلعہ رہتاس کے اندر پانی کی سپلائی ہے۔ گھر گھر نلکے لگے ہیں تمام چھتوں پر ٹیلیویژن کے ایریل نظر آتے ہیں۔ ڈاک خانہ ہے، اس میں ٹیلیفون ہے اور قلعے تک پہنچنے کے لئے نالہ کہان پر پُل نہیں تھا، اب سنا ہے وہ پُل بھی بن رہا ہے۔ قلعے کے اندر اسکول ہیں، شفاخانہ ہے، بہت سی مسجدیں ہیں، امام باڑے ہیں اور بازار ہے۔

ہم قلعہ دیکھ رہے تھے اور خود قلعے کے اور آس پاس کے دیہات کے بہت سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ ذرا دیر بعد دنیا زمانے کی باتیں چھڑ گئیں۔ کیسی باتیں تھیں وہ! ان میں گاؤں کے سادہ لوح باشندوں کا مذاق بھی تھا، زندگی کی طرف سے اُن کی مایوسی بھی تھی اور شہر سے اور خوش حالیوں سے دور رہ کر جو احساس شکست پیدا ہو جاتا ہے، وہ بھی تھا۔

میں نے کسی سے پوچھا "آپ کا کیا نام ہے"

"محمد لطیف"

"آپ کیا قلعے کی حفاظت کرتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"کیا کرتے ہیں، کس طرح حفاظت کرتے ہیں"

اس پر ایک دیہاتی نے لقمہ دیا "جہاں سے گرتا ہے اور گرا دیتے ہیں" یہ سُن کر پورا مجمع ہنسا لیکن میں نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا "نہیں نہیں۔ آپ بتائیے آپ کیا کرتے ہیں؟ مرمت کرتے ہیں یا دیکھ بھال کرتے ہیں"

"دیکھ بھال کرتے ہیں" جھلی لہجے میں جواب ملا "محکمے والے مرمت بھی کرتے ہیں کافی

جگہ کی مرمت بھی ہو رہی ہے۔

اب ایک اور دیہاتی نے خود ہی اپنا تعارف کرایا "میں بجری اور ریت اٹھاتا ہوں۔ وہاں سے اٹھائی ادھر ڈالی۔ بس۔"

"کتنے عرصے سے آپ یہ کام کر رہے ہیں ؟"

"میں جی سنہ ترپن سے کام کر رہا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے دوسرے لوگوں سے تصدیق چاہی "کیوں جی ؟"

"اور بتایئے۔ آپ کے گاؤں کے باشندے اپنی روزی کیسے کماتے ہیں ؟"

"بس جی۔ یہ سبزی دبزی بیچی۔ کچھ تھوڑا بہت کام کر دیا۔ کچھ زمینداری۔ میرا بھی بس یہ ہے کہ کبھی اِدھر آ گیا۔ کبھی کوئی نوکری کر لی۔ کبھی کچھ کر لیا۔ کبھی سبزی بیچ لی۔ ٹائم پاس کرنا ہے نا۔"

ٹائم پاس کرنے والی بات پر میں سوچنے لگا کہ جی ٹی روڈ سے صرف چار میل اندر ایک گاؤں کے باشندے کا زندگی کے معاملے میں یہ اندازِ فکر ہے۔

اب بات آگے بڑھی۔ میں نے گاؤں والوں سے پوچھا "آپ کے گاؤں کے جو بچے ہیں وہ تعلیم پا رہے ہیں یا نہیں ؟"

"جی ہاں"

"اسکول ہیں وہاں ؟"

"جی ہاں۔ بہت عمدہ اسکول ہیں۔ قلعے کے اندر جو اسکول ہے یہ ۱۸۵۸ء سے مڈل اسکول ہے۔ یہ تاریخی اسکول ہے اور اس علاقے کا سب سے پہلا اسکول ہے۔ یہاں اور کوئی اسکول نہیں تھا۔ یہ منبع ہے یہاں تعلیم کا۔"

سب لوگ بیک وقت بول رہے تھے۔ ان کے منہ سے 'منبع' جیسے الفاظ سن کر یقین آ گیا کہ یہ تاریخی اسکول بہت عمدہ ہو گا۔

"چکوال تک سے لوگ یہاں پڑھنے آتے تھے۔ اب یہ ۱۹۵۲ء سے ہائی اسکول

ہوگیا ہے۔ اب باقاعدہ اچھے رزلٹ آتے ہیں۔"

ایک اور دیہاتی نے لقمہ دیا "بڑی اللہ کی مہربانی ہے۔"

کسی نے بتایا: "اسی طرح یہاں گرلز اسکول ہے۔ وہ بھی علاقے کا ہائی اسکول ہے۔"

یہ ساری باتیں سن کر میں نے کہا "اب جو بچے تعلیم پا رہے، یہ تو پڑھ لکھ کر چلے جائیں گے روزگار اور ملازمتوں کی تلاش میں۔"

کئی دیہاتی ایک ساتھ بولے "یہ تو ہے، یہ تو ہے۔"

پھر ان میں سے ریت اور بجری ڈھونے والے کی آواز آئی "کیا پتہ چلے جائیں گے یا فوت ہو جائیں گے۔ کچھ پتہ ہے؟"

کسی نے کہا "وہ تو خیر....."

ریت بجری والا پھر بولا اور اصرار کے ساتھ بولا "نہیں نہیں۔ کیا پتہ ہے جی کیا ہوئے گا۔"

سیدھے سادے دیہاتیوں کے سوچنے کے اس انداز سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔

اور اب ایک دلچسپ بات۔

وہ مشہور ٹیلہ جوگیاں رہتاس سے صرف چند میل دور ہے جس پر کہتے ہیں کہ ہندوستان بھر کے جوگی جمع ہوا کرتے تھے۔ پہاڑیوں کے اوپر وہ پرفضا علاقہ ہے۔ سنا ہے شہنشاہ اکبر بھی ایک مرتبہ سیر و تفریح کے لئے وہاں گیا تھا۔ وہیں جا کر رانجھا بھی جوگیوں میں مل گیا تھا اور خود جوگی بن کر اُس نے اپنے کانوں میں بالے ڈالے تھے۔ مگر ایک روز چرخے کی کوک سن کر اُس سے رہا نہ گیا اور وہ پہاڑی سے اتر آیا۔

میں نے گاؤں کے نوجوانوں سے پوچھا "تم لوگوں نے ٹیلہ جوگیاں دیکھا ہے؟" سب نے نفی میں گردنیں ہلا دیں۔ حیرت ہے کہ یہ نوجوان ایسی زیارت گاہوں پر نہیں جاتے۔ میں نے

پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے وہاں رانجھا نے جوگ لیا تھا۔ کہنے لگے کہ ہاں صاحب معلوم ہے، بلکہ یہ بھی سنا ہے کہ کانوں میں بالے ڈالنے کے لئے جب رانجھا کے کان چھیدے گئے تھے تو اُن سے ٹپکنے والے خون کے قطروں کے نشان ابھی تک پتھروں پر موجود ہیں۔

میں نے کہا" واقعی؟ کیا کسی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

انہوں نے پھر گردنیں ہلا دیں۔ شاید ابھی تک وہ رانجھا کی محبت پر ایمان نہیں لائے ہیں۔

شیر شاہ کی اس یادگار کو دیکھنے کے بعد اب ہم آگے چلتے ہیں۔ ساڑھے چار میل بعد ہم جی ٹی روڈ پر نکلیں گے اور آندھی کی طرح دوڑنے والی بسوں اور ٹرکوں کے ہجوم میں شامل ہو جائیں گے۔ دونوں طرف الٹی ہوئی موٹر گاڑیوں کے ڈھانچے دیکھتے ہوئے ہم ادھر چلیں گے جدھر ایک اور تاریخی شہر جہلم ہے۔

یہ وہ دن ہیں جب کراچی کی سڑکوں پر آئے دن راہ گیر کچلے جا رہے تھے اور مشتعل مجمع تیز رفتار بسوں کو آگ لگا رہا تھا۔ اُس روز ہمارے ڈرائیور، خوش شکل، خوش لباس، ہونہار اور نوجوان محمد رفیع تھے۔ میں نے رفیع سے پوچھا کہ آپ کتنے عرصے سے موٹر گاڑیاں چلا رہے ہیں؟۔

"مجھے گاڑی چلاتے ہوئے تقریباً دس سال ہو گئے ہیں"

میں نے پوچھا" جی ٹی روڈ پر آپ کو ویگن چلانے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"جی میں پنڈی سے لاہور ویگن چلاتا رہا ہوں اور ڈیڑھ ایک سال فلائنگ کوچ بھی چلائی ہے"

میں نے کہا" ویگن اور فلائنگ کوچ چلانے والے ڈرائیور بہت بدنام ہیں، آپ بھی کیا اُسی قسم کے ڈرائیور تھے؟"

رفیع نے کہا" جناب عالی گزارش یہ ہے کہ ڈرائیور کوئی نہیں چاہتا کہ میں سواریوں کو بھی اور اپنے آپ کو بھی موت کے منہ میں لے جاؤں۔ ہمیں مالکان کی طرف سے مجبور کیا جاتا ہے۔ ہمیں ایک مخصوص ٹائم دیا جاتا ہے جس میں ہمیں پہنچنا پڑتا ہے، پنڈی سے لاہور یا لاہور سے پنڈی۔ اور وہ اگر دیکھا جائے تو ساڑھے چار گھنٹے ہیں اور جو بہت کم ہیں۔ کم سے کم یہاں چھ گھنٹے کا ٹائم ہونا چاہیئے تاکہ ہم آدھا گھنٹہ رک کے چل سکیں اور مالک ہمیں اس بات پہ مجبور نہ کریں کہ ہم تیز گاڑی چلائیں۔"

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک تیز رفتار بس ہارن دیتی اور زناٹے بھرتی ہوئی سب کو پھلانگ کر آگے نکل گئی۔ میں نے محمد رفیع سے کہا کہ اس ڈرائیور نے بڑا خطرہ مول لیا ہے کیونکہ دوسری طرف گہری کھائی ہے اور خدانخواستہ یہ بس الٹ جائے تو بڑا نقصان ہو۔ آخر اس ڈرائیور کو کیا مجبوری ہے؟۔

دوسرا اس کو مجبوری یہ ہے کہ اس کے پیچھے کوئی گاڑی لگی ہوگی، ایک میل یا دو میل کے فاصلے پہ۔ اگر یہ آہستہ چلے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسی کی کمپنی کی گاڑی ہو جو اوورٹیک کر جائے اور آگے سے سواریاں اٹھالے، اور یہ کیش کم دے اور دوسری گاڑی والا زیادہ دے تو اس کو ایک دو دفعہ دیکھ کر اس کے بعد نکال دیں گے یہ بے روزگار ہو جائے گا اور بے روزگاری آپ کو پتہ ہے پاکستان میں بہت زیادہ ہے اس لئے مجبور ہوتے ہیں یہ ڈرائیور کہ دوسری گاڑی کو نکلنے نہ دیں، بلکہ خود پہلے جا کر سواری اٹھالیں۔"

یہ بات ہو رہی تھی کہ مجھے کراچی کے ایک روزنامے کی سرخی یاد آئی۔ میں نے محمد رفیع سے کہا کہ کراچی کے بس ڈرائیوروں کی انجمن کے صدر نے یہ کہا ہے کہ راہ گیروں کو بسوں کے ڈرائیور نہیں مارتے، سب اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

میرا سوال سن کر رفیع مسکراتے اور بولے : یہ تو بالکل غلط ہے ۔ اس طرح تو میں ٹرک کے بیچ میں لیٹ جاؤں اور کہوں کہ میرے اوپر سے ٹرک گزرے گا اور میری اگر موت آئی تو وہ اللہ میاں دیں گے ۔ یہ تو بالکل غلط بات ہے ۔ ڈرائیور کا بھی قصور ہے کہ رش چلتے ہیں ، بعض دفعہ نشہ کر کے بھی چلتے ہیں ڈرائیور صاحبان ہمارے ۔ تو یہ غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ مارتا ہے ۔ اس میں ہمارا بھی قصور ہے ۔"

اس پر مجھے وہ شعر یاد آگیا اور دیر تک یاد آتا رہا کہ

کہا اُس شوخ سے مرتا ہے مومنؔ
کہا ، میں کیا کروں ، مرضی خدا کی

جب پیسہ آیا

رمضان کا مہینہ تھا۔ قیامت کی گرمی تھی۔ بس کے سارے ہی مسافروں کے ہونٹ خشک تھے اور تپش سے ان کے چہرے تونسے ہوتے تھے۔ اچانک اُن کی آنکھیں یوں چمک اُٹھیں جیسے ریگستان کے پیاسے مسافر کو نخلستان نظر آجاتے۔ سامنے جہلم کا بس اسٹینڈ تھا اور وہیں بہت بڑا ہوٹل جس پر لکھا تھا: "یہاں صرف مسافروں اور بیماروں کو کھانا دیا جاتا ہے" اندر جاکر دیکھا تو یقین آگیا کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے اور اس میں ہم سب مسافر ہیں۔

پشاور سے گوجر خان تک سارے طعام خانے بند تھے۔ یہ جہلم والوں کے جی میں کیا آئی جو مسافروں اور بیماروں کا انہیں اتنا خیال رہا؟

شہر کے ایک باشندے سے میں نے یہی سوال کیا تو جواب ملا: "یہ اللہ رسول کا حکم ہے۔ مسافروں اور مریضوں پر روزہ واجب نہیں۔ جہلم والے اسی حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔"

'حکم کی تعمیل' - یہ تین لفظ میرے ذہن میں گڑ گئے۔ جیسے افراد کا کردار ہوتا ہے، قوموں کا کردار ہوتا ہے، شاید ویسے ہی علاقوں کا کردار بھی ہوتا ہے۔ حکم کی تعمیل کا یہی کردار تو نہیں کہ ملک کے بہترین فوجی اسی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں؟

جہلم عجیب و غریب علاقہ ہے ۔ پہلے یہ جوگیوں کا علاقہ تھا، اب یہ فوجیوں کا علاقہ ہے ۔ شاید قناعت اور اطاعت کی پُرانی رسم تھی جو نہیں بدلی ۔ اس علاقے سے فوجی بھرتی کرنے کی روایت جو شیر شاہ کے وقت میں بھی تھی، آج بھی برقرار ہے ۔ کھیوڑے کی کانوں کا نمک شاید ختم ہو جائے مگر اس سرزمین کی یہ دوسری پیداوار چھاؤنیوں اور بیرکوں کو بھرتی رہے گی ۔

جہلم شہر تاریخی شہر نہیں ۔ یہ تو دریا کے اِس کنارے پر بھی نہیں ، دوسرے کنارے پر آباد تھا جہاں کچھ ملاح رہا کرتے تھے ۔ پھر شاید بایاں کنارہ سوکھ گیا تو یہ لوگ اپنا شہر اٹھا کر دائیں کنارے پر لے آئے ۔ جب انگریزوں نے یہ شہر سکھوں سے چھینا، اُس وقت جہلم میں صرف پانچ سو مکان تھے ۔ یہ ضلع کا صدر مقام تک نہ تھا ۔ لیکن انگریزوں نے فوراً ہی اس علاقے کی اہمیت کو سمجھ لیا ۔ انہیں تو اپنے لئے فوجیوں کی ضرورت تھی جن کی فصل یہاں تیار کھڑی تھی ۔

پھر یہ ضلع کا صدر مقام بنا ، یہاں چھاؤنی بنی ، میونسپلٹی بنی ، ریلوے لائن یہاں تک لائی گئی ، جرنیلی سڑک یہاں سے گزاری گئی ۔ وادیٔ کشمیر کی عمارتی لکڑی دریا میں بہا کر یہاں لائی جانے لگی ۔ جہلم میں تختے چیرنے کی مشینیں لگ گئیں ۔ کشتیاں بننے لگیں ۔ دریا کے ساتھ ساتھ خوبصورت عمارتیں بلند ہونے لگیں ۔ شہر کے اندر سڑکیں بنیں ، پختہ گلیاں بنیں ، پکی نالیاں بنیں ، گرجے ، اسپتال اور مشن اسکول بنے اور دور دور سے آکر لوگ جہلم میں آباد ہونے لگے ۔

لیکن اگر شہروں کو بھی نظر لگتی ہے تو پھر کسی کی نظر لگی ۔ اگر شہر بھی ٹھٹھر کر ، سہم کر رہ جاتے ہیں تو ہوا یہ کہ جہلم ٹھٹھر کر ، سہم کر رہ گیا ۔

یہ ساری باتیں تو نئی پرانی کتابیں کہتی ہیں ۔ خود جہلم والے کیا کہتے ہیں ؟ وہ اپنے معاملوں کو کس طرح دیکھتے ہیں ؟ ان کی اپنی رائے کیا ہے ؟ ہم سنتے آئے ہیں کہ انگریزوں

نے اس علاقے کے باشندوں کو اُن پڑھ رکھا تاکہ وہ فوج میں جانے کے علاوہ کوئی کام نہ کر سکیں۔ مگر اب وقت بدل چکا ہے۔ اب جہلم میں تعلیم کا کیا حال ہے؟ اسی شہر میں پل کر بڑے ہونے والے صدیق قریشی صاحب نے میرے سوال کا جواب یوں دیا:

"مجھے یاد ہے کہ جب میں پڑھا کرتا تھا، پرائمری اسکول شہر میں ایک ہی ہوا کرتا تھا، سول لائنز میں۔ تو آج تقریباً ہر محلے میں اسکول ہیں اور انگلش میڈیم کے بھی ہیں، دوسرے اردو میڈیم کے بھی ہیں۔ یہاں دو کالج ہیں، ایک لڑکیوں کا کالج علیحدہ ہے اور ایک کمرشل انسٹی ٹیوٹ ہے۔ تو زندگی کے جو مختلف تعلیمی اعتبار سے ہم پہلو لے سکتے ہیں ان میں یہاں خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے۔"

گورنمنٹ کالج جہلم کے پرنسپل محمد انور صاحب نے بتایا کہ وہ اٹھارہ سال سے اس شہر میں ہیں۔ ان کے کالج میں صرف تین سو طالب علم ہوا کرتے تھے لیکن اب بارہ سو ہیں۔ تو کیا ترقی کے ساتھ ساتھ اور تبدیلی کے بعد ذہن میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ شہر کے ایڈووکیٹ منظور الحق ڈار صاحب نے اس کا جواب یُوں دیا:

"یہ جو جہلم کے بارے میں ایک خیال ہے کہ یہ پسماندہ ہے، دراصل یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ماضی کی بات ہے۔ پسماندہ تھا۔ مگر اب اس میں کافی ترقی کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں لیکن جو اس کا کیریکٹر ہے۔ فوجی کیریکٹر۔ اُس کے آثار ابھی تک کافی گہرے ہیں، اس کے نقوش گہرے ہیں۔ وہ جو اُن کی معاشی پسماندگی تھی اس کی وجہ سے وہ مجبور تھے کہ فوج میں بھرتی ہوں۔ انگریز انہیں چاہے جہاں لڑاتے وہ بیشک ترکوں کے خلاف لڑاتے، چاہے مسلمانوں کے خلاف لڑاتے لیکن وہ لڑتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اس طرح تاریخ پر ان کے بارے میں جو تاثر مرتب ہوتا ہے وہ خود ان لوگوں پر واضح

نہیں۔ وہ یہ تو محسوس کرتے ہیں اور اس بات پر فخر بھی کرتے ہیں کہ یہ ہمارا بازوئے شمشیر زن ہے لیکن وہ شمشیر زنی جس کی خاطر ہوتی، وہ مقصد کوئی اتنا مقدس نہیں تھا۔"

یقیناً نہیں تھا۔ لیکن آزادی کے بعد جہلم کی کہانی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ بہتر روزگار اور زیادہ پیسے کی تلاش میں یہاں سے لوگ انگلستان جانے لگے۔ اس کے بعد تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے دروازے کھلے اور سیلاب کا رخ اُدھر ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے جہلم کے معاشرے میں ایسی تبدیلی آنے لگی کہ نوجوانوں نے فوج میں اور کمسنوں نے اسکولوں میں جانا چھوڑ دیا۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا مگر گورنمنٹ کالج جہلم کے انگریزی کے استاد محمد آزاد بخت کیانی صاحب نے یہ ساری کہانی کہہ سنائی:۔

"جہلم کا علاقہ چونکہ بنیادی طور پر فوجی علاقہ ہے، بارانی علاقہ ہے، یہاں آمدنی کے اور ذرائع بہت کم ہیں اس لئے یہاں سے کافی تعداد میں لوگ باہر گئے۔ اور اس سے ملک کو قیمتی زرمبادلہ ملا، لوگوں کا معیار زندگی بھی بڑھا، ان کی معاشی حالت بھی بہتر ہوئی۔ یہ تو اس کے مثبت پہلو ہیں لیکن ایک دم پیسہ آجانے سے معاشرے میں کچھ منفی پہلو بھی نمودار ہوئے۔ چونکہ یہاں تعلیم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی روزگار حاصل کیا جائے اور فوج میں بھرتی کے لئے بھی اب تعلیم ضروری تھی کیونکہ لوگوں کو میٹرک یا ایف اے ضرور کرنا پڑتا تھا۔ لیکن درمیان میں ایک ایسا وقت آیا کہ چونکہ باہر لوگوں کو زیادہ پیسہ ملتا تھا اور ملک کے اندر نوکری کرنے کے معاملے میں باہر زیادہ آمدنی تھی اس لئے لوگوں نے تعلیم کی طرف توجہ کم کر دی۔ میرے اپنے کالج میں اُن دنوں میں طالب علموں کی تعداد کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ کمیشن کی طرف بھی لوگوں کی توجہ کم ہو گئی حالانکہ کمیشن کے لئے یہ علاقہ مشہور تھا۔ میرا اس میں تجزیہ یہ ہے کہ لوگوں کے پاس پیسہ تو آگیا لیکن تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کا ذہن اتنی ترقی نہ کر سکا اور یہ معاشی ترقی اور ذہنی پسماندگی میں تفاوت

کی وجہ سے یہاں مسائل پیدا ہوتے۔ لوگوں نے پیسے ہی کو مدعا بنا لیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ معاشرے میں ترقی کے لئے یا عزت کے لئے پیسہ ہی کافی ہے۔ اور اس سے مقامی طور پر یہاں ورکرز کی کمی ہوئی۔ یہاں تک کہ پرائمری ٹیچرز کی آج تک کمی ہے۔ لوگ اس طرف نہیں جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حکومت کو غیر تربیت یافتہ لوگ رکھنے پڑے، اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ لوگ ہر وقت غیر ملکی ویزے کی تلاش میں پھرتے تھے اور اس سے ہم نے پیسہ ضرور کمایا ہے، زرمبادلہ ضرور ملا ہے لیکن وہ غیر ترقیاتی کاموں پر زیادہ خرچ ہوا ہے اس لئے طویل میعاد کے لئے اُس سے جہلم والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ جہلم میں بڑے پیمانے پر صنعتیں وغیرہ نہیں لگ سکیں۔ تو اس لحاظ سے پیسہ ایک طرف تو ہمارے لئے رحمت ثابت ہوا لیکن دوسری طرف زحمت بھی ثابت ہوا۔"

مگر سوال یہ تھا کہ علاقے کے باشندوں کی مالی حالت بہتر ہوئی تو انہوں نے اپنی ترقی کا بندوبست خود کیوں نہیں کیا؟ اسکول اور شفاخانے خود کیوں نہیں کھولے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ وہی قناعت اور اطاعت کا علاقائی کردار ان کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا؟ - آزاد بخت کیانی صاحب نے کچھ یہی بات کچھ یوں کہی:

"لوگوں میں حکومت کو مائی باپ سمجھنے کا تاثر تھا۔ وہ سمجھتے کہ سماجی کاموں میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ کارروائی کرے۔"

میں نے پوچھا کہ کیا ایسا ہوا کہ لوگوں نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے اپنے علاقوں میں بجلی تو لگوالی لیکن اسکول نہیں کھولا؟ - کیانی صاحب نے جواب دیا۔ اکا دکا جگہوں میں، مثلاً ایک گاؤں ہے بدروٹ، وہاں لوگوں نے اپنے خرچ سے بجلی لگوائی لیکن وہاں جب مسئلہ اسکول کے قیام کا اٹھا تو انہوں نے کہا کہ یہ کام تو حکومت ہی کرے

گی۔ ہم بجلی کے لئے ڈیڑھ لاکھ خرچ کر سکتے ہیں لیکن اسکول کے قیام کا خرچ حکومت ہی کو برداشت کرنا ہوگا۔"

یہ تھے آزاد بخت کیانی صاحب۔ لوگوں کے اس سارے لب و لہجے میں شکایت تو تھی، احتجاج نہ تھا۔ صرف ایک گوشے سے میں نے صدائے احتجاج سنی۔ معذوروں، اپاہجوں اور ضرورت مندوں کے دکھوں میں ہاتھ بٹانے والے ایک ادارے "المرکز" کے سرگرم رکن صغیر احمد اخلاق صاحب نے جہلم کی پسماندگی کے صرف ایک پہلو کی بات کرکے گویا پوری بات کہہ دی:

"یہاں کے لوگ باہر جاتے ہیں لہٰذا زرمبادلہ بہت ملتا ہے، محصول بہت ہے نمک کی کانیں ہیں، کوئلے کی کانیں ہیں، سگریٹ فیکٹری ہے، ان سے حکومت کو کروڑوں روپیہ ملتا ہے، اس کے باوجود سوئی گیس یہاں آج تک فراہم نہیں کی گئی جس کی کمی بہت شدت سے محسوس کی جاتی ہے جہلم کے گرد و نواح سے سوئی گیس گزر گئی ہے لیکن یہاں وہ نہیں ہے۔"

یہاں بہت کچھ نہیں ہے۔ بہت کچھ ہونا تھا مگر نہیں ہوا ہے۔ یہی بات جہلم کے ایک بہت پرانے اور دردمند گھرانے کے مشتاق حسین قریشی صاحب نے کہی جو ۳۵ سال تک فوج میں سویلین ملازمت کر چکے ہیں اور اب صحافی ہیں۔ جہلم کو خوب جانتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں سے، یہاں کے معاشرے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی کے کرداروں کی طرح خدا شہروں کے دن بھی پھیرتا ہے، اور کبھی کبھی یہ کہ نہیں پھیرتا ہے۔ شہر صرف مکانوں اور گلیوں سے نہیں بنا کرتے۔ ہر اک مکان کو اُس کے مکین سے شرف ہوتا ہے۔ زوال صرف دروازوں اور دیواروں پر ہی نہیں آتا، انسانوں پر بھی آتا ہے۔ اُن کی سوچ اور ان کی فکر پر بھی آتا ہے۔ اس دریا کے کنارے صرف سکندر کے ہاتھوں پورس ہی کی نہیں بلکہ وقت کے ہاتھوں معاشرے کی تقدیر بھی بدلی ہے۔

مشتاق حسین قریشی صاحب نے کہا" جہلم شہر میں کافی ترقی ہوئی ہے لیکن ایک چیز جو میں بتلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہلم کے ایک تاریخی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی جو ترقی ہونی چاہیئے تھی اس کو خراب کیا گیا ہے وہ ہوئی ہی نہیں۔ جیسے کہ آپ دریا کا کنارہ لے لیں، ہندوؤں کے زمانے میں اس کنارے پر بہت رونق ہوا کرتی تھی۔ یہاں پر بہت اچھے گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ وہاں لوگ آزادی سے آکر نہاتے تھے، مستورات آکر کپڑے دھوتی تھیں۔ شام کو بہت اچھا سماں ہوتا تھا۔ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کیا گیا، اور آجکل کسی نے اُس طرف دھیان نہیں دیا۔ وہاں پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ جہلم شہر میں ایک سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ جہلم شہر کا ایک کمپنی باغ ہوا کرتا تھا جو بہت لوگوں کے لئے سیر و تفریح کا مقام تھا۔ اب اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہاں افسروں کی کوٹھیاں بن گئی ہیں۔ اور وہ باغ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے۔ یہاں کے لوگ اب پرانے وقتوں کی نسبت بہت مالدار ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس شہر میں کروڑ پتی بھی موجود ہیں لیکن ان کے ذہن میں یہ کبھی نہیں آیا کہ رفاہِ عام کے لئے کچھ ایسا کام کر دیں جو ہندوؤں کے وقت میں ہوتا تھا۔ وہ لوگ درخت لگواتے تھے، کنویں بنواتے تھے، یہاں ہندوؤں نے قبرستان کی جگہ بھی دی ہے۔ وہ تعلیمی ادارے بنواتے تھے۔ مگر یہ آج کے لوگ نہیں کرتے"

قریشی صاحب کی اس بات پر میں نے کہا کہ سنا ہے آپ کے شہر کی یہ حالت تھی کہ رمضان کے دنوں میں لوگ روزے داروں کو شربت پلانے کے لئے کنوؤں میں شکر ڈال دیتے تھے؟۔ انہوں نے جواب دیا" جی۔ یہ مثالیں موجود ہیں۔ اس وقت بہت کم آبادی تھی تو محلوں میں بڑے بڑے گھڑے بنوا کر اور ان میں دودھ اور شکر ڈال کر رکھ دیئے جاتے تھے۔ اس وقت برف لاہور سے منگوائی جاتی تھی، جہلم میں نہیں ملا کرتی تھی۔ تو وہ لوگوں کو بانٹی جاتی تھی۔ تو اب وہ رجحان کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ وہ چیز نہیں رہی

وہ خلوص اور باتیں نہیں رہیں۔ اب جو لوگ ہیں وہ یہی چاہتے ہیں کہ میں ایک رات میں امیر بن جاؤں اور کسی دوسرے کے فائدے کے لئے کچھ نہ کروں۔"

پھُلاں ورگیاں دیّاں

دریائے اٹک پار کر کے، ٹیکسلا سے گزر کر، قلعہ رہتاس کے ٹیلے کی پتھریلی سڑک پر چلتا ہوا میں دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو گزرے ہوئے ہزاروں برسوں کے منظر بھی میرے ساتھ ساتھ پہنچے۔ دریائے جہلم کے ان ہی کناروں پر چیلیانوالا میں انگریزوں نے سکھوں کی کمر توڑی۔ یہیں مغلوں نے ہندوستان جانے کے لئے جنگیں لڑیں، شیر شاہ نے معرکہ آرائی کی، محمود غزنوی نے لڑائی کی اور جہلم کے یہی ساحل تھے جہاں مجھ سے سوا دو ہزار سال پہلے سکندر اعظم پہنچا تھا اور جہاں ایک ہندوستانی راجا نے آزادی کو بیرونی تسلط سے بچانے کی پہلی جنگ کی تھی۔

اسی دریا کے کنارے سکندر کے گھوڑے نے دم توڑا تھا اور اسی کے کنارے اپنے گھوڑے کی یادگار کے طور پر سکندر نے کوئی شہر بسایا تھا۔ کہتے ہیں کہ جلد ہی گھوڑے کی قبر اور اُس کا شہر سیلاب کی موجوں میں سوکھے تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ مورخوں نے بہت تلاش کیا مگر وہ مقام کسی کو نہ ملا۔

لیکن میں تلاش کے معاملے میں خوش نصیب نکلا۔ مجھے قدیم کھنڈروں کی نہیں قدیم لوگوں کی تلاش تھی۔ کسی نے کہا تھا کہ جہلم جا رہے ہو تو ضعیف شاعر جوگی جہلمی سے ضرور ملنا۔ وہ پرانے وقتوں کی آخری نشانی ہیں۔ ایسے لوگ پھر نہیں ملیں گے۔ شہر والوں سے

پوچھا تو معلوم ہوا کہ اندر کہیں پرپیچ اور تنگ گلیوں میں رہتے ہیں۔ ایک نوجوان نے اپنی موٹر سائیکل پر مجھے وہاں پہنچانے کی پیش کش کی۔ میں حیران تھا کہ نئے زمانے کی موٹر سائیکل پرانی گلیوں میں کیسے جائے گی۔ مگر میں اس سے بھی زیادہ حیران ہوا یہ دیکھ کر کہ قدیم جہلم کی ساری گلیاں پختہ تھیں۔ قرینے سے جمی ہوئی اینٹیں، سلیقے سے بنی ہوئی نالیاں۔ اِس شہر کو جس نے بھی بسایا، بڑے چاؤ سے بسایا ہوگا۔

اینٹ بھر اونچی دہلیز۔ پرانے تختوں کا دروازہ اور اس میں جھولتی ہوئی کنڈی۔ اندر وہی پرانے مکانوں جیسا دالان، ویسے ہی برآمدے جن میں ویسے ہی تنگ اور تاریک کمرے اور ذرا الگ وہ بیٹھک جس کے اندر سب کچھ قدیم تھا البتہ نئے زمانے کو اپنا قدم رکھنے کی جگہ مل گئی تھی جس کے بعد جلد ہی خود زمانہ بھی اندر چلا آئے گا۔

———— اور وہ تھا ٹیلیویژن!

جہلم کا علاقہ یوں بھی جوگیوں کا علاقہ رہا ہے چنانچہ جوگی جہلمی ایک لمحے کو بھی یوں نہیں لگے جیسے کسی اجنبی سرزمین سے آکر آباد ہوئے ہوں۔ ان کا سارا وجود اسی دریا کے کنارے، اسی کے ٹھنڈے پانی سے سیراب ہوا ہوگا کہ پانی کی یہ ساری خوبیاں اُن میں سرایت کر گئی تھیں۔ اُن کی بوڑھی آنکھوں نے سکندر اور پورس کو نہ سہی، کتنی ہی یورشوں اور کتنی ہی پسپائیوں کو دیکھا ہوگا میری فرمائش پر اُس شام وہ اپنی ایک پنجابی نظم سنا رہے تھے۔ چونکہ تذکرہ اُس انجام کا تھا جو میرا تمہارا سب کا مقدر ہے اس لئے ہر مصرعہ صاف سمجھ میں آرہا تھا

پھُلاں ورگیاں ایتھے دیّاں نہ رہیاں
یہاں وہ جو پھولوں جیسے چہرے تھے وہ نہ رہے
آسمانوں میں وہ امیدوں کے تارے نہ رہے
وہ جھلمل کرتے ستارے ایک ایک کر کے بجھ گئے
آنکھیں جن منظروں سے آشنا تھیں وہ کھوتے گئے

چناب کے پرانے کنارے تک جہاں تھے وہاں نہ ہے
وہ رانجھا، وہ ہیر اور مہیوال، کوئی نہ رہا

گاؤں کے وہ کچے کوٹھے،
دور دور تک وہ ایک سی دیواریں، دور دور تک وہ ایک سے دروازے
جہاں جٹیاں سویرے سویرے اٹھ کر
دودھ بلویا کرتی تھیں اور چکی پیسا کرتی تھیں
بچوں کے وہ کھلونے، گڑیوں کے وہ گھر
کچھ نہ رہا

سروں پر چمکتے دمکتے تاج سجائے
لاکھوں شہنشاہ راج کرتے تھے
مگر جب موت آئی تو کوئی حیلہ کوئی بہانہ کام نہ آیا
کیا بادشاہ، کیا فقیر، سب زمین تلے سو رہے
رضائیاں، دلائیاں، وہ سب آرام کے سامان
کچھ بھی تو باقی نہ رہا۔

نظم کے آخری الفاظ ایک ہنسی میں لپٹے تھے۔ اس ہنسی میں معنی کا ایک اور جہان چھپا تھا۔ جوگی جہلمی صاحب نے مجھے دعائیں دے کر رخصت کیا۔ میں خالی ہاتھ گیا تھا، جھولی بھر کر لوٹا۔

سچا شعر آسمانوں سے اترتا ہے، مگر ہر ایک پر نہیں، صرف حساس دلوں پر اترتا ہے۔ جہلم والے اپنے علاقے کو سنگلاخ کہتے ہیں مگر شاید وہ خود بھی نہیں جانتے کہ دردمند دلوں

کا علاقہ یہیں سے لگتا ہے۔

امداد ہمدانی، مشین محلہ نمبر دو کے ایک پرانے مکان میں رہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھوں نے اس شہر میں شعر و ادب کی جو عمارت بنائی ہے وہ بالکل نئی ہے۔ یہ بھی ہوا ہے کہ ان کے چھوٹے سے چائے خانے میں ادب کی بڑی بڑی محفلیں سجی ہیں مگر یوں بھی ہوا ہے کہ ان کے دل کے نہاں خانے میں مایوسیاں اپنی بزم سجا بیٹھیں۔ جرنیلی سڑک کے شہر جہلم میں نثر اور نظم کا کیا حال ہوا؟ میں نے امداد ہمدانی سے یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا:

"میں نے ۱۹۵۰ء میں جہلم میں ادبی انجمنوں کی بنیاد رکھی۔ بزم داغ، شاخِ ادب، حلقۂ اربابِ غالب، بزمِ تخلیق۔ اور ایسا ہی ہے کہ جیسا لاہور میں پاک ٹی ہاؤس ہے، جہلم میں ہمدانی ٹی ہاؤس کے نام سے مشہور ہے جہاں پہ نئے لکھنے والے، پرانے استاد قسم کے لوگ اور شعرا بھی یہاں آتے رہتے ہیں اور ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اور میں یہ فخر سے کہتا ہوں کہ جہلم کی سنگلاخ زمین میں مَیں نے شعر اُگائے ہیں۔ اور میں کبھی کبھار یہ سوچتا ہوں کہ ادب کے لئے میں نے جو محنت کی اور خدمت کی، اُس کا مجھے آج تک ثمر نہیں ملا۔"

ہر شاعر کی طرح امداد ہمدانی کی بھی یہی تمنا تھی کہ ان کے اردو اور پنجابی اشعار کا ایک ایک مجموعہ چھپ جائے۔ مگر بدقسمتی سے کتابیں شائع کرانے کے لئے درد کی دولت کسی کام نہیں آتی۔ امداد ہمدانی کے دوست بہت تھے لیکن جب جہلم کے علاقے سے لوگوں کے غول کے غول اٹھے اور جس دولت سے کتابیں چھپ سکتی ہیں اور اس کی تلاش میں سمندر پار چلے گئے تو امداد بے امداد رہ گئے۔ جہلم کے بہت سے اچھے لوگ پانی کے دریا کا کنارہ چھوڑ کر تیل کے کنوؤں کے کنارے جا بسے ہیں۔ جو لوگ رہ گئے ہیں انہیں اُن کی تنہائی سے زیادہ محرومی کے احساس نے مارا ہے، مگر اس بات کو وہ اس طرح نہیں، کسی دوسری طرح کہتے ہیں۔ امداد ہمدانی نے کہا:

"اچھے لوگوں کا قحط پڑ گیا ہے ۔ ریاکاری، جھوٹ اور منافقت کا بڑا زور ہے، اور اس سے میں بڑی نفرت کرتا ہوں کیونکہ میں نے ساری زندگی بڑے خلوص نیت سے، پیار اور محبت سے گزاری ہے لیکن اب یہ چاہتا ہوں کہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کروں اور شاعری کرتا رہوں اور پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ گاہے بہ گاہے کسی انجمن میں جاؤں، شعر پڑھوں، شعر سناؤں لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ اب جی نہیں چاہتا۔"

یہ ایک شاعر کی بات نہیں، ایک شہر کی بات ہے۔ یاس گھروں میں نہیں آتی شہروں پر اترا کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جس دن اسکول یا کالج کے امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوتا ہے اس روز دریائے جہلم کے پل پر پولیس کا پہرا لگانا پڑتا ہے تاکہ مایوس نوجوانوں کو دریا میں چھلانگ لگانے سے روکا جائے۔ مگر اب اس کا کیا علاج ہے کہ عشق کے امتحان کے نتیجے کا نہ کوئی دن مقرر ہو سکتا ہے نہ اُس روز پل پر چوکی کھڑی ہو سکتی ہے۔

لیکن کیا یہ بات سچ ہے کہ دنیا منافقت اور ریاکاری سے بھر گئی ہے اور نیکی اُٹھ گئی ہے؟ اسی شہر جہلم نے مجھے میرے سوال کا جواب دے دیا۔ ٹاؤن ہال روڈ کے کنارے برطانوی راج کے دنوں کی ایک صاف ستھری، آراستہ عمارت پر بڑے بڑے حرفوں میں "المرکز" لکھا تھا۔

"یہ کس چیز کا مرکز ہے؟" میں نے کسی سے پوچھا۔

"یہ مدد کا، سہارے کا، دکھ بانٹنے کا، ہاتھ تھامنے کا مرکز ہے۔" مجھے جواب ملا۔

یہاں ایک صاحب تھے، ڈاکٹر حمید اللہ بیگ۔ اُن کے جی میں یہ آئی کہ یہ جو یتیم ہیں، بیوائیں ہیں، بے گھر، معذور اور اپاہج ہیں، کچھ ان کے لئے بھی کیا جائے۔

یوں ایک چراغ جلا۔ ان کے بعد ان کے دو بیٹوں، ڈاکٹر حقیق مرزا اور ڈاکٹر صدیق مرزا نے اس چراغ کی لَو اونچی کی۔ وہ لوگ جن کے دل نیکیوں سے معمور تھے وہ بھی

آن ملے اور بھلائی کی تنظیم المرکز کی بنیاد رکھی گئی۔

وہ دونوں بھائی بھی چل بسے مگر جاری رہنے والی نیکی جاری رہی۔ ان کے بچوں نے اور خصوصاً ڈاکٹر حقیق مرزا کی اہلیہ ڈاکٹر گلشن نے شہر کے دردمند تاجروں، وکیلوں، ڈاکٹروں، مدبروں اور دانش وروں کو اپنے ساتھ ملایا جس کے بعد المرکز پروان چڑھا اور اب یہ تنظیم ماؤں، بچوں، عورتوں، نوجوانوں اور ضرورت مندوں کے علاوہ معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یہاں تک کہ سیلاب، زلزلوں، بیماریوں اور جنگوں سے متاثر ہونے والوں کو سہارا دینے کی ایسی تحریک چلا رہی ہے کہ تاحدِ نگاہ چراغ ہی چراغ روشن نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا اس المرکز کی چیئرمین ہیں۔ جس وقت میں ان سے ملنے پہنچا، حکام کو علاقے کے مسئلوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے وہ لاہور روانہ ہونے والی تھیں۔ سامان کار میں رکھ دیا گیا تھا اور کاغذات فائلوں میں جما دیئے گئے تھے۔ ان کے گھر کے راستے میں گونگے اور بہرے بچوں کے اسکول کی وہ عمارت بھی پڑتی تھی جو قریب قریب مکمل تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اتنے سلیقے اور قرینے سے بنی ہوئی قلعہ رہتاس کے بعد اس علاقے میں کوئی اور عمارت نہیں دیکھی۔ لوگوں نے بتایا کہ عمارت کے ٹھیکے داروں، کاریگروں اور راج مزدوروں کو ڈاکٹر مرزا ہر روز یاد دلاتی تھیں کہ یہ عمارت کتنے اعلیٰ مقصد کے لئے بن رہی ہے۔ اور ان سے ہر روز التجا کرتی تھیں کہ اس کی ایک ایک اینٹ عمدگی سے جمائیں۔ چنانچہ شہر کے مضافات میں وہ سب سے شاندار عمارت بنی ہے۔

میں نے ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا سے پوچھا کہ جب آپ کو الیفائڈ ڈاکٹر ہیں اور اس دور میں جو ڈاکٹر کامیاب ہیں وہ دونوں ہاتھوں سے دولت کما رہے ہیں، آپ نے زندگی کو ضرورت مندوں کے لئے وقف کرنے کی کیوں ٹھانی؟ انہوں نے کہا:

"زندگی میں اگر پیسہ کمانا ہی سب کچھ ہوتا تو شائد زندگی کچھ اور ہی ہوتی۔

اصل میں بات یہ ہے کہ یہ زندگی ہمیں ایک امانت ملی ہے جس میں ہمیں کچھ اپنے لئے اور کچھ ارتقا کے لئے کرنا ہے اور اپنے ساتھ اللہ کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں جو کہ میں سمجھتی ہوں کہ عین عبادت ہے اور ہماری تعلیمات کا بہت ہی اہم پہلو ہے۔ اس لئے زندگی میں کچھ وقت اپنی ذات کے لئے، اپنے پروفیشن کے لئے، اپنی ذاتی ذمے داریوں کے علاوہ میں سمجھتی ہوں یہ میرا فرض ہے کہ انسانی بھلائی کے جتنے بھی کام کرسکوں اس میں وقت دوں اپنے تن من دھن سے جو کچھ بھی ان کے لئے کرسکوں۔"

میں نے ڈاکٹر مرزا سے پوچھا کہ یہ اتنے بڑے بڑے منصوبے اور اتنے بڑے بڑے کام، یہ سب تو مردوں کے کرنے کے ہیں۔ آپ خاتون ہیں، آپ کے لئے تو یہ سب کچھ بہت مشکل ہوتا ہوگا؟۔ انہوں نے کہا:

"میں سمجھتی ہوں کہ خاتون ہونا شاید اس کام کو آگے بڑھانے کا موجب بنتا ہے کہ جو ممتا کے جذبات اور خواتین کے اپنے گھر کے رشتوں میں جذبات ہوتے ہیں وہی معاشرے کے اُن افراد کے لئے پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہماری ضرورت ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کے لئے ان جذبات کا ہونا بہت ضروری ہے بلکہ مرد حضرات کے جذبات تو مشروط قسم کے ہوتے ہیں، تو یہ بالکل واضح بات ہے۔"

میں نے آخر میں ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا سے پوچھا کہ ضرورت مندوں کو سہارا دینے کے کام آپ ہی آپ تو نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے بے شمار وسائل، بے شمار پیسہ درکار ہوتا ہے۔ وہ آپ کہاں سے لاتی ہیں؟۔ انہوں نے کہا:

"وسائل کی کمی ہمارے بہت سے منصوبوں میں کبھی کبھی آڑے آتی ہے لیکن اللہ کا احسان ہے کہ ہمارے کارکنان اور ہمارے مہربان جو کہ سمجھتے ہیں اس

کام کے خلوص اور نیک نیتی کو، وہ سامنے آتے ہیں اور جہاں جتنے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح پورے ہوتے ہیں۔ یہ بس اللہ کا فضل ہی سمجھئے کہ جب مشکل پڑتی ہے اور سب لوگ مل کر اس کا حل سوچتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سے مخیر حضرات سامنے آتے ہیں، یہاں تک کہ کتنے ہی غریب غربا تک اپنا حصّہ ڈالنے سے گریز نہیں کرتے اور اس کو عین سعادت سمجھتے ہیں:"

یہ تھیں جہلم کی ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا۔ اور کیسی عجیب بات ہے کہ سینکڑوں میل آگے چل کر کانپور کے پڑاؤ میں بھی ایک ایسی ہی خاتون سے میری ملاقات ہوگی کہ ان سے مل کر بھی میں نے سوچا تھا کہ ابھی دنیا سے مایوس ہونے کا وقت نہیں آیا۔ دلوں کے چراغ بجھا کر یاس کی نیند سو رہنے کا لمحہ ابھی نہیں آیا۔ ان راستوں میں دیئے ابھی روشن ہیں۔ بس شہر شہر اور نگر نگر کوئی ایسا ہو جو ان کی لو اونچی کرتا رہے اور ان چراغوں سے اور چراغ جلاتا رہے۔

گجرات شاہ دولہ والا

"او تیرے سوہنے مدینے توں قربان میں
للہ مینوں مدینے بلا
سوہنیا وے، گھٹدے جاندے نیں ساہ
دم دا کیہہ اے وساہ
مرنے توں پہلے روضہ وِکھا
سوہنیا"

یہ شہر گجرات ہے جو کبھی 'گجرات شاہ دولہ والا' کہلاتا تھا، اور یہ شاہ دولہ کا مزار ہے، حضرت سید کبیر الدین شاہ دولہ دریائی گنج بخش کا مزار!

اندر اونچی سی قبر ہے جس کے گرد جالی لگی ہے۔ کچھ لوگ جالی پر ماتھا ٹیکے بیٹھے ہیں اور آنکھیں قبر کی چادر پر جمی ہیں۔ کچھ دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اور نڈھال ہیں۔ کچھ قرآن پر جھکے ہوئے ہیں اور جھوم رہے ہیں۔ پردے کے پیچھے عورتیں ہیں۔ اُن کی دبی دبی سی قرأت، پنکھوں کی آواز، باہر درختوں پر ان گنت چڑیوں کا شور، دالان میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کی صدائیں اور عین قبر کے سامنے درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے بابا برکت علی کے پرانے ہارمونیم کی پھٹی پرانی دھونکنی چلنے کے ساتھ ساتھ باجے کے سُر اور

خود برکت علی کی بوڑھی پڑتی ہوئی تانیں، یہ سب شاہ دولہ کی درگاہ کے ماحول میں گھل مل سے گئے ہیں۔

کبھی یہ مزار شہر گجرات سے باہر تھا۔ اب شہر کے بیچوں بیچ ہے۔ گجرات پہلے کبھی بڑا شہر نہیں رہا لیکن اب کھلیانوں، میدانوں، ٹیلوں اور نالوں کو پھلانگتا ہوا دور دور تک پھیل گیا ہے۔ خلقت اور رونق ہر طرف سے اس شہر میں چلی آئی ہے اور صنعت اور کاروبار کی ترقی نے اُس شہر گجرات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے جو اکبر بادشاہ نے آباد کیا تھا۔ اُس وقت شہر کا نام گجرات اکبر آباد تھا۔

اس سرزمین کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ خود علاقے کے لوگوں سے پوچھیے تو کہانیوں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ گجرات کے گاؤں بھڑ یہ شریف میں حضرت آدمؑ کے بیٹے کی قبر ہے جو ستر گز لمبی ہے۔ اُسے ہر سال ناپا جاتا ہے۔ کبھی وہ بڑھ جاتی ہے، کبھی گھٹ جاتی ہے۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ قبر حضرت نوحؑ کے کسی بیٹے کی ہے۔ ایک اور گاؤں شیخ چکانی میں حضرت یوسفؑ کے ایک بیٹے یا پوتے کی قبر بتائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں نہر اپر جہلم کی کھدائی شروع ہوئی تو کئی پنجر اور سر نکلے جو عام انسان کے سر سے کہیں بڑے تھے اور ان کے دانت ترچھے تھے۔ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ پبّی کی پہاڑیوں میں سے اکثر بڑی بڑی انسانوں کی ہڈیاں نکلتی ہیں۔ ایسے لمبے چوڑے لوگ بہت پرانے زمانے میں ہوتے ہوں گے۔ پبّی کی پہاڑیوں کے بارے میں تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ پہاڑیاں نہیں بلکہ تاریخی شہر پاٹی کوٹی کے کھنڈر ہیں۔ سکندر اعظم کو دریائے جہلم کے پار سے جس شہر کے خوبصورت اور اونچے محل نظر آئے تھے وہ یہی پاٹی کوٹی تھا۔

یہ سب وہ داستانیں ہیں جو ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوا کرتی ہیں اور تاریخ داں یہ کہہ کر انہیں رد کر دیتے ہیں کہ بہت سے سینوں میں کھوٹ بھرا ہوتا ہے۔

پاٹی کوٹی کی تباہی کے بعد ایک سورج بنسی راجا بچن پال نے ایک اور شہر بسایا:

اودے نگری ۔ ہریالیوں کا ، خوشبوؤں کا شہر ۔ وہ شہر بار بار اجڑا ، بار بار آباد ہوا اور آج جہلم اور چناب کے درمیان جرنیلی سڑک کے کنارے گجرات کے نام سے آباد ہے ۔

گجرات !

وہ انسانوں سے خرید و فروخت کرنے والوں سے ، سودے والوں اور پھیری والوں سے ، ٹھیلوں ، ریڑیوں ، سائیکلوں ، اسکوٹروں ، موٹر سائیکلوں اور کاروں سے بھرے ہوئے بازار جن میں دور ویہ مال اسباب سے بھری ہوئی دکانیں ۔ ان میں وہ دائیں بائیں جاتی ہوئی گلیاں ۔ اور گلیوں کے اندر اور گلیاں ، کہیں ٹیلوں پر چڑھتی ، کہیں پرانے نشیبوں میں اترتی ہوئی گلیاں ۔ مسجدیں ، مقبرے ، حکیموں کے مطب ، مستریوں کی ٹھوکا پیٹی ، لاؤڈ اسپیکروں پر اذانیں اور وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے تانگوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں ، اور ان تمام آوازوں کو روندتے ہوئے نئی قسم کے شور مچانے والے ہانگ کانگ ، گویا اور تائیوان کے بنے ہوئے جی کو دہلانے والے موٹر گاڑیوں کے ہارن ۔

یہ ہے آج کا گجرات جس میں غریب کمہار کی چاک نڈھال ہو کر ایک طرف کو جھک گئی ہے اور کوفت گروں کی بھٹیاں کبھی کی ٹھنڈی ہو چکی ہیں ۔

اُس روز زمیندار کالج میں سکون تھا ۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں ۔ لڑکے اپنے گھروں کو جا چکے تھے ۔ باغ کی روشوں پر سرخ اینٹوں کے فرش خالی پڑے تھے ۔ کالج کے استاد احمد حسین قلعہ داری صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ آج کے نئے گجرات کی بنیاد کیسے پڑی :

" ویسے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت پرانی آبادی ہے ، رام چندر کے زمانے سے ۔ لیکن اس کی موجودہ آبادی جو ہے یہ اکبر کے زمانے سے ہے ۔ روایت بیان کرتے ہیں کہ یہ گجرات میں جہاں اب قلعے کے آثار نظر آتے ہیں یہاں ایک اونچا سا ٹبہ تھا ، یہاں دو قومیں آباد تھیں ، گوجر اور جاٹ ! ان دونوں کی آپس میں لڑائی رہتی تھی ۔ اکبر بادشاہ کشمیر کی طرف جا رہا تھا ، اس نے لڑائی دیکھی اور

اس نے حکم دیا کہ یہاں قلعہ تعمیر کیا جائے، تو وہ قلعہ تعمیر ہوا، یہ ۹۹۶ھ کی بات ہے۔ اُس زمانے میں یہ گجرات آباد ہوا اور اس کی تاریخ کسی نے نکالی تھی۔

گجرات بسا یہ اکبر آباد ۔"

قریشی احمد حسین قلعہ داری کے بزرگ تمام عمر درس و تدریس میں مصروف رہے اور گاؤں قلعہ دار میں ان کی درس گاہ سے پورے برصغیر کے نوجوان فیض پاتے رہے۔ ان بزرگوں نے گجرات کی تاریخ کا وہ دور بھی دیکھا جس کے بعد پورے ہندوستان کی تقدیر بدل گئی۔ سنہ تھا اٹھارہ سو انچاس، مہینہ تھا فروری کا اور تاریخ تھی اکیس۔ اسی شہر گجرات میں وہ تاریخی جنگ لڑی گئی جس نے پنجاب پر سکھوں کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔ اس روز ٹُھگلی سے خیبر تک یہ ساری سرزمین سرکار انگلشیہ کی عملداری میں چلی گئی۔ وہ منظر احمد حسین صاحب کے بزرگوں نے ضرور دیکھا ہوگا۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ کے بزرگوں نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا؟

"وہ جنگوں میں حصہ تو نہیں لیا تھا کیونکہ اُن کا کام درس و تدریس تھا۔ البتہ یہ جو جنگ ہوئی انگریزوں کی چیلیانوالہ کے مقام پر، اُس وقت میرے دادا صاحب زندہ تھے۔ ان کی زبانی مجھے یہ روایت یاد ہے کہ فوجیں ہمارے گاؤں کے پاس سے گزر رہی تھیں اور ایک انگریز صاحب بہادر جوتوں سمیت مسجد کی گنبد پر چڑھ کر دوربین سے دیکھ کر کہنے لگا "ابھی سکھ بہت ہیں"۔ پھر انہوں نے بتایا کہ یہ جو سکھ قیدی تھے انہیں بارہ دری رنجیت سنگھ، گجرات میں رکھا گیا اور رات کو بہت بڑا طوفان آیا اور زرد رنگ کی بارش ہوئی۔ صبح سویرے چاروں طرف زردی ہی زردی پھیلی ہوئی تھی تو اس کی تاریخ کسی بزرگ نے نکالی تھی ــــ

به گجرات بارید باران زرد
عجب قدرت کردگار آمده

ان کے حروف ابجد جمع کیجئے تو ۱۲۷۰ نکلتا ہے جب بارش ہوئی تھی اور سکھوں کی لڑائی کا خاتمہ ہوا تھا۔"

دھیان ایک بار پھر شاہ دولہ کی درگاہ کی طرف لوٹتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے سروں والے، آنکھوں میں وحشت والے لوگ شاہ دولہ کے چوہے کہلاتے ہیں۔ والدین انہیں لاکر اسی مزار پر چھوڑ جایا کرتے تھے۔ مگر وہ عقیدہ شاید زائل ہوا۔ مجھے وہاں چھوٹے سر اور وحشی آنکھوں والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔

شاہ دولہ کے فیض اور ان کی برکت کا ذکر کرنے والے لوگ ایک بات کبھی نہیں بتاتے کہ ان بزرگ کے عقیدت مند جب کبھی حاضری دیتے، اور ان عقیدت مندوں میں اورنگ زیب کی ایک بیوی بھی تھی جو وہیں مزار کے قریب دفن ہے، اور وہ نذر کے طور پر رقم پیش کرتے، شاہ دولہ وہ رقم گجرات کے شہریوں کے لئے نیک کاموں پر خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے تازہ پانی کی وہ بڑی نالی بنوائی تھی جو اونچے پل کے اوپر بہا کرتی تھی۔ اسے نالہ شاہ دولہ کہتے تھے جو گڑھی شاہ دولہ سے شمال اور مشرق کی سمت جاتا تھا۔ تازہ پانی کا یہ آدھے میل لمبا نالہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ اُس کے در اور ستون انگریزوں کے زمانے تک موجود تھے۔ شاید اب بھی ہوں۔

انگریزوں کا زمانہ یہاں ۱۸۴۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ گجرات سے پہلے انہوں نے دریائے جہلم کے قریب اور سکندر اور پورس کے میدان جنگ کے پاس چیلیانوالہ میں سکھوں سے سخت مقابلہ کیا تھا۔ اُس روز لاشوں پر لاشیں گری تھیں۔ سکھ بے دریغ قتل کئے گئے تھے۔ اُس وقت اِس علاقہ کا نام ہی قتل گھر پڑ گیا تھا۔ لڑائی کے ڈیڑھ دو برس بعد ابنالے کے منشی امین چند چیلیانوالہ سے گزرے تھے تو اُس وقت بھی میدان میں ہر طرف ہڈیاں ہی

ہڈیاں بکھری تھیں۔ سکھ اپنے مردوں کو جلا بھی نہ سکے البتہ انگریزوں کی نہ صرف عمدہ قبریں بنائی گئیں بلکہ چیلیانوالہ کے میدان میں یادگار مینار بھی اٹھایا گیا۔

اسی طرح جو انگریز گجرات کے آخری معرکے میں کام آئے، جہانگیر کے عارضی مدفن کے باہر ایک احاطے میں اُن کی بھی شاندار قبریں بنائی گئیں۔ یہ جگہ شہر سے کوئی ڈیڑھ میل باہر ہے۔ میں وہاں جانا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ جو حاکم کسی سرزمین کو چھوڑ جاتے ہیں، ان کے جانے کے بعد ان کی یادگاروں کا کیا حال ہوتا ہے۔ گجرات میں میرے احباب وہاں جانے کی میری اس فرمائش سے لطف اندوز ہوتے۔

وہاں جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پنجاب کے ان ہرے بھرے علاقوں کے بیچوں بیچ کھڑی اُس مقبرے کی شاندار عمارت بھی دیکھوں جس کی قبر کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ علاقے کے لوگ کہتے ہیں کہ اس میں ایک ولی اللہ حضرت جہانگیر محو آرام ہیں چنانچہ منت مراد، عرس اور قوالی، ان سب کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دوسری ہی بات بتاتے ہیں۔ راہ میں گجرات کے ایک بزرگ، حکیم محمد عبدالرحیم صاحب سے ملاقات ہوئی میں نے اُن سے پوچھا کہ اس مزار میں کون دفن ہے؟ انہوں نے کہا:

"جی ہاں۔ مشہور ہے کہ وہ ایک بزرگ تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب جہانگیر شوپیاں کے مقام پر مرا تو وہاں سے لاکر اسکی میت یہاں دفن کی گئی۔ دس بارہ گاؤں وقف کیے گئے، مسجد بنی، مزار بنا۔ بعد میں جہانگیر کی لاش لاہور لے گئے مگر یہاں دو وقت کھانا مسافروں کو ملتا رہا۔ صبح شام سو ڈیڑھ سو آدمی کھانا کھاتے تھے۔ روزانہ منوں آٹا پکتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ سلسلہ جاری تھا مگر اب محکمہ اوقاف کچھ نہیں دیتا۔ فقیر اب بازاروں میں مانگ مانگ کر کام چلاتے ہیں"

شاہ دولہ کے مزار سے چل کر، کھیتوں کے درمیان اچھی اور پختہ سڑکوں پر سفر کرتا ہوا، باغوں سے گزرتا ہوا میں جہانگیر کے مزار پر پہنچا۔ اونچی چار دیواری کے اندر اور اونچی سفید عمارت

اور گنبد دور سے نظر آنے لگے۔ وہیں ایک احاطے کے اندر آٹھ دس قبریں تھیں جنہیں گلابی رنگت کے مسالے سے چُنا گیا تھا۔ کبھی اُن پر صلیبیں کھڑی ہوں گی اور فرشتوں کی شبیہیں رہی ہوں گی۔ برگِ سبز دائرہ کئے ہوں گے۔ مگر وہ سب اب بکھر رہے تھے۔ قبروں پر لکھے ہوئے کرنیلوں اور جرنیلوں کے نام تک مٹنے لگے تھے۔

میں اس دیہاتی علاقے کے کسی باشندے کی زبانی سننا چاہتا تھا کہ جہانگیر کے مقبرے میں کون دفن ہے۔ یہاں انگریز فوج کے یہ افسر کیسے مرے تھے اور اب ان کی قبروں کا یہ حال کیوں ہے؟۔ اچانک کہیں سے وہ شخص آنکلا جس کے پاس میرے سارے سوالوں کے جواب تھے۔ یہ تھے فضل حسین جو چالیس برس سے درگاہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ وہیں کھیتوں کے درمیان نیم پختہ سڑک کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ جہانگیر کی قبر کے، اور انگریز فوج کے افسروں کے وہ ایسے ایسے قصے سنا رہے تھے کہ ایک بار تاریخ نے گردن ڈال دی ہوگی۔ کہنے کو یہ ایک سادہ لوح دیہاتی کی باتیں ہیں مگر کچھ باتیں دھیان سے سننے کی بھی ہیں۔

شاہ دولہ کی درگاہ سے دور، برکت علی کے مدینے سے عشق کی تانوں سے پرے، گجرات کے لہلہاتے کھیتوں کے بیچ، صافے، لمبے کرتے اور تہ بند میں ملبوس گھنی مونچھوں والے فضل حسین سے میں نے پوچھا کہ اس سفید براق گنبد کے اندر کس کا مزار ہے:

"یہ حضرت شاہ جہانگیر صاحب، سیّد پاک کا مزار ہے۔"

میں نے پوچھا "اس احاطے کے باہر کچھ چھوٹی، کچھ بڑی انگریز فوجی افسروں کی قبریں ہیں، یہ کس زمانے کی ہیں، آپ کو معلوم ہے؟"

فضل حسین جھٹ بولے "یہ قبریں جو ہیں یہ ۱۸۴۹ء میں جب سکھوں اور انگریزوں کی جنگ ہوئی اور چیلیانوالہ کے بعد جب یہاں پر پہنچے تو ہمارے بزرگوں نے ہمیں بتایا کہ سکھ ہمارے گاؤں میں آگئے اور وہ بڑھئیوں کے گھر میں پہنچ گئے۔ انگریزوں نے کہا کہ ہم تھوڑی

والے کو مارے گا۔ سکھوں کے سر پر جوڑی ہوتی ہے۔ اُن لوگوں نے بال کٹوانے شروع کر دیئے۔ سکھوں نے کہا ہمارے بال کاٹ دو ورنہ انگریز ہمیں مار دے گا۔ جس کے سر پہ جوڑی دیکھتا اس کو گولی مار دیتا۔ انہوں نے جوڑیاں کٹائیں۔ اور کچھ بھاگ کر دربارشاہ جہانگیر کی حدود میں، سید ولی کی پناہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں صرف یہی مکان تھا پرانے زمانے میں۔ وہ جس وقت ادھر بھاگے انگریزوں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ ایک دو گھنٹے فائرنگ کی اور انگریز فوج کے جتنے افسر تھے سب جرنل اور لیفٹیننٹ، وہ سب خود بخود مرنے لگ گئے۔ انگریز نے سوچا یہ کہاں سے گولی آ رہی ہے۔ گولی تو سکھوں کے پاس ہے ہی کوئی نہیں۔ گولی تو صرف ہمارے پاس ہے۔ پھر ہمارے افسر یہ کہاں سے مر رہے ہیں؟ اب انگریزوں نے ہمارے گاؤں والوں کو اور ہمارے بزرگوں کو اکٹھا کیا اُن سے پوچھا کہ یہاں سے گولی کون چلاتا ہے؟ یہ بتاؤ کہ گولی کون چلا رہا ہے؟ ہمارے اتنے افسر مر گئے ہیں۔ اس پر ہمارے بزرگوں نے کہا کہ یہ پیر پادری ہے، سید ہے، ولی ہے، ادھر جو گولی چلائے گا گولی واپس آ کر اس کو لگے گا۔ ادھر گولی مت چلاؤ۔ اس کے بعد جتنے افسر مرے تھے ان کی لاشیں جمع کر کے ان کو یہاں دفن کیا۔"

میں نے فضل حسین سے کہا:" اب تو ان قبروں کی حالت بہت بری ہے۔ ان کی کوئی دیکھ بھال ہوتی ہے؟"

انہوں نے کہا:" اب دیکھ بھال ان کی کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ انگریز تھے، وہ کرتے تھے۔ ہم تو اپنے مزاروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ انگریزوں کی تو ہمارے ساتھ دلچسپی ہی کوئی نہیں۔ یہاں تو جانور پھرتے ہیں اپنا۔ چرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، بول پیشاب کرتے ہیں۔ وہ لوگ چلے گئے، ان کا بھی احترام ختم ہے۔ احترام تو گھر والے کرتے ہیں۔ دوسرا تو کوئی کرتا ہی نہیں ہے۔ جس کا کوئی رشتہ دار ہوتا ہے، اُس کی کچھ تو قدر ہوتی ہے۔"

کاریگرہ کمہار اور رام پیاری

گجرات تک پہنچنے کی بات تو رہ ہی گئی۔

جہلم سے آگے کا راستہ سوکھا پڑا تھا۔ کسی زمانے میں لوگوں نے درخت کاٹ کر چولہوں میں جلا دیئے اور پھر جو بارشیں آئیں انہوں نے ننگی زمین کو خوب پامال کیا۔ پوری پوری زمینیں بہہ کر دریاؤں میں چلی گئیں اور دریا مٹی سے اٹ گئے تو اپنے پرانے پاٹ چھوڑ گئے۔

ماہ رمضان کی تپتی دھوپ میں ہماری بس کھاریاں پہنچی۔ روزوں کے دنوں میں یہ واحد پڑاؤ تھا جہاں مسافروں کے لئے پینے کا ٹھنڈا پانی دستیاب تھا۔ پانی پلانا یوں بھی شاید کھاریاں کی روایت رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے یہاں کسی جوگی سے خوش ہو کر پوچھا کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟۔ وہ سچا جوگی ہوگا، اُس نے سوکھی زمینوں میں ایک کنواں مانگا۔ اکبر نے دو کنویں کھدوا دیئے۔

علاقے کے لوگ کہتے ہیں کہ کنویں کھدوانے کا پروانہ ہمایوں نے اُس وقت لکھ کر دیا تھا جب وہ ہندوستان سے بھاگ رہا تھا۔ سبب اس کا یہ بتاتے ہیں کہ جوگی نے اُسے اکبر کی ولادت کی خوشخبری سنائی تھی مگر علاقے کے لوگ کہانیاں بناتے ہوئے کتابوں میں یہ دیکھنا بھول گئے کہ ہمایوں کھاریاں کی طرف سے نہیں بلکہ سبّی اور مستونگ کے

راستے بھاگ کر قندھار گیا تھا۔

زبانِ خلق کا ہر بار نقارۂ خدا ہونا ضروری نہیں۔

کنویں اور بڑا فوجی ٹھکانہ بن جانے کے باوجود کھاریاں کا یہ سارا خطہ بنجر پڑا تھا اور میں اس کی کھڑکی سے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر سایہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سائے کا معاملہ عجیب ہے۔ آس پاس کہیں موجود نہ ہو تو آنکھیں اُسے تلاش کرتی ہیں۔ موجود ہو تو چاہے اُس کے تلے جانے کی ضرورت نہ پڑے تب بھی یہ اطمینان رہتا ہے کہ سایہ موجود ہے۔

اُس روز دہکتی ہوئی سوکھی زمینوں کا سفر طے کرنے کے بعد جب گھنے درخت آئے تو تشفی سی ہو گی۔ میرے ایک ہم سفر نے کہا کہ درخت آ گئے۔ اب گجرات قریب ہے۔ وہی گجرات جس کا پرانا نام اودے نگری تھا، یعنی ہریالی کا شہر۔

بعد میں جب اکبر نے اس شہر کو اونچے ٹیلے پر دوبارہ آباد کیا ہو گا تو ظاہر ہے کہ اُس اونچائی پر بھی پانی موجود ہو گا۔ میں وہ پانی دیکھنے اوپر چڑھا۔ گجرات میں اکبر کی تین نشانیاں مجھے زبانی یاد تھیں۔

حصار و باؤلی و کہنہ حمام

حصار، یعنی قلعہ تو دور سے نظر آنے لگا۔ نیچے سے ٹیلے کی چوٹی تک بہت اونچی فصیلیں اٹھائی گئی ہیں۔ اور ان کے پتھر اتنی صفائی اور مضبوطی سے چُنے گئے ہیں کہ اب تک ایسے صحیح سالم رکھے ہیں، معلوم ہوتا ہے مزدور ابھی ابھی اُجرت لے کر اور سلام کر کے گئے ہیں۔

قلعے تک جانے کے لئے مسلسل چڑھائی ہے۔ اُس چڑھائی کی دونوں جانب دکانیں اور مکان ہیں۔ اتفاق سے باؤلی اور کہنہ حمام اس راستے میں مل گئے۔ باؤلی یعنی کنواں کبھی یوں رہا ہو گا کہ لوگ اُس تک آسانی سے پہنچ سکیں مگر اب وہ مکانوں کے دالان میں آ گیا ہے اور مکان بھی پردہ نشینوں کے، لہٰذا ہمیں پرانی قسم کے میخوں والے چوبی دروازے

کی بھاری بھرکم زنجیر ہلانی پڑی اور اندر سے خواتین نے پوچھا کہ کون ہے تو جواباً یہ عجیب و غریب فرمائش کرنی پڑی "آپ آڑ میں ہو جائیے۔ ہم اکبر کا کنواں دیکھنے آئے ہیں۔"

خواتین چلمن کے پیچھے ہو گئیں۔ ہم صاف ستھرے، بلندی پر بنے ہوئے ہوادار کمروں کی دہلیزوں سے گزر کر کنویں تک پہنچے۔

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ اگر کوئی کنواں دیکھنے جائیں تو اس کے اندر جھانکتے ضرور ہیں۔ جرنیلی سڑک کے اس سفر میں ہم نے ایسے ایسے بہت سے کنویں جھانکے۔ اس گجرات کے کنویں پر ایک بہت پرانی عبارت دکھائی دی۔ کسی خوش خط پینٹر نے اردو اور گورمکھی میں لکھا تھا: براہِ کرم کنویں کے اندر کوڑا کرکٹ نہ پھینکیں۔

ہم نے جلدی سے جھانک کر دیکھا۔ اندر کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔

اس باؤلی سے ملا ہوا، اوپر چڑھتی ہوئی بازار نما سڑک کے کنارے اکبر کا بنوایا ہوا حمام بھی تھا۔ یہاں غسل خانوں کے فرش کے نیچے آگ جلائی جاتی تھی اور لوگ بھاپ میں غسل کرتے تھے۔ ترکی کا یہ رواج ہندوستان میں قائم نہ رہ سکا لیکن گجرات کے اس حمام میں آج بھی فرش کے نیچے آگ جلائی جاتی ہے اور لوگ اپنے ہی پسینے اور بھاپ میں نہاتے ہیں۔ یہ حمام آج تک اسی طرح چلایا جا رہا ہے جیسے مغلوں کے دور میں چلتا ہوگا مگر اب اس میں جوڑوں اور پٹھوں کے درد اور ایسی ہی دوسری تکلیفوں کے مریض نہاتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ حمام کے اوپر بورڈ لگا ہے جس پر مختلف امراض کے نام لکھے ہیں۔ مرض جتنا شدید ہوتا ہے، غسل کا معاوضہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ پھر یہ غسل حکمت سے خالی نہیں۔ مریضوں کو پہلے سب سے زیادہ گرم حمام میں رکھا جاتا ہے، پھر کم گرم میں اور اس کے بعد اس سے بھی کم گرم حمام میں۔ اور یوں وہ بتدریج باہر آتا ہے۔ غسل خانوں کے فرش کے نیچے تہ خانے بنے ہیں جن میں لکڑی سلگتی ہے۔ حمام چلانے کا فرض محلے کے دو خاندانوں کو ہمیشہ سے ملا ہوا ہے۔ وہ اسے باری باری چلاتے ہیں۔ کچھ عجب نہیں جو ایک خاندان گوجر

ہو، دوسرا جاٹ۔ یہ سارا قلعہ ہی گوجروں اور جاٹوں کا جھگڑا ختم کرنے کے لئے بنوایا گیا تھا۔

قلعے سے نیچے اتر کر ایک پرانے گوردوارے کی عمارت ہے۔ کبھی بے حد شاندار رہا ہوگا۔ اب ادھڑا پڑا ہے۔ اگر چشمِ تصور اس کی ننگی دیواروں پر نقشیں پلاسٹر چڑھا کر دیکھنے میں کامیاب ہو جائے تو یقین کیجئے کہ گرنتھ صاحب پر جھلے جانے والے مورچھل کی ہوا آج بھی رخساروں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مگر چشمِ تصور کو ابھی سے تھکا دینا ٹھیک نہیں، اس غریب کو ابھی رام پیاری کا محل بھی دیکھنا ہے۔

اِن عمارتوں کو سجانے والے کاریگر کبھی کے مر کھپ گئے لیکن یہ شہر کہ جس کا نام گجرات ہے، کاریگروں اور فنکاروں سے ایک دن بھی خالی نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ سب سے اچھی شمشیر یہاں کے لوگ بنایا کرتے تھے، پھر انہیں سجاتے تھے اور اُن کے دستوں اور پھل میں سونے چاندی کے تار اتار دیا کرتے تھے۔ لوہے میں روپہلے سنہرے تار اتارنے کا یہ فن کوفت گری کہلاتا تھا۔

سکھوں کے زمانے تک گجرات میں بہترین کوفت گری ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ گجرات کے بڑھئی ایسا اعلیٰ فرنیچر بناتے تھے کہ انگریزوں کے دور میں گجرات کی کرسیاں انگلستان تک جاتی تھیں۔ وہ جو آرام کرسیاں کہلاتی ہیں۔ وہ گجرات ہی میں بنتی تھیں،

اور پھر مٹی کے برتن! نفاست اُن پر ختم تھی۔ پانی پینے کے ایسے کوزے تو خود میں نے دیکھے ہیں جو سرخ کاغذ جیسے ہوتے تھے اور اُن میں سے دھوپ چھنتی تھی۔ چاک گھومتے تھے تو گندھی مٹی انگوٹھے اور انگلیوں کے بیچ حسن میں ڈھل جایا کرتی تھی۔ وہ اسی گجرات کے گھڑے تو تھے جو اگر کچے نہ ہوں تو عشق کو چناب کے پار اتار دیا کرتے تھے۔

شہر کے ایک نشیبی علاقے میں کمہاروں کے محلّے کے آثار اب تک باقی ہیں۔ مگر وہ چھتیں

اب نہیں رہیں کہ بھری دوپہر میں جن پر چڑھ کر محبوب کا انتظار کرنے والوں کے تلوے جلا کرتے تھے اور ہوا سے رُخ پر گیسو بلا کرتے تھے۔

گیسو اب بھی ہلتے ہیں مگر نئے زمانے کے، بجلی کے پنکھوں کی ہوا سے۔ پاکستان میں بجلی کے سب سے اچھے پنکھے جن شہروں میں بنتے ہیں اُن میں گجرات سرفہرست ہے۔ مکران سے لیکر ملتان تک ہر جگہ گجرات کے پنکھے کا چلن ہے۔

میرے لئے ممکن نہ تھا کہ پنکھوں کی صنعت دیکھے بغیر گجرات سے گزر جاؤں۔ چنانچہ میری ملاقات محمد الیاس صاحب سے ہوئی۔ خوش شکل، ہونہار، تعلیم یافتہ اور ہوشیار۔ پنکھا سازی کے ایک بڑے ادارے کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ محمد الیاس صاحب نے مجھے بتایا کہ صرف گجرات میں پنکھا بنانے والے چار سو ادارے ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اس شہر میں پنکھوں کی صنعت سے کتنے لوگوں کو روزی ملتی ہے؟ انہوں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ صنعت پنکھا سازی میں اور اس کی الائیڈ انڈسٹری میں کم سے کم دس ہزار لوگ کام کر رہے ہیں"۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے، اس شہر میں ہر سال کتنے پنکھے بنتے ہوں گے؟۔ جواب ملا "میرا اپنا اندازہ ہے کہ پانچ سے دس لاکھ پنکھا اس شہر میں سال بھر میں بنتا ہے"۔ اب میں نے پوچھا کہ ان میں سے کتنے پنکھوں کی کھپت ملک کے اندر ہوتی ہے اور تقریباً کتنا مال باہر جاتا ہوگا؟۔ انہوں نے کہا "اس میں تقریباً سارا مال پاکستان کے اندر ہی صرف ہو جاتا ہے، بہت تھوڑی سی ایکسپورٹ ہوتی ہے"۔ میں نے کہا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ چند برس پہلے تک کافی پنکھے باہر کے ملکوں میں جاتے تھے اور اب وہ صورتحال نہیں رہی؟ محمد الیاس صاحب نے بتایا "جی! ۱۹۶۰ء کے عشرے میں آخری برسوں تک کافی پنکھے باہر کے ملکوں میں جاتے تھے، ہماری اس فیکٹری کی پچاس فی صد سے زیادہ مصنوعات ایکسپورٹ ہوتی تھیں لیکن اس کے بعد کچھ ایسے معاشی حالات پیدا ہوئے کہ وہ مارکیٹیں ہمارے ہاتھ سے نکل گئیں ہماری قیمتیں زیادہ ہوگئیں اور اُس میں مشرق بعید کے

ممالک نے اُن مارکیٹوں پر قبضہ کرلیا۔"

یہ تھے محمد الیاس صاحب۔ پنکھے بنانے والے یہی ادارے اب بجلی کا دوسرا سازو سامان بھی بنانے لگے ہیں چنانچہ جرنیلی سڑک کے کنارے اب نہ صرف گرائنڈر، مکسر اور کولر بلکہ ویکیوم کلینر، ریفریجریٹر اور ائیرکنڈیشنر بھی بننے لگے ہیں۔ ذرا تحفظ اور سرپرستی مل جائے تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔ اور یہ بات ساقی سے نہیں بااختیار لوگوں سے کہی جارہی ہے۔

اس پر یاد آیا کہ جس وقت میں محمد الیاس صاحب سے ملنے پہنچا، حکومت کے دو افسر آئے بیٹھے تھے۔ جس پنکھے کو یہ دو حضرات منظور نہ کریں حکومت اُسے نہیں خریدتی۔ اتنا بھاری اختیار بڑے خوش نصیبوں کو ملتا ہوگا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس اختیار کی تصویر بنانے کی بہت کوشش کی۔ ہر بار نوٹوں اور تجوریوں کی تصویر بنی۔ ویسے بات سے بات نکلتی ہے۔ گجرات میں تجوریاں بھی بہت اچھی بنتی ہیں۔

گجرات کا ایک اَور ادارہ جسے دیکھ کر جی خوش ہوا وہ انسٹی ٹیوٹ آف سرامک ٹیکنولوجی ہے۔ یہاں شہر کے ہونہار کاریگروں کو چینی کے برتن بنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ برتن بنانے والوں کو سہولتیں دی جاتی ہیں، مشورے دیئے جاتے ہیں، خام مال دیا جاتا ہے اور وہ چاہیں تو اپنے بنائے ہوئے کچے برتن یہاں لاکر جدید بھٹیوں میں پکوا سکتے ہیں۔

صورت اب یہ ہے کہ پنکھا سازی کے بعد ظروف سازی گجرات کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ ہزاروں لوگ اس سے روزی کماتے ہیں۔ چاک اور کوئلے کی بھٹیوں کا زمانہ دریا کی طرح بہت دور جاچکا ہے۔ اب سارا کام جدید مشینوں پر ہورہا ہے۔ پہلے یہیں سے نکلنے والی لال مٹی کے برتن بنتے تھے۔ اب میانوالی اور سوات سے سفید مٹی آتی ہے اور عمدہ چینی کے برتن بنتے ہیں۔ اور اسی دوران گلگت میں بہت اچھی سفید مٹی کے بھاری

ذخیرے مل گئے ہیں۔

اُس روز میری ملاقات انسٹی ٹیوٹ آف سرامک ٹیکنولوجی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر چوہدری غلام رسول صاحب سے ہوئی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ گجرات میں چینی کے برتن بنانے والے کیا وہی لوگ ہیں جنہیں یہ فن ورثے میں ملا ہے یا اس صنعت میں باہر کے نوجوان آ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا۔

"شروع شروع میں تو اس صنعت میں یہی رحجان تھا کہ یہ فن باپ سے بیٹے ہی کو ملتا رہا ہے لیکن اب کچھ دیر سے جب سے یہ باضابطہ صنعت بنا ہے اب باہر کے لوگ بھی اور اَور لوگ بھی کافی تعداد میں اس صنعت میں آگئے ہیں پہلے مثل مشہور تھی کہ چین میں دادا مٹی بنایا کرتا تھا اور پوتا برتن بنایا کرتا تھا لیکن اب جب یہ صنعتی دور شروع ہوا ہے تو اس میں باہر کے وہ لوگ بھی جو اس صنعت سے وابستہ نہیں تھے اب اس میں آکر کام کرنے لگے ہیں کیونکہ مشینری کے دور میں اگرچہ آرٹ اپنی جگہ بدستور قائم ہے لیکن فن کے لحاظ سے بہت لوگ اس میں آگئے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس میں آئے ہیں یا صرف ان پڑھ مزدور ہی یہ سارے کام کرتے ہیں؟۔ چوہدری غلام رسول صاحب نے کہا۔

"تعلیم یافتہ نوجوان اب کوئی دس سال سے اس صنعت میں کافی آرہے ہیں۔ پہلے لوگوں کا رحجان کم تھا اور وہ اس پیشے کو اتنی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے لیکن اب جب سے ہمارے ملک میں اس قسم کی صنعتیں قائم ہوئی ہیں تو تعلیم یافتہ لوگ بھی اس صنعت میں کافی آگئے ہیں اور اس وقت ہمارے پاس ستر کے قریب طالب علم ہیں جو مختلف شعبوں میں تربیت پا رہے ہیں۔"

چوہدری غلام رسول صاحب سے مل کر میں انسٹی ٹیوٹ کا کارخانہ دیکھنے گیا۔ لاکھوں برتن اوپر تلے جمے ہوئے تھے۔ سانچوں سے ڈھل کر برتن پر برتن نکل رہے تھے۔ بہت سارے نوجوان یہ کام سیکھ رہے تھے۔ میری ملاقات اُن کے ایک استاد محمد عبدالغفور صاحب سے ہوئی جو ڈیمانسٹریٹر ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ گجرات میں کیا اب بھی کہیں چاک گھمائے جاتے ہیں یا اب سارے برتن مشینوں سے بنتے ہیں؟ انہوں نے کہا "پہلے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کار نہیں تھا۔ سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ اور یہ جو آج کل گلیزنگ ہو رہی ہے اور کلر گلیزنگ ہو رہی ہے اور مختلف قسم کے ڈیزائن بن رہے ہیں اور طرح طرح کی تیزی آنے لگی ہے یہ پہلے کہاں تھی؟ پہلے تو سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا اور گھروں میں چھوٹی چھوٹی بھٹیاں لگائی جاتی تھیں اور تمام کام موروثی کمہار کرتے تھے، وہ سارا کام اب ختم ہو رہا ہے۔"

محمد عبدالغفور صاحب کے بعد میں کسی پرانے کاریگر سے ملنا چاہتا تھا۔ ایسے کاریگر سے جس کے باپ دادا بھی مٹی کے برتن بناتے چلے آئے ہوں۔ اتفاق سے وہیں میری ملاقات مولوی محمد یونس صاحب سے ہوئی۔ وہ تقریباً ۴۵ سال سے برتن بنا رہے ہیں۔ محمد یونس کے بزرگ محمد حسین، حاجی محمد عظیم، حاجی محمد رمضان، یہ سب گجرات کے بے مثال کاری گر تھے۔ کہنے لگے کہ میرے استاد آدھے گجرات کے استاد تھے۔ اُن کے شاگرد گوجرانوالہ تک پھیلے ہوئے ہیں جو وہاں اسٹون ویئر (STONE WARE) کا کام کر رہے ہیں۔ میں نے محمد یونس صاحب سے پوچھا کہ آپ کے خاندان کی عمریں برتن بناتے گزریں، یہ بتائیے کیا آپ کے بچے بھی اس کام کو آگے بڑھائیں گے؟

جواب ملا "نہیں۔ ویسے میرا ارادہ تو نہیں ہے کہ وہ اس لائن میں آئیں۔ اُن کو تعلیم دلواؤں گا اور اُن کو اور کوئی اچھا سا کام کراؤں گا، جو بھی اُن کی قسمت میں ہو۔ یہ تو مقدر کی بات ہے۔ تعلیم حاصل کرنا بھی کوئی اپنے بس کی بات نہیں۔ ویسے میرا ارادہ ہے کہ ان کو تعلیم دلوا کر کوئی اچھا سا بزنس کرا دوں یا وہ کوئی کاروبار کر لیں۔"

مطلب یہ کہ مولوی محمد یونس صاحب کے بعد اس گھر سے ظروف سازی کی روایت ختم ہو جائے گی اور مطلب یہ کہ آج کا انسان بھی اپنے فیصلوں اور ارادوں سے نہیں اپنے مقدر سے آس لگائے بیٹھا ہے۔

ہاں منصوبوں اور عزائم کا سارا مظاہرہ اب مکان بنانے میں ہو رہا ہے۔ گجرات میں، خاص طور پر شہر سے ذرا باہر اب بڑے خوش نما مکان بن رہے ہیں۔ ان میں ماہروں کی رائے سے لیکر پیسے کی فراوانی تک بہت کچھ صاف جھلکتا ہے۔ یہ تو خیر نئے زمانے کی باتیں ہیں، گجرات کا وہ مکان جو آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے وہ رام پیاری کا محل ہے۔

رام پیاری کون تھی؟ اس کی تفصیل جاننے کا وقت نہ تھا۔ وہ کیسی تھی؟ یہ پوچھنے کے لئے رمضان کا مہینہ مناسب نہ تھا۔ بس اتنا سُنا کہ بہت خوب صورت تھی۔ علاقے کے ایک رئیس سے اُس کی شادی ہوئی تو جیسی رام پیاری تھی، اُس کیلئے اُس نے ویسا ہی محل بنوا دیا۔

اُسی کی خاطر شہر میں پہلے پہل موٹر گاڑی آئی۔ اس میں بیٹھ کر شام کو جب رام پیاری دریا میں ڈوبتے ہوئے سورج کا حسن دیکھنے جاتی تھی اُس وقت شہر چڑھتے ہوئے چاند کا حسن دیکھنے جمع ہو جایا کرتا تھا۔ پھر جب برصغیر تقسیم ہوا اور اِدھر کی آبادی اُدھر ہوئی تو رام پیاری گجرات میں اپنا محل جوں کا توں چھوڑ کر ہندوستان چلی گئی۔

فرانسیسی کھڑکیوں، ہسپانوی دریچوں، اطالوی ٹائلوں سے مزین فرش اور دیواروں، تراشیدہ بیل بوٹوں سے آراستہ چھتوں اور وکٹورین طرز کے کشادہ چوبی زینوں کے اس محل میں اب دو سو لڑکیاں رہتی ہیں۔ اس عمارت میں اب طالبات کا ہاسٹل ہے اور اُن کا کالج سڑک پار قریب اُتنی ہی شاندار رائے بہادر لالہ کِدار ناتھ کی کوٹھی میں قائم ہے۔

یہ میری خوش قسمتی (یا شاید بد قسمتی) تھی کہ جن دنوں میں رام پیاری کے محل میں پہنچا چھٹیاں تھیں اور طالبات اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ البتہ ہاسٹل کی نگراں سرِدار بیگم چوہدری ہاں

موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے تین منزلہ عمارت کا ایک ایک گوشہ دکھایا۔ ایک حمام کے اوپر چھپے ہوئے اُس چھوٹے سے کمرے کا روشن دان بھی دکھایا جس میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ جن دنوں اِس عمارت میں سرکاری افسروں کی تربیت کا مرکز تھا، کسی نے اوپر والے کمرے کی دہلیز میں اس کا چور دروازہ ڈھونڈ نکالا یا شاید ٹائلوں کا فرش توڑ کر لوگ اندر اترے۔ اب فرش میں اُس جگہ سیمنٹ کا ایسا پلاسٹر ہے جیسے قالین میں ٹاٹ کا پیوند۔ البتہ کمرہ دوبارہ بند ہو گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس خفیہ کمرے کے اندر کبھی نوٹ چھاپنے کی مشین لگی تھی۔

زبانِ خلق کا ہر بار نقارۂ خدا ہونا ضروری نہیں۔

سردار بیگم مجھے محل کے چھوٹے بڑے آرائشی کمرے دکھا رہی تھیں۔ اُس وقت وہ کمرے کھری چارپائیوں سے بھرے پڑے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ ایک ایک کمرے میں کتنی لڑکیاں رہتی ہیں؟۔ انہوں نے کہا" ویسے تو ایک بڑے کمرے میں دس سے زیادہ نہیں رہنی چاہئیں لیکن ہر سیشن میں طالبات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کمروں میں جتنی بھی چارپائیاں سما سکیں اتنی ہی لڑکیوں کو ہم رکھ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا" لڑکیاں شکایت نہیں کرتیں؟ "

انہوں نے کہا" لڑکیوں کو پتہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں خود سمجھتی ہیں۔ ان کی اپنی کمیٹی بنی ہوتی ہے ان کی ہیڈ گرل خود کمرے تقسیم کرتی ہے، وہ ساری مجبوریاں خود سمجھ لیتی ہیں ۔ ویسے اس معاملے میں بڑا تعاون کرتی ہیں۔ کبھی نہیں انہوں نے آج تک کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں، کوئی کچھ نہیں، انہیں پتہ ہے کہ جگہ تنگ ہے۔ بلکہ ان کے والدین جب داخلہ دلواتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہماری لڑکیاں برآمدوں میں رہ لیں گی۔ آپ جگہ ضرور دیں کیونکہ ہم کہاں سے ان کو روز بھیجیں، ہمیں فکر ہوتی ہے سفر کی۔"

اب میں نے موضوع بدلا اور کہا" اچھا، رام پیاری کون تھیں، کب تھیں، اللہ جانے۔

یہاں سے چلے جانے کے بعد کبھی وہ خود یا ان کے کوئی عزیز یا رشتے دار اس عمارت کو دیکھنے آتے ہیں ؟ "

سردار بیگم نے بتایا کہ " ایک دفعہ پچھلے سے پچھلے سال ۔ دو سال ہو گئے ہیں کہ کنجاہی صاحب کے ساتھ آتے تھے ۔ رام پیاری کے عزیز تھے اور اس عمارت کو دیکھنا چاہتے تھے ۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور پرانی بلڈنگ تھی ۔ وہ بھی ان کا آبائی گھر ہوتا تھا ۔ وہ بھی دیکھنے کے لئے یہاں تک تشریف لائے تھے اور بڑے خوش ہوئے کہ بہت صاف ستھری اور بہت اچھی طرح آپ نے یہ عمارت رکھی ہے ۔ رات کے وقت آئے تھے وہ "

میں نے کہا " جب کبھی یہ رام پیاری کا محل اچھی حالت میں ہوگا تو اس میں پانی بجلی کا انتظام آپ کا کیا خیال ہے کس طرح کیا جاتا ہوگا "

انہوں نے بتایا " اس میں معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس میں بڑا اعلیٰ قسم کا بجلی کا انتظام تھا اور بڑا اعلیٰ جنریٹر کے ساتھ پانی کا بھی انتظام تھا ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک باتھ روم موجود ہے جس میں ہلکے بینگنی رنگ کی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں اور بڑا خوبصورت ہے ، آج تک وہ نہیں ٹوٹا "

میں نے کہا " یہ جو اس کا صدر دروازہ ہے وہاں سے داخل ہونے کا نہایت خوبصورت راستہ ہے ۔ ٹائلز کے فرش ہیں ، دیواروں پر دونوں جانب سبز رنگ کے میرا خیال ہے اطالوی ٹائلز لگے ہیں ۔ سامنے ایک وکٹورین طرز کا کشادہ زینہ اوپر تک جاتا ہے اس پر کبھی سرخ قالین بچھے ہوں گے ۔ اس پر رام پیاری بال کھولے ہوئے اترتی ہوگی ۔ ایسی تصویریں کبھی آپ لوگوں کے ذہن میں یا چشمِ تصوّر میں بنتی ہیں ؟ "

سردار بیگم مسکرائیں اور بولیں " جی ہاں ، اس کا بھی تصوّر ہوتا ہے لیکن جب ہماری لڑکیاں یہاں ہوتی ہیں اور فنکشن ہوتے ہیں تو وہ بھی پریوں سے کم نہیں ہوتیں ۔ وہ اور زیادہ رونق کو دوبالا کرتی ہیں اور رام پیاری کی یاد کو ہمیشہ ہی تازہ کرتی ہیں "*

*کہ وہ مالک اور مکین اُس کی یاد کو تازہ ہی رکھتے ہیں کیونکہ وہ بھی حُسن اور خوبصورتی کو پسند ہی کرتی ہوں گی جنہوں نے اتنی خوبصورت عمارت بنائی۔"

ایک خط

محترم! میں آپ کا پروگرام "جرنیلی سڑک" بہت شوق اور چاؤ سے سنتا ہوں۔ ایک شام اس پروگرام میں رام پیاری کے محل کا ذکر سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھے سنہ ۱۹۲۶ کے وہ دن یاد آ گئے جب مجھے ایک شادی میں شرکت کے لئے گجرات جانے اور یہ محل دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اس بارے میں کچھ اور اطلاعات دینا چاہتا ہوں۔ یہ خوبصورت خاتون ڈنگہ کے آنجہانی رائے بہادر سندر داس چوپڑا کی بیوی تھیں۔ وہ کوئٹہ کے ایک بڑے فوجی ٹھیکے دار تھے اور پہلی عالمی جنگ میں اور اس کے بعد جنگ افغانستان میں انہوں نے بے پناہ دولت جمع کر لی تھی۔ ان کی تین بیویاں تھیں۔ رام پیاری سب سے چھوٹی تھی۔ انہوں نے اپنے آبائی قصبے ڈنگہ میں اپنی تینوں بیویوں کے لئے تین محل بنوائے تھے۔ یہ جگہ پاکستان کے ضلع گجرات میں لالہ موسیٰ اور ملک وال کے درمیان ہے۔ خود رام پیاری گجرات کی رہنے والی تھی چنانچہ اس کی درخواست پر اس کے لئے گجرات میں ایک اور شاندار عمارت بنوائی گئی۔ میرا خیال ہے کہ تقسیم ہند کے وقت وہ گجرات میں نہیں تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ آزادی سے پہلے ہی مر گئی تھی جس کے بعد یہ عمارت اس کے رشتہ داروں کی تحویل میں چلی گئی تھی۔ خود رائے بہادر سندر داس چوپڑا بھی زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے۔ مجھے یہ باتیں یوں معلوم ہیں کہ سنہ بیس کے عشرے میں میری تعلیم گورنمنٹ سنڈیمن ہائی اسکول کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ اب میں یہاں ہندوستان کی ریاست مدھیہ پردیش کے شہر پرسیا میں رہتا ہوں۔ ریٹائر ہو گیا ہوں اور آپ کے پروگرام سے لطف اندوز ہوا کرتا ہوں۔ مجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی کہ رام پیاری کے محل کو پاکستان کی پیاری طالبات کا ہاسٹل بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ عمارت کا اصل نام برقرار رکھا گیا ہے۔

(آپ کا مخلص :- سالگ رام مہتا)

سِکھوں اُور سکھوں کا گوجرانوالہ

سب کی طرح شہروں کے بھی اچھے بُرے دن آتے ہیں۔ چناب کے پار وزیر آباد جنکشن پر کبھی ریل گاڑی رکا کرتی تھی تو چمکتی ہوئی قینچیاں اور بھانت بھانت کے چاقو چھُریاں پر سجائے کتنے ہی پھیری والے ساتھ ساتھ چلّانے لگتے تھے: لو جی وزیر آباد کے چاقو، لو جی وزیر آباد کی قینچیاں!۔ مگر اب وہ آوازیں، وہ لوگ، اور ان کا وہ ساز و سامان سبھی کند ہو گئے ہیں۔ خود اُن کا شہر بھی۔ کہتے ہیں کہ وزیر آباد جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا شہر دیکھنا چاہیں جس کی ترقی رک گئی ہو تو وزیر آباد دیکھئے۔

اس کے ارد گرد دریا اور نالے ہیں چنانچہ شہر کے پھیلنے کی گنجائش نہیں۔ چاقو اور قینچیاں بنانے کی پرانی صنعت تھی۔ فوج کو یہ چیزیں یہیں سے فراہم کی جاتی تھیں اب چاقو چھری شہر شہر بننے لگے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے چلنے بھی لگے ہیں۔

آزادی سے پہلے کشمیر کے جنگلوں سے عمارتی لکڑی چناب میں بہا کر وزیر آباد لائی جاتی تھی اور یہاں ٹمبر کی بہت بڑی منڈی تھی۔ وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

یہی وزیر آباد ہے جو کسی زمانے میں پنجاب کا بہترین شہر کہلاتا تھا۔ وہ یہی شہر تو تھا جو رنجیت سنگھ نے اپنے فرنگی جرنیل ابوطوبلیہ کو سونپ دیا تھا۔ ابوطوبلیہ اٹلی کا باشندہ تھا، شہر بسانے اور گلی کوچے بنانے کا فن اٹلی والوں سے بڑھ کر کسی کو نہیں آتا چنانچہ اس نے سیدھی

سڑکوں اور دائیں بائیں جانے والی خطِ مستقیم جیسی گلیوں، خوش نما چوراہوں اور گھنٹہ گھروں کے نقشے کھینچ کر وزیر آباد کو از سرِ نو آباد کیا۔ اس شہر کی وضع قطع میں وہ سلیقہ اب تک نظر آتا ہے مگر کوئی کیا کرے کہ وزیر آباد کو زمانے کی نظر لگ گئی۔

شاداب زمینوں میں دوڑتی ہوئی جرنیلی سڑک ایک اور بستی میں نکلتی ہے جس کا نام گکھڑ ہے۔ لیکن گکھڑوں کا علاقہ تو ہم راولپنڈی اور جہلم کی طرف چھوڑ آئے تھے پھر یہاں چناب اور راوی کے بیچ یہ گکھڑ کیسے؟

کسی نے بتایا کہ ہمایوں نے ایران سے واپس آکر وفاداری کے صلے میں چناب سے دس فرسنگ آگے کا علاقہ گکھڑوں کو دے دیا تھا۔ انہوں نے یہاں اپنی چوکی قائم کر لی تھی جو گکھڑ چوکی کہلاتی تھی۔ یہ قصبہ آج تک گکھڑ کہلاتا ہے۔ ہم اس کے درمیان سے گزرے تو ہر طرف دریوں کے کارخانے اور دکانیں نظر آئیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں جو کشمیری باشندے آکر یہاں آباد ہوئے تھے اور اب تک آباد ہیں وہ دریاں بنانے کا فن اپنے ساتھ لائے تھے۔

گکھڑ سے آگے چلیں تو گوجرانوالہ چھاؤنی آتی ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس فٹ اونچے سورج مکھی کے کھیت آتے ہیں۔ دو رویہ لگے ہوئے بڑے بڑے سفید پُتے ہوئے پتھر آتے ہیں جن پر محکمہ زراعت نے کسانوں کے لئے ہدایتیں لکھی ہیں: کون سا بیج بوئیں، کون سی کھاد ڈالیں اور کس مخلوق کو تلف کریں۔

ان سب کے بعد گوجرانوالہ آتا ہے۔ جب تک میں وہاں نہیں گیا تھا یہی سنا تھا کہ گوجرانوالہ پہلوانوں کا شہر ہے لیکن جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ صحت مند اور ہنر مند لوگوں کا شہر ہے۔ جیتا جاگتا، ہشاش بشاش، چاق و چوبند شہر۔ اس راستے میں واحد شہر جہاں سڑکوں کے کنارے ٹھنڈا دودھ فروخت ہوتا ہے جگہ جگہ ٹنکیاں، مٹکے اور گھڑے آراستہ ہیں جن کی دودھ جیسی سفید رنگت ہے اور لوگ بڑے بڑے گلاس بھر بھر کر دودھ پی رہے ہیں۔

بازار لوگوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کہیں سودا سلف تولا جا رہا ہے، کہیں گنا جاتا ہے اور کہیں ناپا جا رہا ہے۔ ٹین کے ٹرنک، لوہے کے برتن اور کریپ کے دوپٹے خریدے جا رہے ہیں اور بزاز کچھ زیادہ ہی خندہ پیشانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں کیونکہ شہر میں کسی جگہ "باڑہ" کھلنے والا ہے، یعنی اُس کپڑے کی مارکیٹ جس کے بارے میں دعویٰ ہے کہ غیر ملکی ہے اور اسمگل شدہ ہے۔ اوپر سے لوگ اتنے دلاور ہو گئے ہیں کہ انہوں نے دیواروں پر پوسٹر چسپاں کئے ہیں: "اب آپ کو باڑہ جانے کی ضرورت نہیں۔ بہترین غیر ملکی کپڑے کا باڑہ خود آپ کے شہر میں کھل رہا ہے۔" اس کے جواب میں کپڑے کے مقامی تاجروں نے پوسٹر لگائے ہیں جن پر لکھا ہے: "اسمگلروں کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اپنے شہر کے پرانے واقف کار دکانداروں سے پورے اعتماد کے ساتھ عمدہ کپڑا خریدیں۔"

میں نے وہ بھی خریدا۔ سنا تھا کہ گوجرانوالہ میں دھوتیوں کا بہت اعلیٰ کپڑا بنتا ہے۔ شہر کے ایک پرانے واقف کار دکاندار سے گوجرانوالہ کے کپڑے کا پورا تھان خرید کر میں کراچی لے گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کراچی کا بنا ہوا تھا۔

اسی تنگ مگر بارونق بازار میں ہم ایک قدیم عمارت کے سامنے ٹھہر گئے۔ یہ سکھوں کی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل اور ناظم سردار ہری سنگھ نلوا کا مکان تھا۔ اب اس میں دینی مدرسہ کھل گیا ہے۔ پھر اُس علاقے سے ذرا باہر جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دادا چرت سنگھ جاٹ کی سمادھی دیکھی۔ اس میں دینی مدرسہ کھل گیا ہے۔ سب سے شاندار سمادھی رنجیت سنگھ کے والد مہان سنگھ کی ہے۔ اس میں ابھی مدرسہ نہیں کھلا ہے۔ دیکھنے میں نہایت دیدہ زیب مغل عمارت نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں حسن ابدال سے لائی گئی تھی۔ اُس زمانے میں بنی بنائی مغل عمارتیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔ یہاں سے اُٹھائی، وہاں بنا دی۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اُس پہلے والی لحد پر آسمان کو شبنم افشانی کرنے میں ذرا سہولت ہو جاتی تھی۔

ایک اور عمارت جس میں ابھی مدرسہ نہیں کھلا، وہ شہر کے اندر وہ مکان ہے جس میں

خود مہاراجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوئے تھے۔ جب سے ہندوستان کے سکھوں کا آنا جانا شروع ہوا ہے اُس عمارت کی حالت ٹھیک ٹھاک ہوگئی ہے۔ اُس پر سفیدی ہو چکی تھی۔ اس کی مرمت کر دی گئی تھی۔ مختلف کمروں کے باہر سکھ زائرین کی سہولت کے خیال سے گورمکھی میں لکھ دیا گیا تھا تاکہ یہ معلوم کرنے میں سہولت ہو کہ باورچی خانہ کون سا ہے اور غسل خانہ کون سا نہیں ہے۔

ایک کمرے کے باہر لکھا تھا: "مہاراجا رنجیت سنگھ اس کمرے میں پیدا ہوئے تھے"۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ وہاں رنجیت سنگھ کا وہ پالنا بھی رکھا تھا جس میں پوت کے پاؤں نظر آ گئے تھے۔ اس مکان کے پیچھے سکھوں نے باغ لگایا ہوگا۔ وہاں ایک بہت پرانی آڑھی ترچھی تختی آج تک لگی ہے جس پر 'حضوری باغ' لکھا ہے۔ باغ اجاڑ کر اور پہلے والے مکان ڈھا کر اب وہاں بے ہنگم عمارتیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ پھر وہی دکانیں بنیں گی، دفتر بنیں گے، فلیٹ بنیں گے، شاپنگ پلازہ بنیں گے اور کتنی ہی جیبیں بھریں گی۔

گوجرانوالہ تاریخی شہر نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا وجود تک نہ تھا۔ مغل دور کی کتابوں میں اس کا نام بھی نہیں ملتا۔ شیر شاہی سڑک بھی یہاں سے نہیں گزرتی تھی۔ اکبر کے عہد میں یہاں امین آباد اور حافظ آباد بسائے گئے۔ شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ نے شکوہ پور آباد کیا جو آگے چل کر شیخوپورہ کہلایا۔ لیکن خود شہر گوجرانوالہ گمنام رہا۔ کہتے کہ اٹھارھویں صدی میں یہ علاقہ قریب قریب ویران ہو گیا تھا۔ پھر سنا ہے امرتسر کے سانسی جاٹوں نے گوجروں کے ایک قبیلے کو اپنے شہر سے نکالا۔ ان کے قافلے چناب کی طرف چلے لیکن راہ کے ایک گاؤں میں اتر کر انہوں نے ڈیرا ڈال دیا۔ نکالے ہوئے گوجروں کا یہی ڈیرا گوجرانوالہ کہلایا۔ آخر رنجیت سنگھ کے دادا چرت سنگھ جاٹ نے اس پر قبضہ کیا اور گوجرانوالہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ چرت سنگھ کے بیٹے اور پوتے کا مستقر بھی یہی شہر تھا۔

لیکن جب سکھوں کی قوت بڑھی تو وہ اپنا صدر مقام اٹھا کر لاہور لے گئے۔ وہ اٹھارہویں صدی کا آخری برس تھا۔

گوجرانوالہ پھر تنہا رہ گیا۔ سکھوں کے دور میں یہاں کی مسلم آبادی کے حوصلے کا کیا حال ہوگا اُس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت ہند کے دوران گوجرانوالہ پہ سناٹا طاری تھا۔ بالآخر ۲۲-۱۹۲۱ء کی عدم تعاون اور خلافت تحریک میں یہ شہر جاگا۔ گوجرانوالہ کے تنومند نوجوانوں نے جاکر ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ پھینکیں اور اسٹیشن کو آگ لگا دی۔ حکام نے جل کر نیا اسٹیشن شہر سے دور بنا دیا تاکہ شہریوں کو تکلیف ہو۔ لیکن یہ سزا کارگر نہ ہوئی۔ اسٹیشن پھر شہر کے کنارے لانا پڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب شہر پھیلا تو یہی اسٹیشن اس کے بیچوں بیچ آگیا۔

میں پہنچا تو خیال تھا کہ میرے میزبان گلاس بھر بھر کر دودھ اور لسی پلائیں گے۔ صبح و شام وہی کھلایا جائے گا اور مرغ چھولے اور پالک گوشت سے تواضع ہوگی لیکن وہ مجھے ائرکنڈیشنڈ چینی ریستوران میں لے گئے اور دو دن تک مجھے چکن کارن سوپ اور سویٹ اینڈ ساور بیف معہ ایگ فرائیڈ رائس قسم کی چیزیں ملیں۔ گوجرانوالہ میں اتنے عمدہ ٹھنڈے طعام خانے، اور اس میں اتنے گرم گرم چینی کھانے کا دس برس پہلے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

شہر کے جو نئے علاقے آباد ہو رہے ہیں ان میں ایسے اچھے اور آرام دہ مکان ہیں اور مکانوں میں زندگی کی ایسی آسائشیں موجود ہیں کہ دیکھا ہی کیجئے۔ ہر گھر میں کار کھڑی ہے، نوجوانوں کے لئے موٹر سائیکلیں ہیں۔ واک مین ہیں۔ کامپیکٹ کیمرے ہیں اور ورزش کی پرانی روایت کا اب یہ حال ہے کہ صاحب حیثیت لوگوں کے گھروں میں وہ بائیسکل آگئی ہے جو اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوڑا کرتی ہے۔

ویسے نئے معاشرے میں جو لوگ دیکھتے دیکھتے صاحب حیثیت ہوتے ہیں ان کی

پوری زندگی کا حال اسی بائیسکل جیسا ہے۔ سرپٹ دوڑ رہی ہے لیکن اپنی جگہ کھڑی ہے۔

پہیہ آگیا ہے۔ باڑہ آنے والا ہے۔ باڑے والے اپنے ساتھ صرف اسمگل شدہ کپڑا ہی نہیں بلکہ ہیروئین اور کلاشنکوف بھی لائیں گے۔ نوجوان چھپ چھپ کر منشیات کے انجکشن لگائیں گے۔ خود کار رائفلیں کرائے پر ملیں گی۔ یہ میرا خواب سہی مگر بڑا بھیانک ہے۔

ایسے ہی لوگوں پر قابو پانے کے لئے اِسی شہر گوجرانوالہ کے سردار ہری سنگھ نلوا کو اٹک پار بھیجا گیا تھا۔ وہ جو ظلم ڈھانے پر آیا تھا تو سزا دینے کے لئے اُس نے پورے پورے شہر ڈھا دیئے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں کہ رونا بند کرو ورنہ ہری سنگھ نلوا آجائیگا۔

کیا بدلا ہوا وقت اب پرانے حساب چکائے گا؟

اسی گوجرانوالہ میں میری ملاقات میر عطا محمد صاحب سے ہوئی۔ ان کا تعلق اُس نسل سے ہے جس نے بدلتے ہوئے وقت کو اپنی بجھی بجھی سی ضعیف آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک جرنیلی سڑک ہی کیا، ہر سڑک کے کنارے آباد اگلے وقتوں کے یہ لوگ یہی گلہ کرتے ملیں گے کہ وہ زمانہ جو گزر گیا وہ کتنا اچھا زمانہ تھا۔ اور وقت جو آرہا ہے، قیامت سے کم نہ ہوگا۔ یہ لوگ بوڑھے سہی، وقت کے دھارے سے بچھڑے ہوئے سہی، مگر ان کی بات ایسی ہے کہ ذرا دیر ٹھہر کر سن لی جائے تو ذہن میں سوتے ہوئے کچھ تار جھنجھنائیں گے ضرور۔

میر عطا محمد صاحب گوجرانوالہ کے قدیم باشندے ہیں۔ وہ خود، ان کے والد اور ان کے دادا گوجرانوالہ کے میونسپل کونسلر تھے۔ میر عطا محمد اسّی برس کے ہو رہے ہیں۔ کوتوالی بازار میں اپنے قدیم لیکن عمدہ مکان میں بیٹھے وہ باتیں کر رہے تھے۔ کبھی آج کے دور کی اور کبھی اُس زمانے کی جسے وہ 'ہمارا زمانہ' کہتے تھے۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے زمانے میں شہر گوجرانوالہ کیسا تھا؟

کہنے لگے "یہ شہر جو تھا، یہ ایک قصبے جیسا شہر تھا۔ اب تو یہ شہر بن گیا ہے۔ تقریباً دروازوں کے باہر کوئی شاذ و نادر مکان نظر آتا تھا۔ اب تو یہ باہر میلوں تک پھیل گیا ہے"

پتہ نہیں لگتا یہ کتنا بڑا شہر ہے۔ میں تو اب کسی جگہ چلا جاؤں تو مجھے پتہ نہیں لگتا کہاں آ گیا ہوں۔"

میں نے پوچھا کہ یہاں جو باشندے تھے ان کا عام طور پر روزی کا ذریعہ کیا تھا؟

انہوں نے بتایا "ان کا روزی کا ذریعہ آج کل کے بالکل برعکس تھا۔ ان کا روزی کا ذریعہ انتہائی ایمان دارانہ اور بہت سلجھے ہوئے انسان۔ رات کو بڑے آرام کی نیند سونا صبح آرام سے اُٹھ کر کام پر جانا۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ اب ارب پتی انسان کو بھی رات نیند نہیں آئے گی اور نہ آتی ہے۔ میرے والد صاحب بہشتی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے بڑے اَور تھے، ہم اَور ہیں، تم اَور ہو، تمہاری اولاد اَور ہو گی اور ان کی اولاد کا خدا حافظ۔ وہ دیکھ رہے ہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح کا یہ وقت پاس ہو رہا ہے، کوئی آرام کی نیند سویا ہے یا چین سے بیٹھا ہوا ہے؟۔ آج تو کروڑ پتی بھی ہو گا، وہ بھی بے چین ہے۔"

اس پر میں نے میر عطا محمد صاحب سے پوچھا کہ کس وقت سے آپ کا خیال ہے کہ یہ تبدیلی آئی ہے؟

جواب ملا "یہ پارٹیشن کے بعد تبدیلی آئی ہے۔ اُس سے پہلے بالکل صحیح معاملہ تھا۔ یہ تبدیلی اُس وقت آئی ہے جس وقت خاندانی انسان نیچے ہو گئے اور نیچے والے اوپر آ گئے۔ پیسے کی بہتات نے یہ بیڑا غرق کر دیا۔"

میں نے پوچھا کہ ہندو اور سکھ آبادی کیسی تھی آپ کے شہر کی؟

میر صاحب نے کہا "مسلمانوں کے ساتھ، ہندوؤں کے ساتھ، سکھوں کے ساتھ بیاہ شادیوں میں تمام نے مسلمانوں نے بھی شامل ہونا، عیسائیوں نے بھی شامل ہونا، سکھوں نے بھی شامل ہونا، ہندوؤں نے بھی شامل ہونا۔ اور اُس وقت ایک تنبول کا رواج تھا۔ شادی بچی کی ہو یا بچے کی ہو، تنبول کے طور پر کسی نے روپیہ دے دیا، کسی نے دو دے دیئے، کسی نے تین دے دیئے۔ بس اتنا ہی ہوتا تھا کیونکہ اس وقت جو تیس روپے کماتا تھا وہ گھر کا خرچ

پورا کر لیتا تھا مہینے کا۔ اب تو سویرے سو روپے کا ناشتہ آتا ہے۔ اُس کے بعد یہ ہیں نتائج نہیں۔ پھر لڑکے والے کی ساری عمر لڑکی والے کے گھر جا کر گزری کہ اس نے مجھے لڑکی دے دی ہوئی ہے۔ اب دیکھ لو کیا ہے؟ وہ زمانہ اور یہ زمانہ۔ منہ سے مانگتے ہیں کتنے لاکھ دو گے؟ پھر تمہاری لڑکی لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ آپ کے زمانے میں کنبہ کتنا بڑا ہوتا تھا؟ عام طور پر گھر میں کتنے بچے ہوتے تھے؟

میر صاحب نے کہا "اُس وقت یہ رواج تھا کہ، اب تو مجھے شرم آتی ہے، کہ جس وقت انسان کی شادی ہوتی تھی تو اُس کی بیوی اُس سے بھی پردہ کرتی تھی۔ ساس سسر کے سامنے اس کا شوہر اندر آگیا ہے تو اس کی بیوی خدا کی قسم شوہر سے بھی پردہ کرتی تھی۔ کوئی بچہ ہوگیا ہے تو اُسے تو اٹھانا ہی نہیں۔ وہ تو دادا دادی جانیں۔ اب تو شادی بعد میں ہوتی ہے، بازو میں بازو پہلے ڈالے ہوتے ہیں، ہمارے وقت یہ بات تھی کہ کوئی خراب کام نہیں ہوتا تھا۔ ہم اکٹھے لڑکے اور لڑکیاں کھیلا کرتے تھے۔ اور اُس وقت بجلی نہیں ہوتی تھی۔ کسی گھر میں سو رہے ہیں سب لڑکے اور لڑکیاں۔ کسی گھر میں سو رہے تمام محلے والے اطمینان سے سو گئے ہیں کہ بھائی وہ کھیلتے کھاتے کسی جگہ سو گئے ہوں گے۔ بہت اچھا زمانہ تھا وہ۔"

میں نے پوچھا "اور ملنا جلنا کیسا تھا۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید یہ کس طرح منائے جاتے تھے؟"

میر عطا محمد صاحب نے کہا "نہایت پیار اور محبت کے ساتھ نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑے۔ اُس وقت حال یہ تھا کہ اگر کوئی قتل ہوگیا ہے تو آندھی آجاتی تھی۔ سب لوگ یہ کہتے تھے کہ آج قتل ہوگیا ہوا ہے، آندھی آرہی ہے۔ یہ تو میرے بچوں نے بھی دیکھا ہوگا۔ تو اب تو روزانہ کئی قتل ہوتے ہیں۔ آپ اخبار میں پڑھتے ہوں گے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پیسے

کی بہتات ہوگئی ہے۔"

میں نے کہا کہ آپ کے زمانے میں چوری، ڈکیتی، رہ زنی ہوتی تھی؟

فوراً بولے "ہاں ہوا کرتی تھی مگر بہت کم۔" انہوں نے یہی جملہ دہرایا۔

میں نے پوچھا "یہ جو جی ٹی روڈ تھی، اس پر اس قسم کی وارداتیں ہوتی تھیں؟"

کہنے لگے "کبھی نہیں ہوتے تھے۔ چوریاں وغیرہ گھروں میں ہوتی تھیں مگر بہت کم۔ ایسی ڈکیتیاں وغیرہ سڑکوں پر تو کبھی نہیں ہوتی تھیں۔ اور نہ کبھی سنی تھیں۔ جہاں تک لاری اور ٹرک وغیرہ کا تعلق ہے تو یہ سمجھئے کہ یہاں فلیچر ایک سیشن جج تھا، اس کے پاس ایک کار تھی اور ایک صلاح الدین کے پاس کار تھی۔"

میں نے سوال کیا کہ عام لوگ کیسے سفر کرتے تھے؟

انہوں نے بتایا "بیل گاڑی میں۔ یہ جو بیل گاڑی ہوتی ہے نا؟ اس پر مال جاتا تھا لاہور امرتسر وغیرہ۔ زیادہ ان پر جاتا تھا۔ دو دو تین تین دن کے بعد۔ مثلاً لوہا لاہور سے آ رہا ہے، کوئی فروٹ آ رہا ہے، کوئی یہاں سے جا رہا ہے، کوئی آ رہا ہے۔ یہ سب بیل گاڑی پر!"

میں نے پوچھا کہ اُس وقت جی ٹی روڈ کتنی چوڑی تھی؟

انہوں نے بتایا "دس فٹ۔ مگر وہ چھوٹے روڑوں کی بنی ہوئی تھی۔ یہاں تو اُس کو دھرمٹ کہتے ہیں اُس سے کٹائی ہوتی تھی۔ ہاتھوں سے۔ یہ انجن وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ بھی میں نے دیکھا ہے۔"

میں نے پوچھا کہ سڑک کی مرمت وغیرہ ہوتی رہتی تھی؟ ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہوگی؟

جواب ملا "بہت اچھی مرمت ہوتی تھی۔ اور ٹوٹ سکتی نہیں تھی نا! لکڑ کے پہیے ہوتے تھے بیل گاڑی کے، تو اس سے سڑک کہاں ٹوٹتی ہے۔ گھوڑیوں پر لوگ سواری عام کرتے تھے۔ اس سے کیا سڑک نے ٹوٹنا ہے۔"

اب میں نے میر عطا محمد صاحب سے پوچھا کہ سنا ہے لوگ پیدل بھی سفر کرتے تھے؟

وہ تصدیق کرتے ہوئے بولے "انتہائی۔ بہت زیادہ پیدل سفر کرتے تھے۔ دس دس پندرہ پندرہ میل تو پیدل سفر کرتے تھے۔ سائیکل پر میرے بھائی کئی دفعہ لاہور سے گوجرانوالہ آئے۔ میں ایک دو دفعہ لاہور گیا خود بھی سائیکل پر۔ بیالیس میل۔"

میں نے پوچھا "راستے میں کھانے پینے کا سامان پانی وغیرہ یہ سہولتیں مل جاتی تھیں؟"

خوش ہو کر بولے "یہ اتنی سہولتیں تھیں کہ اگر کسی گاؤں میں چلے گئے ہیں تو وہاں کے آدمیوں نے یہ کہا ہے کہ اپنی روٹی کا انتظام نہ کرنا، روٹی ہم دیں گے۔"

میں نے کہا "تو یہ جو دیہات تھے چھوٹے، وہاں کتنی آبادیاں ہوا کرتی تھیں، کیسی زندگی ہوتی تھی، ذریعہ آمدنی کیا تھا؟"

میر صاحب نے کہا "ان کا ذریعہ آمدنی زمین تھی، زمین کی پیداوار سے ان کا گزر گزران تھا۔ اور بہت اچھا ان کا وقت پاس ہو جاتا تھا صرف زمین کی کمائی سے۔ کچے کوٹھے وغیرہ ہوتے تھے۔ اب تو ہر گاؤں میں جائیں گے وہاں بجلی ہو گی، کوٹھی نما مکان ہوں گے اور ٹی وی نہیں رہا اب تو کوئی وی سی آر کہتے ہیں کہ آ گئے ہیں۔ ہیں جی! وہ بھی گاؤں میں ہوں گے۔ اتنے پیسے کی بہتات ہو گئی ہے۔"

میر صاحب کی گفتگو کے آخری فقرے میں شکایت کا لہجہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جھوٹ کے بغیر!

شہر نہ دیکھو، شہر والے دیکھو

گوجرانوالہ شاید واحد ایسا شہر ہے جو خود نہیں بلکہ اُس کے شہری قابلِ دید ہیں۔ صحت مند اور ہنر مند!

نام پانے میں اس کے باشندوں کی مثال ڈھونڈنا سے اِدھر نہیں ملتی۔ دنیا کے شہر اپنی مصنوعات اور اپنا مال برآمد کرتے ہیں، گوجرانوالہ نے اپنے نامور برآمد کئے، اپنے اہلِ علم اور اہلِ فن بیرون شہر بھیجے۔

اس شہر کے بارے میں بہت کچھ سنا جاتا ہے۔ مثلاً پہلوانوں کا، باڈی بلڈروں کا اور کھلاڑیوں کا شہر ہے یا شاعروں کا، ادیبوں، دانشوروں اور مدبروں کا شہر ہے۔ اور یہ بات تو بہت سُنی کہ بہترین کاریگروں کا شہر ہے جو اپنے چھوٹے چھوٹے ورک شاپوں میں دنیا کی بڑی بڑی مشینیں بنا سکتے ہیں۔ آپ انہیں کیسی ہی مشین دکھا دیجئے، وہ آپ کو ویسی ہی مشین بنا کر دکھا سکتے ہیں۔

اس وقت پورے پاکستان میں جدید آفسٹ چھاپے خانے، ہائیڈرالک پریس، کولڈ اسٹوریج، صابن، سیمنٹ اور شکر کے پلانٹ اور طرح طرح کے کارخانے چل رہے ہیں جن کا ذرا ذرا سا پرزہ یہی گوجرانوالہ اور آس پاس کے شہروں کے مستریوں نے خود ڈھالا ہے اور ایسی ایسی مشینیں بنا کر کھڑی کر دی ہیں کہ نہ صرف ان کی شکل و شباہت پہ بلکہ کارکردگی پر بھی مغربی ملکوں کی جدید مشینوں کا گمان ہوتا ہے۔

آپ کسی نئے شہر میں جائیں اور گاڑی سے اتریں تو پہلے کسی ہوٹل کا یا عزیز و اقارب کا پتہ پوچھتے ہیں۔ میں نے گوجرانوالہ میں اتر کر یہ پوچھا کہ وہ مستری اور کاری گر کہاں ملیں گے جو ہر قسم کی مشینیں بنا دیتے ہیں۔

مہمان نواز لوگ ہیں۔ انہوں نے میری انگلی تھامی اور مجھے لے جا کر محمد صدیق صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ چھوٹے شہر کے بظاہر چھوٹے سے کاری گر ہیں لیکن صابن سازی کے بڑے بڑے پلانٹ بناتے ہیں۔

کہنے لگے کہ اپنی اس خداداد صلاحیت کے معاملے میں پاکستان کے کاری گر دنیا بھر میں مشہور ہیں بلکہ۔ آپ چاہیں تو کہہ لیں کہ بدنام ہیں۔ سات آٹھ برس اُدھر اٹلی والوں نے آکر لاہور میں صابن سازی کا ایک پلانٹ لگایا تھا۔ محمد صدیق نے اس میں ہاتھ بٹایا تھا بس!۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ خود صابن سازی کے پورے پورے پلانٹ بنانے لگے۔ کہتے ہیں کہ ایک اطالوی ماہر کو استاد کیا تھا بعد میں وہ استاد کو سلام کرنے اٹلی گئے اور مشین سازی کی صنعت دیکھنے برطانیہ پہنچے۔ اس کا بہت دلچسپ قصہ محمد صدیق صاحب نے خود سنایا:

"جب میں لندن میں گیا تو وہاں ایک ورکشاپ تھی جہاں مشینوں کو ری کنڈیشن کرتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ سوال کیا کہ آپ پاکستانی ہیں؟۔ میں نے کہا جی ہاں پاکستانی ہوں۔ تو انہوں نے بڑے مایوس لہجے میں کہا کہ آپ برا نہ منائیں۔ آپ ذرا یہاں ٹھہر جائیں تو اُس کے بعد ہم آپ کو اجازت دیں گے اندر راؤنڈ لگانے کے لئے۔ اس کی وجہ پھر ہم نے دریافت کی تو کہنے لگے کہ جی، پاکستان سے جو بھی آدمی آتا ہے اُسے ہم بالکل نئی مشینری دکھاتے ہیں اور کچھ روز بعد پاکستان جاکر دیکھتے ہیں تو وہاں بالکل ویسی ہی مشینری تیار پڑی ہوتی ہے۔ اور حقیقت ہے کہ میرے ساتھ ایسا ہوا۔ میں نے ڈیڑھ مہینہ لندن میں گزارا تو ان لوگوں نے مجھے اتنا وقت دیا کہ جو مشینری آپ دیکھنا

چاہتے ہیں اس کو دیکھ لیں لیکن آپ کو سوال پوچھنے کی اجازت نہیں۔ تو بڑی سے بڑی ورک شاپ انہوں نے مجھے دکھا دی لیکن سوال پوچھنے کی اجازت نہیں دی۔ میں باہر آگیا۔"

محمد صدیق صاحب بتا رہے تھے کہ ان کے ورک شاپ میں آٹھ دس آدمی مل کر ایک سال میں ایک پلانٹ بنا لیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اتنی لمبی مشقت کی وجہ سے کیا وہ پلانٹ بہت مہنگا نہیں پڑتا؟

انہوں نے کہا "نہیں۔ جو مشین غیر ممالک میں بنتی ہے اس کے مقابلے میں ہماری لاگت بہت کم آتی ہے۔ مثلاً باہر سے ایک مشین ہمیں تیس لاکھ کی ملتی ہے تو ہماری دس لاکھ میں بنتی ہے۔ اتنے آدمی لگانے کے باوجود بھی اور وسائل نہ ہونے کے باوجود بھی اُس سے سستی بنتی ہے۔"

میں نے پوچھا کہ مشین بنانے کا آپ کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ ایک ایک پُرزے کو دیکھ کر ویسا کا ویسا بناتے جاتے ہیں یا کچھ اور کرتے ہیں؟۔

انہوں نے کہا "جی ہاں۔ اس طرح ہوتا ہے کہ جتنا چھوٹا کام ہوتا ہے وہ ہم اپنی ورکشاپ میں خود کر لیتے ہیں باقی جو بڑا کام ہوتا ہے جو ہم سے نہیں ہو سکتا اُسے دوسری ورک شاپوں میں لے جاتے ہیں۔ سیالکوٹ میں جگہ ملی۔ لاہور میں جگہ ملی۔ جیسی سہولت ہمیں جہاں ملی وہاں سے کام کرا لیا۔ وہ پھر لا کر یہاں جوڑ لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ اِس وقت گوجرانوالہ میں یہاں کے کاریگر کس کس طرح کی مشینیں بنا رہے ہیں؟

محمد صدیق صاحب نے کہا "ہائیڈرالک پریس بناتے ہیں۔ لیتھ مشین بناتے ہیں، اچھی قسم کی لیتھ مشین بناتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی آدمی ہیں جو اعلیٰ قسم کی مشینیں بناتے ہیں۔ دیکھنے والا نہیں بتا سکتا کہ یہ پاکستان میں بنی ہیں یا کسی صنعتی ملک میں۔"

میں نے پوچھا کہ اَور کیا بن رہا ہے؟

انہوں نے بتایا" الیکٹرک کے سوئچ وغیرہ بنتے ہیں۔ موٹریں بنتی ہیں۔ پمپ بنتے ہیں۔ مثلاً جو باہر سے امپورٹ ہو کر آتے ہیں ان کی بالکل کاپی ٹو کاپی کر کے۔ تو بڑے اچھے چل رہے ہیں۔ بس یہ ہے کہ جو بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہے یا کوئی کہے ہم اُسی طرح کا تیار کر دیتے ہیں"

میں نے کہا کہ ٹیکسٹائل کی مشینیں، شکر سازی اور چھاپے خانے کی مشینیں بھی بن سکتی ہیں؟ وہ بولے " سیمنٹ کی مشینری تمام یہاں پر بنتی ہے۔ شوگر مل کے پارٹس تمام یہاں پر بنتے ہیں۔ کولڈ اسٹوریج کے برف خانے جتنے بھی ہیں یہیں بنتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ جو بیڈفورڈ کا ٹرک ہے، سوائے انجن کے باقی جتنی بھی چیزیں ہیں ہمارے لاہور میں تیار ہوتی ہیں لیکن وہ یہ کرتے ہیں کہ نام اُن ہی کا دیتے ہیں، بناتے وہ خود ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا نام لینے سے چیز کی قدر کم ہو جاتی ہے اس وجہ سے ان کو مجبوراً غیر ملکی فرم کا نام دینا پڑتا ہے۔

میں نے محمد صدیق صاحب سے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ واقعی غیر ملکی مشینوں کا ہو بہو چربہ اتار دیتے ہیں۔

شرما کر بولے " جی نہیں۔ ذرا سی تبدیلی کر دیتے ہیں تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ یہ ہماری نقل ہے"

محمد صدیق صاحب کے چھوٹے سے ورکشاپ میں ان کا میٹرک پاس بیٹا اور تقریباً آٹھ دوسرے مستری کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بڑی بڑی جدید مشینیں بنانے والے ان کاریگروں کا اپنا معیار زندگی کیسا ہے؟

کہنے لگے " پہلے یہ کام پہ پیدل آتے تھے، پھر سائیکلوں پر اور اسکوٹروں پر آنے لگے۔ اب کئی کے پاس اپنی کاریں ہیں"

تو یہ ہے گوجرانوالہ اور آس پاس کے کاری گروں کا قصہ۔ کوئی باضابطہ اور منظم طور پر ان لوگوں سے کام لے تو راوی اور چناب کے درمیان دوسرا جاپان بن سکتا ہے۔

محمد صدیق صاحب کے اطالوی استاد نے بھی اُن سے یہی کہا تھا کہ تمہاری حکومت تم سے تعاون کرے تو تم لوگ ہم سے بھی آگے بڑھ سکتے ہو۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔

گوجرانوالہ کی اس خوبی میں کوئی مبالغہ نہیں کہ پہلوانوں کا شہر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں اب تک اکھاڑے موجود ہیں جن میں کسرت اور کشتی ہوتی ہے۔ استاد کناروں پر بیٹھ کر شاگردوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ یہ امرت سر سے نکالے ہوئے گوجر تھے جنہوں نے آکر گوجرانوالہ آباد کیا تو بہت ممکن ہے کہ دودھ اور پہلوانی سے رغبت کی یہ روایت امرت سر سے آئی ہو۔

باڈی بلڈنگ اور ویٹ لفٹنگ میں بھی گوجرانوالہ کے نوجوانوں نے نام پایا ہے۔ کتنے ہی مسٹر پاکستان، اسی شہر کا دودھ پی کر اس اعزاز کو پہنچے۔ ہاکی کے مردِ میدان میر لطیف یہیں کے تھے۔ انہیں کے بارے میں مشہور تھا کہ گیند لے کر اس طرح دوڑتے تھے کہ لوگ کہتے تھے ان کی ہاکی میں سریش لگا ہے۔ فٹ بال، کرکٹ اور کبڈی میں گوجرانوالہ نے درجنوں کے حساب سے مشہور کھلاڑی پیدا کئے ہیں۔ پاکستان کے بہت اچھے ایتھلیٹس گوجرانوالہ کے ہیں۔ بیڈمنٹن جدید کھیل ہے مگر یہاں کے کھلاڑی اس میں بھی سبقت لے گئے۔ اَور تو اَور جدید شطرنج، جس کا دودھ اور ورزش سے بہت کم تعلق ہے گوجرانوالہ میں اس طرح فروغ پا رہا ہے کہ اس شہر کے نوعمر لڑکے بین الاقوامی مقابلوں میں جانے لگے ہیں۔

اور یہ سب اس شان سے ہے کہ کسی کو نہ کہیں سے مدد ملتی ہے نہ باقاعدہ کوچنگ۔ لڑکے اپنا ہی وقت، اپنا ہی پیسہ اور اپنی ہی صلاحیتیں لگا کر اپنی فطری استعداد کو ابھار

لیتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں کھیلوں کے فروغ سے تعلق رکھنے والے میاں محمد اسمٰعیل شمیم صاحب اُس روز بتا رہے تھے کہ اسکولوں کالجوں میں کھیلوں کے فنڈ آج تک سنہ ۱۹۳۰ء کی شرح کے مطابق ہیں، مثلاً کرکٹ گیند کے لئے اسکول فنڈ میں آج بھی آٹھ آنے اور بارہ آنے لکھے ہوئے ہیں جب کہ یہ گیند اب ساٹھ روپے کی آتی ہے۔

ادھر پنجاب اسپورٹس بورڈ نے کچھ کام شروع کیا ہے۔ مثلاً ضلع میں جونیئر چیمپئن شپ کے مقابلے ہونے لگے ہیں مگر بچارے کھلاڑی اپنی تربیت آپ کر کے آتے ہیں۔ انہیں باقاعدہ کوچنگ کی سہولت نصیب نہیں، وقت، خوراک اور سرمایہ تو دور کی بات ہے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ اگر مخیّر افراد اور ادارے ہاتھ بٹائیں اور حکومت مدد کرے تو یہاں ملک کے بہترین کھلاڑی تیار ہو سکتے ہیں۔

مگر یہ محض تن بدن والوں کا نہیں، اعلیٰ ذہانت اور تخلیقی صلاحیت والے لوگوں کا شہر بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شہر باصلاحیت لوگ پیدا کرتا رہا اور قریبی شہر لاہور انہیں اپنی جانب کھینچتا رہا لیکن گوجرانوالہ کے لوگ اپنے ناموروں کی فہرست گنواتے ہیں تو ان کی سانس نہیں ٹوٹتی۔

ارشد میر صاحب اگرچہ ایڈووکیٹ ہیں مگر صاحبِ طرز ادیب اور انشائیہ نگار ہیں۔ شہر کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں اور گوجرانوالہ کے نئے پرانے باشندوں کو یوں جانتے ہیں جیسے وہ سب ان کے دیرینہ رفیق رہے ہوں۔ میں ارشد میر صاحب سے کہیں یہ پوچھ بیٹھا کہ ذرا گوجرانوالہ کے نامور لوگوں کے بارے میں تو بتائیے:

"مثلاً اگر صحافت کا ذکر کیا جائے تو مولوی محبوب عالم صاحب جو پیسہ اخبار کے ایڈیٹر تھے، انشاء اللہ خاں انشا جو وطن اخبار کے ایڈیٹر تھے، دیوان سنگھ مفتون جو ریاست اخبار نکالتے رہے، اور سب سے بڑھ کر بابائے صحافت

مولانا ظفر علی خاں، ان سب کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے۔

ہماری عدلیہ میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ایس اے رحمان جو خود بڑے مترجم، شاعر، ادیب اور مفکر بھی تھے، اُن کا تعلق، جسٹس یعقوب علی کا تعلق، جسٹس عبدالعزیز خاں کا تعلق، عطا اللہ سجاد صاحب جسٹس رفیق تارڑ اور جسٹس محمد شریف جو کہ یہاں پاکستان بننے سے پہلے ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ ان کا تعلق بھی اسی گوجرانوالہ سے ہے۔

اسی طرح ادب میں آیئے تو جب ہم آزاد شاعری کی بات کرتے ہیں تو بات ن۔م۔راشد سے ہوتی ہوئی میراجی اور آج کے اختر حسین جعفری تک آتی ہے۔ جن کی کتاب آئینہ خانہ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے بعد مزاح میں راجا مہدی علی خاں اور مجید لاہوری بڑی معروف شخصیات ہیں۔

غلام احمد پرویز صاحب جو بڑے مفکر ہو گزرے ہیں، ان کا تعلق بھی اسی ضلع سے تھا۔ ہمارے الطاف گوہر صاحب کا تعلق بھی گوجرانوالہ سے ہے۔ ہمارے پاکستان نیشنل سنٹر کے آج کل جو ڈائریکٹر جنرل ہیں منیر احمد شیخ صاحب، ان کا تعلق بھی گوجرانوالہ سے ہے۔ عبدالحمید عدم صاحب بھی اسی دھرتی کے باشندے ہیں۔"

طوالت کے خوف نے مجھے مار رکھا جو ارشد میر صاحب کی یہ فہرست مختصر کرنا پڑی ورنہ اس میں نعت گوئی، افسانہ، سفرنامہ، فن تاریخ نویسی، انشائیہ نگاری، مصوری یہاں تک کہ علوم آثار قدیمہ کے میدان میں نام پانے والوں کے اتنے بہت سے نام شامل تھے کہ اس کی تکمیل کے لئے خود میر صاحب کے بقول "کئی گھنٹے درکار ہیں۔"

ہاں اس فہرست میں ایک بڑا نام رہ گیا، ایسا بڑا نام کہ سرزمین پنجاب رہتی دنیا تک اُس پر ناز کرے گی۔ وہ جو ہیر تھی، جو رانجھا رانجھا کرتے کرتے آپ ہی

رانجھا ہوگئی تھی، اُس کی داستان میں عشق کے سو رنگ گھولنے والے وارث شاہ کا تعلق بھی اسی گوجرانوالہ کے علاقے سے تھا، اِسی سرزمین سے تھا جس کی خاک میں محبتوں کے موتی آج بھی ملے ہوئے ہیں۔ بس وہ نگاہ چاہیئے جو انہیں دیکھ لے، انہیں چن لے۔

ایک گاؤں، ایک شہر

میں اِس وقت جرنیلی سڑک سے پندرہ بیس میل اندر ایک نسبتاً بڑے گاؤں سید نگر میں بیٹھا ہوں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ سیّدوں کی بستی ہے۔ میں جہاں بیٹھا ہوں یہ بہت پُرانے اور بہت بڑے امام باڑے کا لمبا چوڑا دالان ہے جس کے ایک کنارے پر دو بڑی بڑی چارپائیاں پڑی ہیں۔ بیچ میں حُقّہ رکھا ہے۔ چارپائیوں پر آٹھ دس دیہاتی بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب زمینوں کے مالک اور باقی اُن کے ملازم ہیں۔ کاشت کاری کی بات ہو رہی ہے جس میں گرماگرمی بھی آگئی ہے۔

میں گوجرانوالہ سے ایک پرائیویٹ بس میں بیٹھ کر یہاں پہنچا ہوں۔ بلکہ پہلے علی پور چٹھہ پہنچا اور وہاں سے تانگے پر بیٹھ کر سید نگر آیا ہوں۔ اجنبی دیکھ کر تانگے والے نے دوگنے پیسے لے لئے ہیں۔ سید نہیں ہے شاید!

یہ علاقہ پاکستان کا بہترین چاول پیدا کرتا ہے۔ قریب کہیں دریائے چناب ہے۔ راستے میں جابجا نہریں ہیں جن میں تازہ، ٹھنڈا اور میٹھا پانی جھاگ اُڑا رہا ہے۔ دھان کے کھیتوں میں پانی بھرا ہے اور ہر طرف کسانوں کے ٹریکٹر، ٹریلر اور ٹرک نظر آ رہے ہیں۔

سید نگر میں اس لئے آیا ہوں کہ کوئی گاؤں دیکھنا چاہتا تھا، گاؤں کی زندگی دیکھنا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج کا گاؤں میرے تصوّر سے کتنا مختلف ہے۔ سید نگر بڑی

خوبیوں کا گاؤں نکلا۔ بظاہر یہ اُس وقت کی آبادی ہے جب دہلی میں مغلوں کا چل چلاؤ تھا۔ پنجاب کے بیچوں بیچ اس بستی میں بارہہ کے سیّد آباد ہیں۔ خود بارہہ، یوپی کے ضلع مظفر نگر میں ہے۔ یہ اہل سادات وہاں سے لاکر کبھی یہاں بسائے گئے ہوں گے۔ گاؤں کی پرانی مسجد کے کتبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخری دنوں کے مغل بادشاہ فرخ سیر کا اس بستی کی تعمیر میں کچھ دخل رہا ہے۔

جن لوگوں نے تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہوں گے کہ اورنگ زیب کے مرتے ہی اس کی اولادوں نے تخت و تاج کے لئے چھینا جھپٹی شروع کر دی تھی۔ ہر ایک خود کو بادشاہ قرار دے رہا تھا اور دوسرے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کوئی چھ سال بعد فرخ سیر کی باری آئی۔ اُسے بارہہ کے دو سیّد بھائیوں حسن علی اور حسین علی کی حمایت حاصل تھی جنہوں نے سیاست کی شطرنج پر ایسی بازی چلی کہ فرخ سیر دہلی کا بادشاہ بن گیا۔

شاید اُسی زمانے میں بارہہ کے اہلِ سادات گوجرانوالہ کی شاداب اور زرخیز زمینوں میں بسائے گئے۔ یہاں مسجدیں بنیں، امام باڑے بنے اور یقیناً بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوں گی جن میں سے کچھ ابھی تک باقی ہیں اور کچھ کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ وہی سادات یہاں ابھی تک آباد ہے اور علاقے میں اُس کا وہی احترام ہے جو اِس طرف سیّدوں کا ہوتا ہے۔

اس کا قصہ بھی سن لیجیے۔ میں علی پور چٹھہ سے تانگے میں بیٹھ کر سید نگر آ رہا تھا اور تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں میرا نام پوچھا اور نام سنتے ہی تانگہ رکوایا، نیچے اتر گئے اور کہنے لگے کہ آپ سیّد ہیں، آپ آگے بیٹھیے۔ مجھ سے سادات کی بے حرمتی نہیں ہو سکتی۔

میں بہت ہنسا ، انہیں بہت سمجھایا مگر انہوں نے ایک نہ سُنی۔

یہاں سید نگر میں دو بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ دونوں بھی سیّد ہوں گے۔ گاؤں کے بچے بچے کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی غیر سیّد گرمیوں میں مکان کی چھت پر یعنی سادات کی قبروں سے زیادہ اونچائی پر سو جائے تو رات کسی وقت اس کی چارپائی الٹ جاتی ہے ، لہٰذا اب چارے نیچے دالانوں میں سوتے ہیں۔

یہاں کے اہلِ سادات بتا رہے ہیں کہ یہاں کتنے بڑے پیمانے پر محرّم منایا جاتا ہے۔ اس کی کتنی دھوم ہوتی ہے اور دور دور سے اتنی خلقت سید نگر آجاتی ہے کہ دس روز تک گھروں میں پاؤں ٹکانے کی جگہ بھی نہیں رہتی ۔ اور یہ کہ ان کے بزرگ کوئی ڈھائی سو سال پہلے ضلع مظفر نگر سے یہاں آئے تھے ۔ اور یہ کہ ان کے گھروں کی بڑی بوڑھیاں گھروں کے اندر آج تک مظفر نگر کے لب ولہجہ میں بات کرتی ہیں۔ باہر سب اہل پنجاب نظر آتے ہیں۔ لیکن وہی زیدیوں کا ناک نقشہ ، وہی روپ رنگ اور وہی شرافت اور متانت ہے۔ خوش قطع ، خوش وضع۔ سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں۔ نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے اور ملازمت کے لئے روزانہ وزیر آباد اور گوجرانوالہ تک جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں۔

گاؤں میں بجلی ہے ، گھروں میں ٹیلیویژن ہیں۔ زیادہ تر پرانے لیکن پختہ مکان ہیں۔ میرے میزبان نے اپنے ایک عزیز کے گھر میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا ہے جو شاید خلیج کے کسی ملک یا سعودی عرب میں کام کرتے ہیں۔ نہایت اچھا جدید طرز کا مکان ہے۔ پمپ کے ذریعہ پانی اوپر چڑھتا ہے اور حمام میں شاور ہے ، واش بیسن ہے ، فلش ہے اور ٹونٹیوں میں تیز پانی آتا ہے۔

دالان میں پلنگ ڈال کر بچھونے کر دیئے گئے ہیں تاکہ سفید تکیے اور چادریں خوب ٹھنڈی ہو جائیں۔ فضا میں کثافت نہیں لہٰذا آسمان ستاروں سے بھرا پڑا ہے جن کے ایک جھرمٹ

کو دیکھ کر میں نے کہا کہ کچھ دیکھا دیکھا سا لگتا ہے ۔ ایک بچّی نے بتایا کہ یہ کہکشاں ہے ۔

کچھ دنوں بعد عید کا چاند ہوگا اور اگر بادل نہ ہوئے تو ساری آبادی ایک ساتھ چاند کو دیکھ کر ایک ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے گی اور کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ کہ کسی اختلاف اور جھگڑے کے بغیر گاؤں کی ساری آبادی ایک ہی دن عید منائے گی ۔

کچھ دیر پہلے روزہ کھلا تھا ۔ اذان ہوئی ، لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ۔ لوگوں نے اپنی سادہ سی خوراک کھائی اور خدا کا شکر ادا کرکے عبادت میں اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے پھر صبح سحری کے لئے نہ سائرن بجائے گئے ، نہ لاؤڈ اسپیکروں پر کسی کی غیرتِ ایمانی کو للکارا گیا ۔ لوگ خاموشی سے اٹھے ۔ کچھ تھوڑا بہت کھایا ۔ نماز پڑھی اور دن کا آغاز ہوگیا ۔

اس سے ایک مختلف منظر میں نے ایک شہر میں دیکھا جو مجھے عمر بھر یاد رہے گا ۔ یہی رمضان کے دن تھے ۔ میں رات گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک شب کے سنّاٹے اور سب کے کانوں کو چیرتا ہوا سائرن بجا ۔ شاخوں پر سوئے ہوئے پرندے پر پھڑپھڑانے لگے ۔ بچے رونے لگے ۔ کتے بھونکنے لگے اور سامنے والا حلوائی جو رات دیر تک دودھ کا کڑھاؤ مانجھنے کے بعد سویا تھا ، منہ ہی منہ میں واہی تباہی بکنے لگا ۔ جب ذرا خاموشی ہوئی تو مسجد کے مائیکروفون کو انگشتِ شہادت کے ناخن سے کھٹ کھٹا کر اُسے آزمانے کی وہی جانی پہچانی آواز آئی ۔ اور پھر جو پندرہ پندرہ منٹ کے وقفے سے اعلان ہوئے ان کا حال خدا جانتا ہوگا یا شہر والے ۔

سب سے پہلے یہ اعلان ہوا کہ ہم ائرکنڈیشنڈ مسجدِ صحرا سے بول رہے ہیں ۔ آپ کے لئے یہ سائرن ہم نے خاص طور پر جاپان سے درآمد کیا ہے ۔ مسجد صحرا کی گھڑیوں میں اِس وقت اتنے بجے ہیں ۔ خود بھی اٹھیں اور اپنے پڑوسیوں کو بھی اٹھائیں ۔ اور یہ کہ اب ہم آپ سے پندرہ منٹ بعد مخاطب ہوں گے ۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہی صدا آئی : ہم ائرکنڈیشنڈ مسجد صحرا سے بول رہے ہیں ،

وغیرہ وغیرہ۔ تیسرے نشریئے میں اِس سارے تعارف کے بعد کہا گیا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ابھی تک صرف قاسمی صاحب، وکیل صاحب اور انصاری صاحب کے گھروں میں روشنی ہوئی ہے۔ خود بھی اٹھیں، اپنے پڑوسیوں کو بھی اُٹھائیں۔

پھر اگلے نشریئے میں اعلان ہوا کہ آپ جانتے ہیں کہ تین مزدور مسجد کے بالائی حصّے کا فرش بنانے میں رات دن مصروف ہیں۔ اپنے گھروں سے ان کے لئے سحری کا کھانا مسجد پہنچائیے۔

اس کے بعد اعلان ہوا کہ بڑے افسوس کی بات ہے صرف ایک گھر سے کھانا آیا ہے۔ ائرکنڈیشنڈ مسجد صحرا کی گھڑیوں کے مطابق سحری کا وقت ختم ہونے میں صرف پون گھنٹہ رہ گیا ہے۔ خود بھی اُٹھئے اپنے پڑوسیوں کو بھی اٹھائیے، وغیرہ وغیرہ۔

اُس رات مجھے وہ راتیں بہت یاد آئیں جب گانے والوں کی ایک ٹولی لالٹینیں لئے ہاتھوں میں بیاض اٹھائے آتی تھی۔ ہمارے گھر کے سامنے کھڑے ہوکر سحر کی بیداری کا نغمہ گاتی تھی اور اسی طرح گاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ پھر عید کے روز وہی ٹولی دن میں آتی تھی۔ ابّا اُسے آٹھ آنے دیا کرتے تھے اور سلام کرتی ہوئی چلی جاتی تھی، مگر آخری بار جو گئی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی۔

گزرے دنوں اور اچھی یادوں کی ٹولی کے ساتھ چلتا چلتا اب میں ایک اور شہر میں نکلا۔ لاہور کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس نے نہیں دیکھا گویا وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ سند لینے میں بھی جرنیلی سڑک کے قدم سے قدم ملاتا ہوا وہاں پہنچا۔ وہ سنہ ۱۹۸۵ء تھا۔ مجھ سے پورے ایک سو برس پہلے ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل کی بیوی لیڈی ڈفرن بھی لاہور پہنچی تھیں اور وہاں سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا: اماں! لاہور میں چلو تو یوں لگتا ہے جیسے باغوں میں چلے جارہے ہوں، اندرونِ شہر باغوں کو چھوڑیئے، اس شہر کے گرد پانچ میل لمبا ایک باغ ہے جو شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے اور

پورے لاہور کے گرد حلقہ کئے ہوئے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت لیڈی ڈفرن نے لاہور دیکھا اُس وقت یہ شہر بری طرح اجڑ چکا تھا۔ اصل لاہور اُن غیر ملکیوں نے دیکھا تھا جو مغلوں کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لاہور دراصل ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں کہیں کہیں آبادی ہے۔

لاہور کی تاریخ میں ستر سے زیادہ باغوں کا ذکر ملتا ہے۔ وقت بدلا تو زیادہ تر میں ہل چل گئے۔ اُن کی بارہ دریوں اور محلوں کا حسن ان کے چہرے سے نوچ لیا گیا۔ جو کچھ لیڈی ڈفرن نے دیکھا وہ آثار قدیمہ کے مشہور ماہر ڈاکٹر سیف الرحمان صاحب کے بقول اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے لاہور کی بھٹکتی ہوئی روح تھی۔

لاہور کے اجڑنے کی کہانی کے برعکس اس کے بسنے کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ پہلے پہل کس نے بسایا اور کب بسایا۔ اس کے تو بہت سے قصے ہیں مگر جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر اپنے حملے شروع کئے اُس وقت لاہور معمولی سا قصبہ تھا۔ پنجاب کی راج دھانی کہیں سیالکوٹ کے پاس تھی۔ پھر ہوا یہ کہ محمود نے اپنی ہی صف میں کھڑے ہونے والے ایاز کو لاہور کا قاضی القضاۃ بنایا۔ ایاز نے اس شہر کو پنجاب کا صدر مقام قرار دیا۔ غزنیں کے بادشاہ کا یہ غلام لاہور ہی میں مرا اور یہیں دفن ہوا۔ باغوں کا شہر تھا، ایاز کی قبر ایک دلکش باغ میں بنائی گئی مگر بعد میں زمانے کی بدنصیبی نے وہ باغ اجاڑ کر وہاں ٹکسال بنائی۔ اب ایاز کی قبر پرانے لاہور کے ایک گوشے میں چھپی ہے۔ کوئی فاتحہ پڑھنے بھی نہیں جاتا۔ لوگ جانتے تک نہیں کہ رنگ محل کے پاس جس جگہ ٹکسالی بازار، کسیرا بازار اور سوہا بازار آکر ملتے ہیں وہیں ایاز کی قبر موجود ہے۔

ملک ایاز کے بعد دولت خان لودھی نے لاہور کو نکھارا اور سنوارا۔ اُس کا باغ، فصیل، سرائے، باؤلی سب کچھ موجود تھا۔ اب نہیں ہے۔

مغلوں کو لاہور سے بہت لگاؤ تھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں کے علاوہ کامران اور

دارا شکوہ جیسے شہزادوں نے اُسے بڑے قرینے سے سجایا۔ اکبر یہاں پندرہ برس رہا اور لاہور کو نہ صرف حسن بلکہ علم کی دولت سے بھی مالا مال کیا۔ یہیں ملا احد نے تاریخِ الفی مکمل کی، فیضی نے مثنوی نل ودمن لکھی اور بدایونی نے رامائن کا ترجمہ کیا۔ جہانگیر نے تو لاہور کو دارالسلطنت قرار دیا اور اسی شہر میں دفن ہونا پسند کیا۔ اس کی ملکہ نورجہاں نے بھی یہیں کی خاک کو سب سے بہتر جانا۔ شاہ جہاں کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے بیٹے دارا شکوہ نے یہاں بہت وقت گزارا اور اپنے پیر میاں جیو کی خدمت میں رات دن ایک کئے۔ خدا کے وہی ولی کہ جو میاں میر کہلاتے ہیں اور گفتگو میں ان کا نام بھی آجائے تو اہلِ علم آج بھی جبینِ عقیدت جھکا دیتے ہیں۔ اور داتا گنج بخش کا نام نامی تو لاہور سے یوں وابستہ ہے کہ وہ نہ ہوتے تو لاہور لاہور نہ ہوتا۔

اورنگ زیب کی بات کئے بغیر لاہور کی بات پوری نہیں ہوتی۔ وہ اگرچہ جنوبی ہند کی سیاست میں اُلجھا رہا اور صرف دو تین مرتبہ لاہور آیا لیکن اس شہر کو اُس نے بادشاہی مسجد جیسی عبادت گاہ عطا کی جو لاہور کی انگشتری میں نگینے کی طرح جڑی ہے اور اس کے قریب اکبر اور شاہ جہاں کا قلعہ، رنجیت سنگھ کی سمادھی، اقبال کی آخری آرام گاہ اور قرارداد پاکستان کی یادگار۔ یہ سب تاریخ کی نشانیاں ہیں جو سمٹ کر ایک چھوٹے سے خطے میں سما گئی ہیں کہ دنیا اُسے لاہور کے نام سے جانتی ہے۔

پرانے لاہور کا حال سننے کو جی چاہا تو شہر میں میاں امیرالدین صاحب سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی نہ تھی۔ میاں صاحب کا گھرانا بہت پرانا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں خود ان کی عمر چورانوے برس تھی، ماشاءاللہ۔ ۱۹۱۱ء میں وہ گریجویٹ ہوئے تھے۔ خلافت تحریک میں وہ سرگرم تھے اور پاکستان کی تحریک میں آگے آگے تھے۔ میں میاں امیرالدین صاحب سے ملا تو خوشی ہوئی۔ شہر لاہور کی طرح وہ بھی ضعیفی کے باوجود بہت زندہ دل تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی نوجوانی کے دنوں میں شہر لاہور کتنا بڑا تھا؟

میاں صاحب نے بتایا "اس وقت آبادی سرکلر روڈ کے اندر تھی - آبادی لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہو گی - ہیرا منڈی سے باہر قلعے کی جنوبی دیوار کے میدان میں گیدڑ چلتے پھرتے رہتے تھے اور چھوٹا راوی کے پل کے پاس جنگلی مرغابیاں اترا کرتی تھیں۔ اب تو جہاں تک نگاہ جاتی ہے وہاں تک آبادی جاتی ہے۔"

بتانے لگے کہ شروع میں کھاتے پیتے گھرانے ہندوؤں اور خصوصاً کشمیری پنڈتوں کے تھے۔ مسلمانوں کے صرف چار پانچ صاحب حیثیت خاندان تھے۔ ساری تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت مسلمان یا تو سبزی بیچتے تھے، یا درزی تھے یا موچی تھے اور ان کی مالی حالت ایسی تھی کہ کم سے کم نوّے فی صد مسلمانوں کی جائیداد گروی ہو گئی تھی۔ اُن ہی دنوں ایک بُلاقی ساہوکار تھا۔ میرا اچھا واقف تھا۔ برا آدمی نہیں تھا۔ اپنی بات پر اور معاملے پر قائم رہتا تھا۔ میں نے اس سے کہہ سن کر بڑے بڑے لوگوں کے ہزاروں روپئے چھڑوا دیئے۔ تعلیم کی یہ حالت تھی کہ میں ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا اُس وقت پانچ سو میں سے صرف اسی طالب علم مسلمان تھے۔ استادوں میں صرف ایک مولوی ابراہیم عربی کے اُستاد تھے باقی سب ہندو اور انگریز تھے۔

میاں امیر الدین صاحب اپنے دادا کے بارے میں بتا رہے تھے "لاہور گورنمنٹ کالج ۱۸۷۵ء میں انہوں نے بنایا تھا۔ بڑی ہی ٹھوس عمارت ہے۔ وہ ٹھیکیدار تھے مگر بہت دیانت دار تھے۔ بعد میں جب انہوں نے ٹھیکے داری چھوڑ دی تو میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کام کیوں چھوڑ دیا؟ کہنے لگے: دیکھو بیٹا، جب ہم ایمانداری سے کام کرتے تھے، اس میں فائدہ ہوتا تھا۔ اب بغیر بے ایمانی کے فائدہ نہیں ہوتا، لہٰذا میں نے چھوڑ دی۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے "شاید ان کی حلال کی کمائی تھی کہ ہم اب تک کھا رہے ہیں۔"

پھر خود بتانے لگے کہ میرے دادا ان پڑھ تھے۔ ایسی باتیں اس زمانے میں کوئی نہیں بتاتا۔ کہنے لگے کہ دادا حساب کتاب بہت اچھا رکھتے تھے۔ میں زیادہ تر ان ہی کے ساتھ

رہا۔ ان کے ساتھ میں مسجد جاتا تھا، ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ میں ان کا چہیتا تھا۔ میری شادی پر انہوں نے علاقے کے ہر شخص کو دو سیر مٹھائی تقسیم کی تھی۔ بہت سستا زمانہ تھا، شادی کے کھانے پر فی کس چار آنے خرچ ہوتے تھے جس میں پلاؤ، دہی، قورمہ، زردہ اور فرنی وغیرہ ہوتی تھی۔ اب سو روپے فی کس صرفہ آتا ہے اور اتنا اعلیٰ کھانا نہیں ملتا۔

کھانے کے بعد میاں صاحب نے کھانے والوں کا حال بھی مزے لے کر سنایا۔ کہنے لگے "اُس وقت لوگوں میں عزتِ نفس بہت تھی، شادی بیاہ میں دسترخوان بچھائے جاتے تھے اور اُن پر کھانا چُن دیا جاتا تھا۔ کیا مجال کہ کوئی مہمان کھانے کو ہاتھ بھی لگائے۔ صاحبِ خانہ کہتا تھا "بسم اللہ"۔ تب کھانا شروع ہوتا تھا۔ اور آج کل دیکھئے، لوگ ایک دوسرے کے آگے سے ڈونگے کھینچتے ہیں"

میاں امیرالدین صاحب تحریکِ پاکستان میں پیش پیش تھے۔ لاہور میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ پاکستان منظور ہونے کا منظر انہوں نے بہت قریب سے دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ اُس کے بعد مسلمانوں کی کیا کیفیت تھی۔ کہنے لگے "بات یہ ہے کہ اس سے پہلے مسلمانوں کے پاس کوئی OBJECTIVE نہیں تھا، وہ مل گیا۔ پھر تو کیفیت بالکل بدل گئی ہر طرف "لے کے رہیں گے پاکستان" کا نعرہ تھا۔ ایک روز ہم لوگ میاں امین الدین کے ہاں جمع تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ باتوں میں جوں ہی پاکستان کا نام آیا، میاں امین الدین کی چھوٹی لڑکی چلائی: "لے کے رہیں گے پاکستان!"

یہ کہہ کر میاں صاحب دیر تک خوش ہو کر ہنستے رہے۔

چھوٹے بچے کی طرح۔

لاہور لاہور تھا

لاہور والے 'زندہ دلان پنجاب' کہلاتے ہیں۔ اس خطاب میں شک یوں بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ خطاب اپنے وقت کے سب سے بڑے زندہ دل، سرسید احمد خاں نے دیا تھا۔ یہ بات ۱۸۸۴ء کی ہے۔

اس کے ایک سو ایک سال بعد میں نے لاہور کو دیکھا تو ویسا ہی زندہ دل پایا۔ زندگی کو ایسا جی کھول کر کس نے برتا ہوگا۔

جب دوسری بستیوں کا یہ حال ہے کہ دیکھ کر دل ڈھہا جائے ہے۔ لاہور ایسا جیتا جاگتا نگر ہے جو لاکھ اجڑا پھر بھی آباد ہے۔

شام ہوتی ہے تو لوگ گھروں سے باہر آگئے ہیں اور وہ بھی سرشاری کے عالم میں۔ لوگ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، باغوں کو جا رہے ہیں، سواریوں پر بیٹھے ہیں، مصوری کر رہے ہیں، ساز بجا رہے، ناٹک ہو رہا ہے، موسیقی کی محفلیں سجی ہیں، علمی مباحثے ہو رہے ہیں اور کتابیں پڑھی جا رہی ہیں۔

یہی لاہور والے تو ہیں کہ ادھر بارش کا پہلا چھینٹا پڑا اور یہ تانگوں میں لد پھند کر شالامار یا جہانگیر کے مقبرے یا باغ جناح کی طرف چل پڑے۔ ساتھ میں کھانوں سے بھرے برتن ہیں۔ آموں سے بھری پیٹیاں ہیں اور صرف یہی نہیں، ان کے ساتھ طبلے

بھی ہیں اور ہارمونیم بھی۔ اور باغوں میں ہر طرف ٹولیاں بیٹھی ہیں، لوگ گا رہے ہیں، کھیل رہے ہیں، کھانے پر چھینا جھپٹی کر رہے ہیں اور شاخوں پر جھولے ڈال کر جھول رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ پوری بارش کا انتظار بھی نہیں کیا۔ ایک ذرا سا چھینٹا پڑا اور آدھا لاہور گھروں سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

کھانے پینے کا تو یہ حال ہے کہ میں رکشہ پر بیٹھ کر کہیں جا رہا تھا، معلوم ہوا کہ آگے مجمع کی وجہ سے سڑک بند ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کڑھاؤ سے گرم جلیبیاں نکل رہی ہیں یا کھولتے ہوئے سموسے اتر رہے ہیں اور سامنے کھڑا ہوا مجمع کھانے میں منہمک ہے۔

سکھوں کے جانے کے بعد دہلی سے بہت کچھ لاہور آیا چنانچہ نہاری بھی آئی، کہتے ہیں کہ اب لاہور میں نہاری کی سو سے زیادہ دکانیں ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک روپے کی دو نان اور پچاس پیسے کی نہاری مل جایا کرتی تھی اور بے شمار غریبوں کا پیٹ بھرا کرتا تھا۔ عمدہ قسم کے چاول پر ڈھیروں پڑی ہوئی دال کی پلیٹ اب بھی دو روپے میں مل جاتی ہے۔ میرے ایک دوست مجھے اندر کہیں گلیوں کے ایک تنگ چائے خانے میں لے گئے۔ وہاں بھی بڑا مجمع تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں بہترین کشمیری چائے ملتی ہے۔

چونکہ لاہور ازل سے باغوں کا شہر رہا ہے اس لئے باغوں میں جانے کی جیسی روایت لاہور میں ہے اور کہیں نہیں، حسن اتفاق سے ادھر اس علاقے کو کچھ ایسے حکام مل گئے جنہوں نے شہر میں بڑے بڑے باغ لگا دیئے۔ ماڈل ٹاؤن کے درمیان جو بہت بڑی زمین خالی پڑی تھی اس میں دائرہ نما پارک بن گیا ہے۔ ملک میں گھوڑ دوڑ بند ہوگئی تو لاہور والوں نے لق ودق ریس کورس گراؤنڈ کو باغ بنا دیا۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں گلشن اقبال بن گیا ہے۔ لارنس گارڈن تو پہلے سے تھا مگر اُسے باغ جناح کا نام دینے کے بعد صحیح معنوں میں گل و گلزار بنا دیا گیا ہے۔

اس شہر اور اس دور کے بڑے ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی مجھے بڑے چاؤ سے

ان باغوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ایک شام میں ریس کورس کے باغ کی طرف سے گزرا تو اندر کا راستہ نہیں ملا، اتنا مجمع تھا۔ کہنے لگے کہ گرمیوں میں لوگوں کا باغوں میں آنا تعجب کی بات نہیں، لاہور میں لوگ شدید سردیوں میں بھی اوڑھ لپیٹ کر پارکوں میں آتے ہیں۔ کیسا ہی موسم ہو، وہ ضرور آئیں گے، گھومیں گے، دیکھیں گے، گپیں ماریں گے اور پھر چلے جائیں گے۔

میں نے اُس تاریخی باغ کا ذکر کیا جو کبھی شہر لاہور کو حلقہ کئے ہوئے تھا مگر وقت نے اُسے مٹا دیا۔ قاسمی صاحب نے اس کا دلچسپ حال سنایا:

" وہ باغ میں نے دیکھا ہے بھاٹی دروازے سے لے کر آگے چلے جائیے۔ لوہاری دروازہ، موچی دروازہ، دلی دروازہ، شیراں والا دروازہ اور ٹکسالی دروازہ ان سب کو وہ باغ ملاتا تھا۔ وہاں پنجابی کے شاعروں کی محفلیں لگتی تھیں پنجابی کے شاعر وہاں آکر اپنا کلام سناتے تھے۔ ایک دنیا جمع ہوتی تھی۔ اڈے بنے ہوتے تھے کہ یہ فلاں شاعر کا اڈہ ہے، یہ فلاں شاعر کا اور یہ فلاں شاعر کا۔ وہاں میں نے دیکھے ہیں بانسری بجانے والے۔ ایک بانسری بجانے والا بیٹھا ہے اور ایک مخلوق جمع ہے اور جھوم رہی ہے۔ اور وہ جو بانسری بجا رہا ہے وہ پیسے کے لئے نہیں۔ بس ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے۔ مگر وہ باغ اب نہیں رہا۔ اس کا بہت سا حصّہ ختم ہو گیا۔ سوائے موچی دروازے کے اَور کوئی باغ باقی نہیں رہا۔ ان کی جگہ دکانیں بن گئی ہیں، مارکیٹیں بن گئی ہیں اور شہر پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ جتنا پھیلاؤ اس کا ہو رہا ہے وہ ماڈرن ہو رہا ہے، تو میں نے ایک بار ایک شعر میں کہا تھا۔

صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں مگر اس کے ساتھ
سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

وہ سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں، گلستانوں کی ہوں یا ہماری روایات کی ہوں، وہ ٹوٹ رہی ہیں۔ کچھ ایسا ہونا چاہیئے کہ اُنہیں اتنا بچا لیا جائے اور اِتنا باقی رکھ لیا جائے کہ نئی نسل اُنہیں دیکھ لے اور اُن سے متعارف ہو جائے۔"

اُس روز میں لاہور کا انار کلی بازار دیکھنے اور اس سے متعارف ہونے گیا۔ غضب کا شور مچا ہوا تھا۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے علاقہ کی بجلی بند تھی اور ہر دکان دار اپنی بجلی آپ پیدا کر رہا تھا۔ دکان کے باہر اس نے گوجرانوالہ، گجرات اور سیالکوٹ کے بنے ہوئے جنریٹر چلا رکھے تھے جن کے شور سے یہ حال تھا کہ دکان دار تیس روپے بتاتا تھا، گاہک بیس روپے سنتا تھا۔ جہاں زیادہ جنریٹر چل رہے تھے وہاں تو دکان دار کے بتائے ہوئے ساٹھ روپے مجھے سات روپے سنائی دیئے۔

رہی سہی کسر کیسیٹ کے دکان داروں نے پوری کر دی۔ ان کی بڑی بڑی دکانیں ہیں جن میں ماہیا سے لے کر غزلوں تک ہزار طرح کے کیسیٹ چنے ہوئے ہیں۔ اصولاً تو گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے انہیں لاؤڈ اسپیکروں پر اونچی آواز کھول کر گانے بجانا چاہئیں لیکن ادھر شاید شوقِ خطابت کا زور ہے اور ان دکانوں کے مالکوں نے ٹیپ پر اپنی تقریریں ریکارڈ کر کے چلا رکھی ہیں۔ مجھے بہار کا شہر پٹنہ یاد آگیا جہاں فٹ پاتھ پر سانڈے کا تیل بیچنے والا شخص خود تو ایک طرف خاموش بیٹھا تھا اور لاؤڈ اسپیکر پر اُس کی تقریر کا ٹیپ چل رہا تھا۔ کچھ دنوں میں اُس کی زبان بے کار ہو جائے گی۔ پتہ نہیں اِس تیل کی مالش ایسی زبانوں پر بھی کارگر ہوتی ہے یا نہیں۔

پاکستان میں اب کیسیٹ کا اتنا رواج ہے کہ وہ گراموفون اور ان کے وہ گراموفون ریکارڈ جو عرفِ عام میں توے کہلاتے تھے، اب نہیں بنتے لیکن انار کلی میں ایک عجوبہ روزگار دکان دیکھی جس میں نہ صرف توے بلکہ چابی بھرنے والے اور بھونپو والے گراموفون بھی سجے تھے۔ جو حضرات دکان چلا رہے تھے وہ بھی ایڈیسن والے والی نسل کے تھے۔ میں

خوش ہو کر دکان کے اندر گیا اور پوچھا کہ آپ کے پاس سہگل، پنکج ملک، کملا جھریا، کانن اور عظیم پریم راگی کے ریکارڈ ہیں؟ ایک بزرگ نے چشمے کے اوپر سے مجھے نیچے تک دیکھا اور کوئی اتنی سخت بات کہی کہ یادداشت پہ لاکھ زور دیتا ہوں، یاد نہیں آتی۔

یہ انارکلی بازار دور تک سیدھا چلا گیا ہے۔ وہی قدیم عمارتیں۔ اوپر کی منزلوں میں وہی پرانے جھروکے، محرابی چھجے، سائبان، جھروکوں پر پڑی ہوئی چلمنیں، صدیوں سے سفیدی نہیں ہوئی، مرمت نہیں ہوئی اور پُرانی دیواروں میں اگر کوئی تبدیلی نظر آتی ہے تو یہ کہ جاپانی ائرکنڈیشنر انہیں توڑتے ہوئے باہر تک نکل آئے ہیں۔

ایک طرف عورتوں کا بہت بڑا بازار ہے۔ گلیاں اور اُن کے اندر گلیاں، سب خواتین کی۔ میں اندر چلا گیا۔ ہر طرف اتنی زیادہ خواتین تھیں کہ ایک بار تو میں سہم کر رہ گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مردوں کو اندر آنے کی اجازت نہ ہو اور میں بھولے سے چلا آیا ہوں۔ کچھ بھی ہو، یہ انارکلی بازار ہے۔ ویسے بھی نام کی مناسبت سے اس پہ پہلا حق خواتین کا ہے۔

اس شہر میں تو انارکلی کا مقبرہ بھی ہے۔ داستان گو کہتے ہیں کہ اُس میں شہزادہ سلیم کی انارکلی سو رہی ہے، مگر مورخ کہتے ہیں کہ وہاں کوئی مغل خاتون دفن ہیں، بات صرف اتنی سی ہے کہ مقبرے کی عمارت جس باغ کے اندر تھی اس باغ کا نام انارکلی باغ تھا، بعد میں لوگوں نے کہانیاں بنالیں۔

عجیب بات ہے کہ یہ کہانیاں بنائی ہوئی سہی، جی کو اچھی بھی لگتی ہیں۔

لاہور کی کہانی یہاں کے علم و فضل کی بات کہے بغیر پوری نہیں ہوتی اور ایک پورے دور کی اس کہانی کے جیسے راوی عاشق حسین بٹالوی ہیں ویسا بوڑھا راوی بھی نہیں ہو سکتا۔ شہر کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کا عاشق حسین صاحب نے بہت قریب سے جائزہ لیا ہے اور خصوصاً لاہور کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب علم و فضل اور ادب و ثقافت کے آسمان پہ لاہور ستارا بن کر جگمگا رہا تھا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی بھی اب بہت بزرگ ہیں

مگر اپنا زمانہ ان کے ذہن پر یوں نقش ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ اُس روز وہ لاہور کے یادگار دنوں کی داستان کہہ رہے تھے :

"لاہور کے میں نے مختلف دور دیکھے ہیں لیکن علم اور ادب کی ترقی اور فروغ کے اعتبار سے سب سے زرخیز اور بھرپور دور جو میں نے لاہور میں دیکھا ہے وہ دوسری عالمگیر جنگ سے کوئی سات آٹھ سال پہلے کا دور ہے۔ پھر وہ دور نہیں آیا دوبارہ۔

لاہور کے اورئنٹل کالج میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، پروفیسر شیخ محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی۔ گورنمنٹ کالج میں پطرس بخاری۔ اور پھر اقبال خود۔ اور اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں۔ ہندوؤں میں لاجپت رائے اور پھر ہندو شعرا کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تلوک چند محرومؔ، میلارام وفاؔ، درگا پرشاد فداؔ، نانک چند نازؔ، اودے سنگھ شائقؔ، کرپال سنگھ بیدارؔ، سوہن لال ساحرؔ، بے شمار ہندو شعرا تھے۔

اردو لکھنے والوں میں کرشن چندر وغیرہ نئے پیدا ہو رہے تھے۔ اُپندر ناتھ اشک، کنہیا لال کپور وغیرہ یہ سب اردو لکھتے تھے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی جو تھے تو نجیب آباد کے لیکن ان کی ساری عمر لاہور میں گزری۔ دیال سنگھ کالج میں پڑھاتے تھے وہ، تو انہوں نے لاہور میں ایک اردو مرکز قائم کیا اور اردو مرکز میں کام کرنے کے لئے انہوں نے یاس عظیم آبادی، جگر مراد آبادی اور اصغر گونڈوی جیسے شاعروں کو بلایا۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں سیماب اکبر آبادی اور ساغر نظامی بھی لاہور آ گئے۔ تو لاہور کا یہ حال ہوا جیسے بارات میں شہنائیاں بجنے لگی ہوں۔ لاہور میں ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے شروع ہو گئے۔ پھر سر عبدالقادر مرحوم موجود تھے اور

وہ تو بجائے خود ایک ادارہ تھے۔

تو وہ دور ہم نے دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے۔ لوگ بڑھ بڑھ کر شاعروں کو داد دیتے تھے۔ آپس میں معاصرانہ چشمک بھی ہوتی تھی لیکن گالی گلوج تک نوبت نہیں آئی۔

اور مولانا ظفر علی خاں کو تو آپ جانتے ہیں، وہ بلا انگیز آدمی تھے۔

تو چلے تو ساتھ تیرے فتنۂ محشر چلے

وہ تو فتنۂ محشر تھے۔ پچیس سال تک مولانا ظفر علی خاں نے موچی دروازے کے باغ میں کھڑے ہو کر اپنی خطابت کے جوہر دکھائے۔ اور جو اُن کی تقریروں کی زبان تھی وہ عام زبان نہیں تھی بلکہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو زاہدگانِ توحید کہا کرتے تھے۔ اور کبھی خدا کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ کہتے تھے: بربِ کعبہ! اور برطانوی ملوکیت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آئیں گی۔ اور رجعتِ قہقری۔ اور جو حکومت کے خوشامد پسند لوگ تھے ان کو کہا کرتے تھے: تملق پیش گانِ ازلی اور کاسہ لیسانِ سرمدی۔ یہ اُن کی بولنے کی زبان تھی۔ تو پچیس سال تک مولانا ظفر علی خاں نے لاہور کے موچی دروازے میں کھڑے ہو کر اِس زبان میں تقریریں کیں۔ اور لاہور کے ناخواندہ اور اَن پڑھ مسلمان جو تھے اُن کو یہ الفاظ زبانی یاد ہو گئے تھے۔ یعنی وہ نہیں سمجھتے تھے لیکن الفاظ ان کو زبانی یاد ہو گئے تھے۔ تو ایک مرتبہ سید سلیمان ندوی لاہور تشریف لائے تو انہوں نے یہ رنگ دیکھا۔ علامہ اقبال نے ان کی دعوت کی اپنے مکان پر، اُس میں بہت سے لوگ تھے۔ میں بھی تھا اُس میں، تو سید صاحب نے فرمایا کہ میں نے اعظم گڑھ بھی دیکھا ہے، میں نے علی گڑھ بھی دیکھا ہے، میں نے دلی بھی دیکھی ہے لیکن یہ علمی فضا جو آج لاہور میں طاری ہوتی

ہے یہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ تو اقبال نے کہا: ہاں!

حفیظ جالندھری کے نغمے ہوتے تھے، پھر مشاعرے ہوتے تھے، ہر کالج میں اپنی اپنی ایک علمی انجمن تھی، اُس میں مقالے پڑھے جاتے تھے۔ نوجوانوں نے حلقہ اربابِ ذوق اور حلقہ اربابِ علم کے نام سے دو ادارے قائم کر رکھے تھے اور ہفتہ وار مجلس ہوتی تھی۔ زلزلہ آئے۔ طوفان آئے، سیلاب آئے لیکن حلقہ اربابِ ذوق کی مجلس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

تو میں نے عرض کیا نا، کہ وہ دور لاہور کا پھر ہم نے نہیں دیکھا

اجاڑ ہو گئے عہدِ کہن کے میخانے!

گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں

تو عابدی صاحب! لاہور کا وہ دور پھر ہم نے نہیں دیکھا"

اور اب لاہور کا نیا دور شروع ہو رہا ہے۔

میرا پاکستان کا سفر ختم ہونے کو آیا۔ جی ٹی روڈ کے آخری ٹکڑے پر سفر کرتا ہوا میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحد تک پہنچا۔ شالامار باغ سے لے کر جلو موڑ تک جو بستیاں تھیں ان کی دیواروں میں پچھلی جنگ کی گولیاں ابھی تک پیوست تھیں۔ اور راہ میں جو کھیت اور میدان تھے ان میں میری چشمِ تصور نے گرد کے بادل اڑاتے ہوئے ٹینک اور اُن کے پیچھے پیچھے رائفلیں اٹھائے، پیٹھ پر تھیلے باندھے اور سروں پر آہنی خود پہنے وہ فوجی دیکھے جن کے مقدر میں وقت کی شطرنج پر مہرے بن کر چلنے کے سوا کچھ نہیں۔

میں واہگہ کی سرحد تک گیا اور موٹی سی سفید لکیر تک جا کر ٹھہر گیا۔ جرنیلی سڑک پر اُس سے آگے جانا منع تھا کیونکہ اُدھر ایک جرنیل سنگھ کا قضیہ رنگ لا چکا تھا۔

اب میرے سامنے امرتسر تھا اور پشت پہ لاہور۔ سامنے سے آنے والی دھماکوں کی

آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں اور پشت پر نئے دھماکے شروع ہو رہے تھے۔

وہیں ایک پوسٹر پر قطب مینار کی تصویر تھی۔

میں نے غور سے دیکھا۔

وہ قطب مینار نہ تھا۔

کلاشینکوف کی نالی تھی۔

میں نے اپنا تھیلا اٹھا کر دوبارہ کاندھے پر ٹکایا اور سر جھکائے خاموشی سے لاہور واپس آگیا۔

پرانی زمینیں، نیا انبالہ

میرا پاکستان کا سفر تمام ہوا۔ چند لمحوں کی اڑان مجھے ہندوستان لے آئی۔ لوگ کہتے ہیں، ایک ہی سرزمین تو ہے، بیچ میں صرف سیاسی بٹوارا ہے۔ پہلے کبھی ہوگا۔ اب نہیں ہے۔ اب معیشت الگ ہے، معاشرت جدا ہے۔ لہجے الگ ہیں، پہناوے جدا ہیں۔ روپ الگ ہیں، رنگ جدا ہیں۔

میرے سفر میں ملک بدلا تو سارے منظر بدل گئے اور میں چونکہ بسوں میں سفر کرتا رہا اس لئے سب سے بڑی تبدیلی مجھے بسوں میں نظر آئی۔ جاپانی ساخت کی ملائم نشستوں والی بسیں پاکستان میں رہ گئیں۔ اب ٹاٹا کی لوہے لاٹ کی بنی بسیں میری رفیق سفر ٹھہریں اور سفر بھی ایسا کہ سارا بدن چُور چُور۔ تختوں سے زیادہ سخت نشستیں اور انسان کو دوہرا کر دینے والی اُن کی پشت۔ اگر آپ اتفاقاً یا مجبوراً پہیوں کے اوپر والی نشست پر بیٹھ گئے تو بس کے فرش پر اُبھرے ہوئے بمپر کی وجہ سے آپ کی ٹانگیں مڑی ہوئی۔ اور کہیں خالی نشست کو غنیمت جان کر اور لپک کر آپ سب سے اگلی سیٹ پر جا بیٹھے ہیں تو بھٹی کی طرح پتنتے ہوئے انجن کے نوکوں سے کُل وجود جھُلس کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پتلون پر گومڑوں کی طرح اُبھرے ہوئے گھٹنے اگلی نشست کی پشت سے رگڑ کھاتے کھاتے سیاہ ہو چکے ہیں اور سامنے لگی ہوئی لوہے کی سلاخ پکڑے پکڑے آپ

کی دونوں ہتھیلیاں جیسے خود بھی زنگ کھا چکی ہیں۔

یہ سب بھی، مگر جو بھی ہے، جیسا بھی ہے، اپنے گھر کا، اپنے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے۔ ناقص ہے، تکلیف دہ ہے مگر اپنے ہی وطن کے اپنے ہی کارخانوں میں بنا ہے۔ دوسروں کو تکلیف دہ لگتا ہے تو لگے لیکن جس نے کبھی اس سے بڑھ کر راحت نہ دیکھی ہو اور جسے اس سے زیادہ آسائش ملی نہ ہو اُس کے لئے اسی میں بڑا آرام اور اسی میں بڑا چین ہے۔

اُس روز بڑا لطف آیا۔ میری بس دہلی سے چلی، یوپی سے گزری اور ہریانہ میں داخل ہوئی۔ بڑے بڑے کارخانوں کا دھواں اُگلتی چمنیوں کے شہر مینا نگر کے پختہ، کشادہ بس اسٹینڈ میں بس کا رکنا غضب ہو گیا کیونکہ اگلے ہی لمحے ایک ہجوم اندر گھس آیا۔ کوئی سنگترے بیچ رہا تھا کوئی مونگ پھلی۔ گداگروں کا اصرار تھا کہ اُن سے بڑا نادار اب زمانے میں ملنا مشکل ہے لیکن سب سے دلچسپ تقریریں کتابیں بیچنے والوں کی تھیں۔ ایک صاحب گھر بیٹھے انگریزی سیکھنے کی کی کتاب بیچ رہے تھے۔ صرف ایک روپیہ خرچ کر کے یہ جناتی زبان سیکھی جا سکتی تھی۔ یہ سودا مہنگا نہیں۔ دوسرے صاحب جڑی بوٹیوں اور گھریلو ٹوٹکوں کے ذریعے ہر مرض کے علاج کی کتاب لائے تھے۔ اُن کو اس بات پر اصرار تھا کہ وانگریجی، دوائیں بھی جڑی بوٹیوں سے بنتی ہیں، آسمان سے نہیں اُترتیں۔ تقریروں کے اِس شور سے سر پھٹنے لگا اور اُس کتاب میں سر پھٹنے کا علاج نہیں تھا۔

ڈرائیور کے سامنے سنسکرت میں کچھ لکھا تھا اور فریم میں جڑی ہوئی کئی تصویریں لگی تھیں۔ ان میں کچھ دیوتا تھے، کچھ گرو تھے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے، سر پر رومال باندھے سائیں بابا بھی تھے۔ ان ہی حضرات کے فیوض و برکات کا اثر تھا کہ گاڑی ہر اسپیڈ بریکر کے اوپر سے فل اسپیڈ میں گزر جاتی تھی اور اس کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔

راہ میں سڑک کے کنارے پیروں فقیروں کی جتنی قبریں پڑیں، ڈرائیور نے نہ صرف اُن سب کو سلام بھی کیا بلکہ کچھ قبروں پر پیسے بھی پھینکے۔ سہارن پور کے علاقے میں نو گز لمبے

ایک بزرگ کی قبر ملی یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک بزرگ کی نوگز لمبی قبر ملی۔ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ وہیل چھوڑ کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ اس کے باوجود بس سیدھی چلتی رہی۔

اتنے میں ہریانہ آگیا۔ کہیں لکھا نہیں تھا کہ یہ ہریانہ ہے مگر صاف نظر آتا تھا کہ یہ یوپی نہیں ہے۔ اس کا قصہ بالکل اُس ہوائی جہاز جیسا ہے جس میں ہم پاکستان سے ہندوستان کی طرف اڑے۔ ہم بچوں کی طرح نیچے جھانکتے گئے کہ شاید دونوں ملکوں کی سرحد چونے کی لکیر کی طرح نظر آئے۔ وہ تو کہیں نظر نہ آئی البتہ سبزے میں گھرے ہوئے دیہات میں پہلے مسجدیں نظر آرہی تھیں پھر اچانک مندر نظر آنے لگے۔

یہی ہریانہ میں ہوا۔ جوں ہی سڑکیں عمدہ اور کشادہ ہوئیں، ان کے کنارے سلیقے سے لگے درخت نظر آئے اور سب سے بڑھ کر دورویہ شراب کی دکانوں کے کیبن نظر آئے۔ ہر ایک بولا کہ ہریانہ آگیا۔ بس رکی اور وہی پیروں فقیروں کو سلام کرنے والا ڈرائیور اُترا اور ذرا ہی دیر بعد کاغذ میں لپٹی ہوئی شراب کی بوتل لے کر لَوٹا۔

یہ سب بسوں، ٹرکوں، ٹریکٹروں اور ٹرالروں کی آمدورفت کا علاقہ ہے لہٰذا سڑکوں پر کھانے پینے کے ٹھکانے بہت ہیں۔ اوپر بڑا بڑا لکھا ہے "ڈھابا" اور سامنے آٹھ دس انگیٹھیوں پر قطار میں چُنی ہوئی اُتنی ہی پتیلیاں۔ تمام ڈرائیور ان ڈھابوں میں کھانا کھاتے ہیں اور مشہور ہے کہ ڈرائیور ناقص کھانا کبھی نہیں کھاتے لہٰذا جس ڈھابے پر ڈرائیوروں کا جتنا زیادہ مجمع ہو سمجھئے کہ اس کا کھانا اتنا ہی اچھا ہے۔

دور شوالک کے پہاڑ نظر آنے لگے۔ دریائے سرسوتی اور دریشدَوت کے مقدس پانی سے سیراب ہونے والی زمینیں بس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگیں اور ان دو دریاؤں کے بیچ انبالہ کی وہ پٹی آگئی جس کے بارے میں لوگ کبھی کے بھول بھال گئے کہ ہندوکش سے اتر کر آنے والے آریاؤں نے اپنا پہلا مستقل پڑاؤ یہیں ڈالا تھا اور سورج کو اتر دبھے کے جبڑوں میں پھنسا دیکھ کر انہوں نے سرسوتی کی لہروں میں اپنے گناہ یہیں دھوتے تھے

اور کورو اور پانڈو گھٹنے گھٹنے خون کے دریاؤں میں یہیں لڑے تھے، آج کے ہندو دھرم کی بنیاد یہیں پڑی تھی اور آج کی ہندوستانی تہذیب کا پہلا سورج یہیں ابھرا تھا، اسی انبالے کے علاقے میں۔

خود انبالہ شہر زیادہ پرانا نہیں۔ شہاب الدین غوری کے زمانے میں کوئی صاحب تھے قاضی تقی منقی، سب سے پہلے اُن کے سفرنامے میں انبالے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات آٹھ سو سال پُرانی ہے۔

اس کی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ غوری نے یہ علاقہ تقی منقی کو عطا کر دیا۔ بابر نے یہی جاگیر صدر الدین صدر جہاں کو سونپ دی۔ انبالہ کی ایک جانب پہاڑ ہیں اور دوسری طرف راجپوتانہ کے ریگستان اور جنگل تھے اس لئے افغانستان کی طرف سے جو بھی ہندوستان آتا تھا اسی علاقے سے گزر کر پانی پت ہوتا ہوا دہلی جاتا تھا۔ شیر شاہ سوری نے یہیں سے اپنی سڑک نکالی، اس کے بیٹے اسلام شاہ سوری نے اسی انبالے میں پنجاب کے نیازی پٹھانوں سے زبردست جنگ کی۔ اورنگ زیب کے بعد اس سرزمین کے بُرے دن آئے تو سرسوتی کا پانی اور شوالک کی چوٹیوں کا تقدس، یہاں تک کہ بابا لکھی شاہ کی ذات بابرکات، کوئی بھی انبالے کے علاقے کو نہ بچا سکا۔

سکھوں کے آخری گرو گوبند سنگھ ناندیڑ میں قتل ہوئے تو ویسے ہی ناک نقشے اور ویسی ہی شکل و صورت کا بندہ بیراگی اُٹھا۔ خود کو سچا پادشاہ، کا خطاب دیا۔ چالیس ہزار سکھوں کو اپنے ساتھ ملایا اور پھر کرنال، انبالہ اور خاص طور پر سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ وہ لاہور پر قبضہ تو نہ کر سکے البتہ لاہور کے نواحی علاقے لوٹے اور دہلی کو لاہور سے ملانے والی سڑک بند کر دی۔

کچھ عرصے بعد انبالہ مہاراجا پٹیالہ کے فوجی افسر گوربخش سنگھ کو مل گیا۔ جنہیں نئی نئی حکومت مل جائے ان کے مشغلے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ گوربخش سنگھ کو ظلم ڈھانے کا

شوق تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ دیا کور نے بھی بڑے ذوق و شوق سے وہ سلسلہ جاری رکھا۔ کہتے ہیں کہ اُن کا دور اتنا جابرانہ تھا کہ اُن کا محل، جو انبالہ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے "ظلم گھر" کہلاتا تھا۔

دیا کور کی زندگی کا خاتمہ ہوا تو انبالے میں انگریزوں کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ انہوں نے کرنال میں اپنی چھاؤنی بنائی تھی لیکن کرنال کے مچھروں نے انگریزی فوج کو شکست دے دی اور پسپا ہو کر یہ فوج سرہند کی طرف چلی۔ کہتے ہیں کہ سینکڑوں گاڑیوں پر فوج کا ساز و سامان اور ملیریا کے مریض لدے ہوئے تھے۔ راستے میں انہوں نے انبالہ کے قریب جو پڑاؤ ڈالا تو اچانک ملیریا کا خاتمہ ہو گیا اور بیماروں کی توانائی تیزی سے لوٹ آئی۔ پھر کیا تھا۔ پرانے شہر انبالہ سے پانچ میل باہر انبالہ چھاؤنی قائم ہو گئی۔ دلّی میں بغاوت کے شعلے بلند ہونے میں ابھی بارہ تیرہ برس باقی تھے کہ لاہور سے انبالہ چھاؤنی تک اور اس کے فوراً بعد دلّی تک پختہ سڑک کی تعمیر شروع ہوئی۔

انبالہ چھاؤنی میں بارکیں بنیں، بنگلے اور کوٹھیاں تعمیر ہوئیں، گرجا گھر بنے، یورپین اسٹور کھلے اور ہوٹل بنے۔ وہ مس سینڈز سولجر ہوم ہی تو تھا جہاں رات دیر تک کھڑکیوں میں روشنی رہا کرتی تھی، شمپین کی بوتلیں کھلا کرتی تھیں، پیانو بجا کرتا تھا اور ناچ ہوا کرتا تھا اور بچاری مس شیپرڈ ایک لمحے ایپرن باندھے کچن میں ہوتی تھیں اور دوسرے لمحے ناچتے ہوئے فوجیوں کے بیچ۔

دہلی سے ۱۸۵۷ء کی شورش کی اطلاع کا پہلا تار انبالہ چھاؤنی ہی میں موصول ہوا تھا۔ سید احمد شہید کے ساتھیوں پر یہیں مقدمہ چلا تھا۔ یہیں کے راجاؤں، رئیسوں اور نوابوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے صلے میں لارڈ کیننگ نے انہیں خطابات سے یہیں نوازا تھا۔

جس روز میں انبالہ پہنچا، اخبار میں خبر چھپی۔ میرے آنے کی نہیں بلکہ گرمی کی لہر

آنے کی۔ دوپہر منجھے ہوتے تانبے کی طرح چمک رہی تھی۔ کنٹونمنٹ کے لکیر جیسے سیدھے بازاروں کو جھنڈیوں سے سجایا جا رہا تھا کیونکہ تمام دکان داروں کے چندے سے اُس رات انبالہ چھاؤنی میں بھجن کیرتن ہونے والا تھا۔

چھاؤنی کے بڑے چوراہے کے وسط میں ایک مجسمہ سا بنا ہوا تھا، کسی شخص کا نہیں بلکہ سائنسی رسد گاہ میں کام آنے والے آلات اور ساز و سامان کا مجسمہ کیونکہ اب انبالے میں اسی کی صنعت کو فروغ ہوا ہے۔ پہلے کچھ لوگ یہاں دریاں اور سوتی قالین بنا کرتے تھے۔

پہلے کا حال مجھے کے بی پرواز صاحب نے سنایا: کُل بھوشن پرواز: بہت پڑھے لکھے، بہت باذوق، اردو کے عاشق، مذہبی تعصب سے نفرت، پرانی روایتوں سے محبت، شعر کا ذوق، تقریر کا شوق۔ گفتگو کوئی بھی ہو، ختم کرتے ہیں شعر و سخن کے تذکرے پر۔ اُس شام وہیں انبالہ کینٹ میں اردو کے ایک اور سرپرست راجندر ملہوترا صاحب کی قیام گاہ پر بیٹھے مجھے چھاؤنی اور شہر کے بارے میں بتا رہے تھے:

"انبالہ بہت پرانا نہیں ہے۔ اس کی تاریخ تقریباً ۱۷۵ سال کی ہے۔ یہ پہلے موضع بگھیاں کے زمینداروں کے کھیت تھے۔ پھر انگریزوں نے یہاں پر چھاؤنی بنائی لہٰذا کنٹونمنٹ پرانا نہیں البتہ انبالہ شہر آٹھ سو سال پرانا ہے۔ وہ پرانے کلچر کا گہوارہ تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے، نشستیں ہوتی تھیں مطلب یہ کہ یہ شہر ادب کا مرکز رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب آپ انبالے سے دہلی جائیں گے تو اس جی ٹی روڈ کے اردگرد آپ کو ادب کے اور بھی مراکز ملیں گے مثلاً پانی پت، جہاں کے مولانا حالی رہنے والے تھے۔ اسی طرح تھانیسر ہے جس کا نیا نام کروکشیتر ہے۔ وہاں پر علم عروض کے بہت بڑے استاد مولوی امام بخش پیدا ہوئے تھے۔ یہ بڑے عالموں کا خطہ ہے۔"

کے۔ بی پرواز صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ کا یہ شہر پہلے کیسا تھا؟ اُس وقت کیسی محفلیں سجتی تھیں اور کیسی بزم آرائیاں ہوتی تھیں؟ انہوں نے کہا:

"انبالے کو میں نے برطانوی دور میں بھی دیکھا ہے۔ جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اُس وقت میرے والد یہیں تعینات تھے۔ وہ ٹیلیفون آپریٹر تھے۔ اُس وقت یہ شہر بہت خوبصورت تھا۔ بے حد صاف ستھرا تھا۔ آبادی کم تھی۔ بہت تازی ہوا تھی، اب تو سیع ہوگئی ہے، گھٹن ہوگئی ہے، پہلے یہ بات نہیں تھی۔ تو میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے والد صاحب کے پاس یہاں آیا ہوا تھا تو ایک مشاعرہ ہوا۔ یہاں پر ایک بہت بڑے اُستاد ہوتے ہیں لالہ رام کشن صاحب تمنّا انبالوی۔ علامہ اجل انبالوی کے شاگرد۔ تو اتفاقاً اُن ہی دنوں ایک مشاعرہ ہوا اور یہاں اکثر مشاعرے ہوتے تھے۔ میں اس مشاعرے میں گیا تو وہاں دیکھا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے اور سامعین کی اتنی بھیڑ ہے کہ اندر بھی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، چھتوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور باہر بھی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک بہت اچھی روایت دیکھی اُن دنوں یہاں پر، بہت اچھی روایت دیکھی:

آج کل لوگ شاعر کو داد بھی دیتے ہیں، بے داد بھی دیتے ہیں اور ہوٹنگ بھی کرتے ہیں۔ اُس وقت شاعر کا جو بھی اچھا شعر ہوتا تھا، داد کے ساتھ ساتھ اُس پر پھول برساتے تھے۔"

اُس کے بعد پرواز صاحب بتانے لگے کہ انبالہ شہر نے کیسے کیسے باذوق لوگ پیدا کئے۔ دریاؤں، پہاڑوں اور میدانوں کے اس سکل بن میں شعر و سخن کی کیسی سرسوں پھولی، وہ کون ہستیاں تھیں جنہوں نے بڑا کام کیا اور بڑا نام پایا:

"انبالہ میں اردو ادب میں جو مشہور ہستیاں ہوئی ہیں: مولوی سوندھے خاں فروزؔ،

بہت بڑے عالم تھے عربی فارسی کے، خالصہ ہائی اسکول انبالہ شہر میں وہ فارسی اور عربی کے ہیڈ مدرس تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر عبدالشکور یہاں کے رہنے والے تھے۔ اور خوشی محمد ناظر جو جموں میں شاید گورنر بھی رہے ہیں وہ انبالہ شہر کے رہنے والے تھے۔ اور ساغر صدیقی بھی انبالے کے باشندے تھے اور سید غلام بھیک نیرنگ وہ بھی انبالہ شہر کے رہنے والے تھے اور یہاں کینٹ کے اندر علامہ اجل انبالوی مسجد خمران میں رہا کرتے تھے۔ اور ڈاکٹر سید محمد نجمی، رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر تھے۔ وہ موسیقی، رقص اور شاعری تینوں میں شغف رکھتے تھے، شعر کہتے تھے، سنتے تھے، گاتے تھے، ناچتے تھے۔ وہ بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں پر مائل انبالوی یہیں کے تھے اور منیر نیازی؛ ہوشیارپور شہر جو ہے اس کے ساتھ ایک ندی ہے، اس ندی کو پار کر کے قصبہ خان پور ہے، پٹھانوں کا قصبہ ہے اور آج بھی ہے۔ منیر نیازی وہاں کے رہنے والے تھے۔ ناصر کاظمی صاحب مرحوم انبالہ شہر کے شب زندہ دار صوفیوں کے خاندان سے تھے۔ کاظمی خاندان کے بڑے بڑے صوفی بزرگ، پہنچے ہوئے فقیر، جن کے خاندان سے ناصر کاظمی ہیں، وہ انبالہ شہر کے رہنے والے تھے۔"

آداب عالمگیری کے مؤلف صادق مطلبی بھی انبالہ کے باشندے تھے۔

آخر میں پرواز صاحب نے بھی وہی شکایت کی جو ہر وہ شخص کرتا ہے جس نے زمانے بدلتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں اُن سے پوچھ رہا تھا کہ اِس دور میں انبالے میں اقتصادی خوش حالی آئی ہے یا نہیں؟۔ کہنے لگے:

"اقتصادی خوش حالی یقیناً ہے۔ لوگوں کے پاس پیسہ پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے اور آج یہ حال ہے کہ جو بہت غریب لوگ ہیں جیسے ہمارے

ہاں ایک برادری ہے جس کو ڈیہا کہتے ہیں، وہ خانہ بدوش قبیلہ ہے، اُن کے گھروں میں بھی آج ٹیلیویژن سے لگے ہوئے ہیں۔ اب تو اقتصادی خوشحالی بہت ہے مگر یہ خوش حالی جوں جوں بڑھتی گئی، ثقافتی اور ادبی خوش حالی گھٹتی گئی اور ادب کا آج یہ عالم ہے کہ ہم لوگ شعر کہتے ہیں سننے والا نہیں ملتا اور اگر سننے والا ملتا ہے تو شعر کو سمجھنے والا نہیں ملتا۔"

کے بی پرواز صاحب آباد بستیوں میں ویرانے دیکھ رہے تھے اور میری نگاہ اُن آبادیوں کو دیکھ رہی تھی جو یہاں بستی تھیں، پھر ایک روز اُٹھیں اور چلی گئیں۔ سماجی تاریخ کے اس عمل نے انبالہ، کرنال اور پانی پت وغیرہ میں جو نقش چھوڑا ہے وہ ابھی مٹا نہیں۔ اس کی بات اگلے صفحوں میں ہے اور اس کی بات پرواز صاحب کی باتوں میں بھی تھی۔ میں نے فرمائش کی کہ اپنے کچھ شعر سنایئے تو وہ یہ قطعہ سنا کر رہ گئے

میری صدا جو صدائے اذاں سے ملتی تھی
وہ دن گئے کہ مرے آس پاس رہتی تھی
خطا معاف کہ میں آج مُسکرا بیٹھا
بہت دنوں سے طبیعت اُداس رہتی تھی

اُردو اور اذانیں

میں نے اور ملہوترا صاحب نے جوتے اُتارے اور سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم انبالہ کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دو نوعمر لڑکے چٹائی کے فرش پر بیٹھے قاری صاحب سے اردو پڑھ رہے ہیں۔ ہریانہ میں نوجوانوں کو اردو پڑھتے دیکھ کر ہم مسرور ہو رہے تھے، پیار سے اُن دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرے اور ایک سے پوچھا "بیٹے! آپ کا نام کیا ہے؟"

"وریندر کمار"

میں اس جواب کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔ اب میں دوسرے نوجوان سے مخاطب ہوا "آپ کا نام؟"

"بلرام"

انبالہ کی سبزی منڈی میں حضرت توکل شاہ نقشبندی کی درگاہ اور جامع مسجد میں یہ منظر مجھے حیران کر گیا۔ ذہن سے امنڈ کر بے شمار سوال زبان پر آ رہے تھے۔ میں نے وریندر کمار سے پوچھا کہ آپ اردو کب سے پڑھ رہے ہیں؟۔ انہوں نے بتایا کہ ان دونوں کو اُردو سیکھتے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔

میں نے کہا "آپ کو اس کے لئے یہاں مکتب میں آنا پڑتا ہے، کیا آپ کے

اسکول میں اردو نہیں سکھائی جاتی ؟ "

ورِیندر کمار نے جواب دیا" نہیں ، ادھر کوئی نہیں ہے اردو پڑھانے والا"

میں فوراً ہی اصل سوال پر آگیا" آپ نے اردو پڑھنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے ؟ "

ویندر کمار نے کہا" یہ ہمارے کاروبار میں کام آتی ہے ۔ ہم کمیشن ایجنٹ ہیں اور ہمارے سارے ہی کھاتے اُردو میں لکھے جاتے ہیں ۔ سارا حساب کتاب اردو میں ہے "

اب میں نے برام سے پوچھا کہ کیا آپ بھی کاروبار کی وجہ سے اردو پڑھ رہے ہیں؟

جواب ملا" نہیں جی ۔ ہم بھاشا گیان کی وجہ سے پڑھ رہے ۔ ہمارے بڑے بڑے اخبار اردو میں ہیں ، ہمیں بھی شوق ہوا کہ ہم اخبار پڑھیں اس لئے اردو پڑھنے کا فیصلہ کیا"

یہ عجیب منظر تھا ۔ نہایت متبرک چار دیواری میں دو ہندو لڑکے بیٹھے پڑھ رہے تھے میرے ساتھ میرے میزبان راجندر ملہوترا صاحب بھی درگاہ اور مسجد کے اندر چلے آئے تھے لیکن کسی کی ابرو کو جنبش نہیں ہوئی ۔ کسی کی پیشانی پر بل نہیں پڑا ۔ شوالک کی گھاٹی میں یہ مسجدیں ، یہ مقبرے اب رواداریوں کی علامت بن چکے تھے ۔ کسی عمارت کی پیشانی پر نہیں لکھا تھا کہ یہ صرف فلاں مسلک کے لئے مخصوص ہے ۔ ان کے دروازے یوں کھل گئے تھے جیسے کوئی محبت سے سرشار ہوکر بانہیں کھول دے ۔

دونوں لڑکوں کے سامنے ان کے استاد قاری محمد اسحاق صاحب بیٹھے آموختہ سُن رہے تھے ۔ اُس روز وہ بہت بھلے لگے ۔ قاری محمد اسحاق صاحب خطیب بھی ہیں ، امام بھی ہیں ، دنیا کے علوم سے باخبر ہیں ، شعر بھی کہتے ہیں ، انبالہ سے پندرہ روزہ نوائے وطن ، بھی نکالتے ہیں ۔ شہر کے معاملوں اور مسئلوں سے بھی تعلق نہیں ، ادبی سرگرمیوں میں بھی شریک ہیں اور اردو کو فروغ دینے کی مہم بھی چلا رہے ہیں ۔

یہ اس زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے تھوڑے سہی مگر اچھے نیک نیت سرپرست ملے ہیں ۔ انبالہ میں سب جانتے ہیں کہ شام بہار ٹرسٹ ہر سال بہت بڑا بین الاقوامی

مشاعرہ کراتا ہے۔ اس کا اہتمام کرنے والوں میں راجندر ملہوترا صاحب بھی ہیں جو اپنے کاروبار سے سبکدوش ہو کر اور اُسے اپنے بچوں کو سونپ کر خود اردو کے لئے بڑا کام کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ جگدیش رائے بنسل صاحب ہیں۔ انبالہ سے ایک انگریزی جریدہ نکالتے ہیں۔ سنبھلی سنبھلائی شخصیت، ٹھہری ٹھہری سی باتیں اور ہر بات میں خوش ذوقی رچی بسی۔ اردو زبان سے گہرا لگاؤ۔ لاہور کے حلقہ ارباب ذوق میں بے شمار شامیں گزاریں۔ خود بھی معصوم تخلص کیا اور شعر کہے۔ اب اگرچہ اپنے کاروبار میں مصروف ہیں مگر شعر و سخن سے لاتعلق اب بھی نہیں۔ انبالہ میں ملہوترا صاحب کے ساتھ مل کر اردو کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ آگے بڑھانے میں منہمک ہیں۔ کہنے لگے۔

"یہ تو اپنا پورا ارادہ ہے کہ اس کو زندہ رکھا جائے، جتنا بھی ہو سکے۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا ورثہ ہے۔ ہم اس سے منکر نہیں ہو سکتے۔ کبھی بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہمارا نہیں ہے۔ یہ ہمارا ہے۔ بالکل ہی ہمارا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں یہ کسی اَور کا نہیں ہے۔ ہمارا ہے۔ ہمارا فرض بنتا ہے، مثلاً ملہوترا صاحب کافی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ فنڈ اکٹھا کر لیتے ہیں، انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ چیز چلی آ رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ تو ہمیں امید ہے کہ کچھ اَور بھی کر پائیں گے جس سے جیتی جاگتی دلچسپی پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ایک زوال پذیر زبان سمجھ کر لوگ اس میں دلچسپی لیں کہ یہ چیز جا رہی ہے، اس کو پکڑ لو۔ یہ غلط بات ہے۔ اس میں ان کی جیتی جاگتی دلچسپی ہونا چاہئے۔ ہمارا تو یہ نصب العین ہے۔ یہ تو ہماری اپنی چیز ہے، ہم اسے کیسے گنوا دیں۔"

ہم نے جگدیش رائے بنسل صاحب کی یہ باتیں سنیں اور باتیں بھی ایسی جن سے

خوشبو آئے۔

رات ہوئی تو کنٹونمنٹ کے بنگلوں، کوٹھیوں، پرانے گرجا گھروں اور دورویہ درختوں والی سڑکوں کے سناٹے میں ہم نے دو آوازیں سنیں۔ دور کہیں کسی مزار پر محفلِ سماع تھی شاید، قول سے رنگ تک قوالوں نے اس رات اپنے سارے جوہر دکھائے۔ دوسری آواز ہم نے بہت قریب سے سنی۔ انبالہ کے جغادری مچھروں کو ولایت سے آئی ہوئی نئے ذائقے کی غذا ملی تو وہ ہم پر ٹوٹ پڑے اور ہمارے چہرے پر، ہاتھوں اور پیروں پر انہوں نے ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے۔

اگلی صبح مہوترا صاحب انبالہ چھاؤنی اور شہر کی سیر کرانے نکلے۔ قریب ہی فضائی فوج کا اڈّہ تھا۔ ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے جانے کی نسبت سے ہمیں ہواڑہ کی طرح یہ انبالہ بھی اچھی طرح یاد تھا۔ فضائی اڈّے کے قریب دیکھا تو سینٹ پال کا گرجا گھر کھنڈر بنا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ کبھی ہندوستان کا سب سے شاندار گرجا گھر تھا۔ اب ۶۵ء کی جنگ کی یادگار کے طور پر ایسا ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔

پھر نوگزے پیر کی ایک اور قبر دیکھی۔ نہایت صاف ستھری، اس پر تازہ سفیدی اور بہت سی جھنڈیاں لگی ہوئی۔ سہارن پور اور ہریانہ کے علاقے میں کتنے ہی نوگزے پیروں کی لمبی لمبی قبریں ہیں۔ کسی نے کہا: نو غازی تھے، وہ نوگزے کہلاتے۔ کسی نے کہا: ایک ایک قبر میں کئی بزرگ دفن ہیں۔ کوئی معاملہ فہم بولا: لمبی لمبی قبریں مجاوروں نے بنائی ہیں تاکہ عقیدت مند ان پر لمبی لمبی چادریں چڑھائیں اور یوں ان کا کاروبار چلے۔

اس کے بعد تو راستے میں بزرگوں کے کتنے ہی مزار ملے۔ ڈیری فارم کا مزار دیکھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ہندوؤں میں بہت مقبول ہے اور چڑھاوے چڑھانے والوں کو، جو سارے کے سارے غیر مسلم ہوتے ہیں، اپنی باری کے لئے قطاریں بنانا پڑتی ہیں۔

راستے میں ہم گرینڈ ٹرنک روڈ سے بھی گزرے۔ انگریزوں کے زمانے کی یہ سڑک بہت چوڑی کی جا رہی تھی چنانچہ ایک برساتی نالے پر بنا ہوا اینٹوں کا قدیم پُل توڑا جا رہا تھا تاکہ اس کی جگہ نیا پُل بن سکے لیکن وہ پرانا پُل اتنا مضبوط اور ٹھوس تھا کہ بچارے مزدور پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ کسی نے کہا اس کی جگہ نیا پل بنے گا اور ایک دو برساتوں کے بعد ذرا اس کی حالت بھی دیکھ جائیے گا۔

یہ تو خیر انگریزوں کے زمانے کا اینٹوں کا پُل تھا۔ پانی پت کے پاس شاہ جہاں کے زمانے کا اینٹوں کا کوس مینار تھا جو اتفاق سے نئی سڑک کے بیچ میں آ گیا۔ مزدوروں کو حکم ہوا کہ مینار گرا دیں۔ ہوا یہ کہ خود مزدور تھک کر ڈھیر ہو گئے مگر مغلوں کا مینار ٹس سے مس نہ ہوا۔ بالآخر بارود سے اُڑانا پڑا۔

کنٹونمنٹ سے نکل کر پانچ میل دور ہم انبالہ شہر میں پہنچے اور سائیں توکل شاہ کی مسجد دیکھنے گئے۔ چار جانب حجرے ہی حجرے، محرابیں ہی محرابیں۔ کتنے ہی در کتنے ہی دریچے۔ بڑے سے صحن کے درمیان بابا سائیں کی درگاہ اور مغرب کی سمت مسجد اور مسجد بھی وہ جس نے ایسے ایسے منظر دیکھے ہوں گے کہ چھاتی پھٹ جائے۔

قاری محمد اسحاق صاحب جو ۱۹۶۲ء میں یہاں خطیب اور امام ہو کر آئے اُس کا قصہ سنا رہے تھے۔ میں، راجندر ملہوترا صاحب اور دونوں نوعمر ہندو لڑکے حیرت سے سُن رہے تھے:

"یہ بڑی تاریخی حیثیت کی مسجد ہے۔ ایسی مسجد آپ کو ہریانہ پنجاب میں ایک بھی نہیں ملے گی۔ اس کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ پارٹیشن کے بعد جب پنجاب اور ہریانہ کی ہزاروں مسجدیں ویران ہو گئیں اور ان کے اندر رہائش ہو گئی یا اُن کا استعمال بدل دیا گیا، یہ واحد مسجد ہے اور یہ درگاہ توکل شاہ ایسی ہے کہ پارٹیشن کے بعد بھی ایک دن بھی اس کا غلط استعمال

نہیں ہوا۔ کیسے؟۔ اس لئے کہ جب یہاں مسلمان باقی نہ رہے تو قدرت خداوندی سے ایسا ہوا کہ اِس جگہ کو حکومت کی طرف سے لڑکیوں کا کیمپ بنادیا گیا جو فسادات کے دوران اغوا کی گئیں۔ تو مشرقی پنجاب میں جتنی مسلمان لڑکیاں برآمد کی جاتی تھیں وہ اس کیمپ میں رکھی جاتی تھیں۔ اُس زمانے میں اِس مسجد میں ایک ایک وقت میں پانچ پانچ سو لڑکیاں رہی ہیں۔ مجھے ایسی لڑکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس زمانے میں کیمپ کی انچارج بن کر یہاں رہیں۔ تو یہ مسلمان لڑکیوں کا کیمپ رہا۔ جب کہ اَور کسی مسجد میں نہ اذان ہوتی نہ نماز ہوتی تھی، نہ تلاوت کلام پاک ہوتی تھی، یہاں کئی کئی سو لڑکیاں قرآن پاک پڑھتی تھیں"۔

یہ سارا وہ خطہ ہے جہاں تاریخ کی ایک کروٹ نے ایک دنیا بدل ڈالی ۱۹۴۷ء میں ایک پوری کی پوری آبادی اٹھی اور چلی گئی۔ اور پھر جو ویران دالانوں میں موت کی خاموشی چھائی اور سنسان صحنوں میں خوف کے جھکڑ چلے تو شور اور سناٹے نے ملکر کتنی ہی راتیں ماتم کرتے گزاریں۔ منظر کے بدلنے کی جو پہچان باقی رہ گئی ہے وہ سڑکیں، بازار اور درخت نہیں ہیں، وہ مسجدیں ہیں: قاری محمد اسحاق صاحب نے بتایا:

"انبالہ میں تقریباً دو سو مسجدیں ہیں۔ اور اس وقت اُن میں سے چار پانچ مسجدیں آباد ہیں"۔

یعنی دو سو میں سے پانچ مسجدیں باقی رہیں۔ ظاہر ہے کہ عبادت گاہ اپنی عمارت سے نہیں، اپنے عبادت گزاروں سے ہوتی ہے۔ وہ نہ ہوں تو کیسی محرابیں اور کیسے کلس، سب کا حال انبالہ چھاؤنی کے سینٹ پال کیتھیڈرل جیسا ہوتا ہے۔

البتہ طوفان کے آتے جاتے ریلوں میں جو صحیح سلامت رہے وہ اولیاء اللہ کے مزار تھے۔ اس علاقے کی عجیب روایت رہی ہے کہ ان بزرگوں سے فیض پانے والوں

ہیں غیر مسلم ہمیشہ پیش پیش رہے۔ سو برس پرانے گزٹیئر میں لکھا ہے کہ خضری کے قریب پہاڑ پر سخی سرور کا مزار ہے جس پر آنے والے سارے کے سارے عقیدت مند ہندو ہوتے ہیں۔ گزٹیئر میں شاہ خالد ولید کا ذکر بھی ہے جنہوں نے اپنا سر ملتان میں چھوڑ دیا تھا اور جن کا دھڑ ہریانہ آیا تھا جو روپڑ میں دفن ہے۔ اور کتنے ہی شہید سر کے بغیر لڑتے رہے۔ اُن کی قبریں سدھورا میں ہیں اور قطب الدین ایبک کے دور کے ایک بڑے بزرگ لکھی شاہ انبالہ میں دفن ہیں جن کے بارے میں ایک زمانے میں عقیدہ یہ تھا کہ وہاں خود قطب الدین ایبک دفن ہے۔

انبالہ کی مسجدوں کے اجڑنے اور دوبارہ آباد ہونے کی بہت سی کہانیاں ہیں مگر انبالہ کینٹ کی جامع مسجد کا حال سب سے جدا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے یہ مشرقی پنجاب کی نئی مسجدوں میں سب سے عالیشان مسجد تھی کہ وقت کے ایک ہی جھونکے میں اس کا چراغ بجھا اور یہ تاریکی میں ڈوب گئی۔ اس کی باقی داستان قاری محمد اسحاق صاحب نے سنائی:

"غالباً ۵۷ء میں انڈو پاک مشاعرہ ہوا۔ قتیل شفائی، طفیل ہوشیار پوری اُس مشاعرے میں آئے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تو اُس جامع مسجد کے سامنے ایک ہندو شاعر رام کشن تمنا رہتے تھے۔ بڑے بزرگ شاعر تھے اور پاکستان کے مشہور شاعر وقار انبالوی صاحب کے خاص دوستوں میں تھے۔ تو مشاعرہ ختم ہونے کے بعد تقریباً تین بجے ہم سب رام کشن تمنا صاحب کے ہاں آئے، وہاں ہندوستان اور پاکستان کے سارے ہی شاعر موجود تھے، تو تین بجے کے قریب مجھے احساس ہوا کہ یہ عمارت، جس کی پشت پہ ہم کھڑے ہیں، یہ مسجد معلوم ہوتی ہے۔ تو میں نے رام کشن صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا عمارت ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ مسجد ہے۔ اور یہ بڑی آباد مسجد تھی۔ یہاں ہزاروں مسلمان نماز پڑھنے آتے تھے۔ عید بقر عید پہ باہر سڑکوں پر بھی جماعت ہوتی تھی اور ہم

بڑے خوش ہوتے تھے دیکھ کر لیکن اب اس کی بڑی بے حرمتی ہو رہی ہے، اس میں لوگوں کی رہائش ہے۔

اُن کی یہ باتیں سُن کر میرے دل پر چوٹ سی لگی اور خدا شاہد ہے کہ میں نے اپنے ان دوستوں طفیل ہوشیارپوری، قتیل شفائی اور سب سے کہا کہ آؤ خدا سے دعا کریں، یہ تہجد کا وقت ہے، دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہے، ہم اس وقت دعا کریں کہ یہ مسجد جو ہے اس میں خدا ہماری زندگی میں ایک موقع ایسا دے کہ ہم اس میں نماز پڑھ سکیں۔

خدا کی شان دیکھئے کہ وہ دعا جو اُس رات کی گئی تھی وہ اس طرح قبول ہوئی کہ میں نے جتنا مانگا تھا اُس سے بہت زیادہ ملا۔ یعنی میں نے صرف ایک دفعہ نماز پڑھنے کی دعا مانگی تھی لیکن ہوا کیا؟ جب میں پنجاب وقف بورڈ کی طرف سے انبالہ کا خطیب ہو کر آگیا تو میں نے اس مسجد کے ناجائز قابضین پر مقدمہ دائر کیا۔ وہ مقدمہ کچھ سال بعد کامیاب ہو گیا اور وقف بورڈ نے اُن لوگوں کو بے دخل کر دیا۔ پھر اُس مسجد کو دھلوایا گیا اور وہاں کے حکام نے بڑا تعاون کیا اور جتنے غیر مسلم قریب رہتے تھے سب نے ساتھ دیا اور ناجائز قابضین کو نکالنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ مجھے بڑا فخر ہوا اس بات پر اور بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں ----- ہمارے ہی ملک میں کیا، ہر جگہ ابھی انسانیت زندہ ہے اور جہاں کچھ لوگ خراب ہیں، اکثریت تو اچھے ہی لوگوں کی ہے۔ اچھے لوگ نہ ہوں تو دنیا ہی قائم نہ رہے۔ تو ہم نے اس مسجد کو جب خالی کرالیا، اس میں سفیدی ہوئی تو اُس میں پنجاب وقف بورڈ کے سیکرٹری کی طرف سے جمعے کی نماز پڑھانے کا جو آرڈر ہوا وہ میرے نام ہوا۔ اور میں نے جب وہ جمعے کی نماز پڑھائی وہاں جا کر تو کئی سو آدمی تھے۔ اُس

میں ہماری آرمی اور ایئر فورس کے مسلمان آفیسر بھی موجود تھے۔ تو جب میں خطبہ دینے کے لئے منبر پر گیا تو میں خطبہ پڑھ نہیں سکا اور مجھے اتنا رونا آیا کہ مجھے ہچکیاں بندھ گئیں اور جس قدر وہاں لوگ تھے سب رونے لگے۔ اتنے روئے کہ یوں لگتا تھا کوئی قیامت یہاں ہو گئی ہے کیونکہ ہمارے دلوں پر واقعی ایک عجیب وغریب قیامت گزر رہی تھی۔"

— اور کیوں نہ گزرتی کہ تاریخ اُن ایمان والوں کے تذکرے سے خالی نہیں جو روتے روتے سجدوں میں گر جایا کرتے تھے۔

پنجاب اور ہریانہ کی تمام مسجدوں، درگاہوں اور وقف املاک کی نگرانی پنجاب وقف بورڈ کرتا ہے۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اس وقف بورڈ نے بڑے کٹھن دن دیکھے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ادھر دو ہونہار نوجوانوں نے اس وقف بورڈ کو سنبھالا ہے تو اوقاف کی تقدیر بدل گئی ہے اور یہی ادارہ جو خسارے میں دھنستا چلا جا رہا تھا اور ۴۵ لاکھ روپے کا مقروض ہو گیا تھا اس کا نظم ونسق اب خوش اسلوبی سے چلا ہے تو یہی خسارہ منافع میں بدل گیا ہے اور اس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ روپے کو پہنچنے والی ہے۔

اب جو صورت ہے اس کی بات قاری محمد اسحاق صاحب نے یوں کی اور اسی بات پر انبالے کی بات تمام ہوتی ہے:

"پنجاب وقف بورڈ ایک ایسا ادارہ ہے کہ اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس کے ذریعے سے یہاں کی مسجدیں آباد ہیں۔ ہر شہر میں آپ کو دو چار مسجدیں ملیں گی، ان میں ائمہ ملیں گے، مؤذن ملیں گے، ہر مزار پر سجادگان ان کے تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے مقرر ہیں، وہ آپ کو ملیں گے۔

اب خدا کا شکر ہے کہ ہریانہ کا ضلع انبالہ جو ہے، یہ بارڈر کا ضلع ہے ادھر یوپی سے ملتا ہے، یہاں سے لے کر امرتسر تک ایک بھی ضلع، ایک بھی شہر، ایک بھی بڑا قصبہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں مسجدیں آباد نہ ہوں، جہاں خدا کا نام بلند نہ ہوتا ہو اور قرآن پاک نہ پڑھا جاتا ہو اور پانچوں وقت نمازیں نہ ہوتی ہوں۔"

پانی پت کی لڑائی جاری ہے؟

مَیں جو بس میں چڑھا تو وہ مسافروں سے بھری ہوئی تھی، البتہ سب سے آگے والی کچھ نشستیں خالی تھیں۔ مَیں بس کے فرش پر رکھی ہوئی بُغچیوں، گٹھڑیوں، ٹرنکوں اور سوٹ کیسوں کو پھلانگتا ہُوا اُن خالی نشستوں کی طرف لپکا۔ البتہ آنکھوں کے گوشوں سے مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ باقی مسافر مجھ پر ترس کھا رہے ہیں اور مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی خوشی خوشی قصائی کے چھُرے کی طرف لپکنے والے بکرے کو دیکھتا ہے۔

اب مجھے احساس ہُوا کہ گرمیوں کے موسم میں اِن بسوں کے انجن بھٹی کی طرح دہکتے ہیں۔ لوگ بسوں کے دروازے میں لٹک کر سفر کر لیتے ہیں مگر انجن کے قریب نہیں بیٹھتے۔

مَیں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کنڈکٹر نے یہ تو نہیں کہا کہ صاحب۔ ہم جملہ مسافران کو آپ سے ہمدردی ہے، البتہ صرف اتنا کہا کہ اپنا تھیلا انجن سے دُور رکھئے گا ورنہ اس کے اندر پلاسٹک کی چیزیں پگھل جائیں گی۔

مَیں نے ڈر کر تھیلا پیچھے کھینچ لیا۔ آنے والا راستہ میرے دھیان کو آگے کھینچ رہا تھا۔ انبالے سے آگے جی ٹی روڈ بظاہر سپاٹ میدانوں سے گزرتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ میدان ایسے ورق ہیں جن پر ہزاروں برس کی تاریخ رقم ہے۔

راہ میں آگے تھانیسر تھا جس کا نام بدل کر کروکشیتر رکھ دیا گیا ہے۔ یہی تھانیسر تو تھا جو

محمود غزنوی کی راہ میں پڑا تھا، جس کے قریب پہلے پرتھوی راج نے شہاب الدین غوری کو اور پھر شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دی تھی۔ یہی راجا ہرش کا پایۂ تخت تھا۔ یہیں برہم سر ہے جس میں گناہ دُھلتے ہیں۔ یہیں کورو اور پانڈو لڑے تھے۔ یہیں سبز گنبد کی وہ دلکش عمارت ہے جو شیخ چلّی جلال کا مقبرہ کہلاتی ہے۔ یہیں آٹھ ستونوں پر ایستادہ سُرخ پتھر کی لال مسجد ہے، فتح پور سیکری جیسی۔

اب تو کروکشیتر کی بڑی یونیورسٹی بھی ہے۔ راستے کے ایک پڑاؤ میں یونیورسٹی کے لڑکے پکنک منا رہے تھے۔ ایک بار دیکھا تو وہ بڑے سے دائرے کی شکل میں بیٹھے اپنا مشاعرہ کر رہے تھے اور کچھ دیر بعد دیکھا تو وہ شراب کی ایک بوتل پر چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔

درختوں کے جھنڈوں کے درمیان دوڑتی ہوئی ہماری بس اچانک بائیں جانب مڑی۔ ایک سوکھے پڑے ہوئے برساتی دریا کو پار کیا اور اس کے بعد کرنال اور پانی پت کے میدان شروع ہو گئے۔ راہ میں کرنال آیا تو میں وہیں اُتر گیا۔

میں کرنال میں نوابوں کی حویلی دیکھنا چاہتا تھا۔ بڑی سڑک کے کنارے ایک بہت بڑی مسجد میں سرکاری دفتر دیکھے۔ بازار دیکھے، دکانیں دیکھیں جن کے سارے سائن بورڈ ہندی میں تھے۔ کہیں اُردو کا ایک حرف بھی نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد شہر کے بیرونی کنارے پر اچانک گنبدیں، مینار اور محرابیں نظر آنے لگیں۔ وہیں پرانی کھجوروں کے جھنڈ تھے۔ وہیں ایک اونچی حویلی نظر آ رہی تھی جس کے چار کونوں پر چاند بنے ہوئے تھے جن کے اندر ستارے کی جگہ کبھی بجلی کے بلب لگے ہوں گے۔ یوں محسوس ہوا کہ باقی شہر سے یہ الگ کوئی شہر ہے۔

وہیں بُو علی شاہ قلندر کا وہ مقبرہ بھی تھا جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ قلندر صاحب وہاں دفن نہیں۔ وہیں اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی مسجد تھی۔ اور بھی کئی مسجدیں تھیں۔ کچھ کنبے آباد تھے۔ عورتیں پردے میں تھیں۔ باہر بچے کھیل رہے تھے۔ مجھے مقبرے کے احاطے میں دو نوجوان ملے۔ ان میں سے ایک اسکوٹروں کا مکینک تھا۔ دُوسرا ابھی تک طے نہیں کر

پایا تھا کہ اس کی باقی زندگی کیسے کٹے گی۔

وہ دونوں مجھے نوابوں کی حویلی کے بڑے دروازے تک لے گئے۔ نہایت شاندار تین منزلہ عمارت۔ سر سے پیر تک مسلم طرزِ تعمیر، در، دریچے، محرابیں، ستون، جالیاں، برآمدے، راہداریاں، ان سب پر چالیس برس کی کائی چڑھ چکی تھی۔ محرابوں میں اینٹیں چن کر حویلی کا بٹوارہ کر دیا گیا تھا۔ نیچے بھینسیں پلی تھیں۔ اوپر لوہے کے تاروں کی الگنیاں بندھی تھیں۔ دال میں ہینگ کا بگھار لگ رہا تھا۔ مَیں تیزی سے باہر نکل آیا۔

کرنال، کوروؤں کے جرنیل راجا کرن کا تاریخی شہر ہے۔ بابر یہیں سے گزر کر پانی پت گیا تھا، اور نادر شاہ نے اسی شہر کی فصیل کے عین باہر محمد شاہ سے جنگ کی تھی۔ دو گھنٹے کی لڑائی میں شہر پناہ کی بنیادوں میں بیس ہزار ہندوستانیوں کے پشتے لگ گئے تھے۔ بے پناہ خزانہ نادر شاہ کے ہاتھ لگا تھا اور اگلے روز محمد شاہ نے خود کو بھی نادر شاہ کے حوالے کر دیا تھا۔ یہیں سے چل کر نادر شاہ دلی گیا تھا۔ وہی نگر جو سو مرتبہ لوٹا گیا۔

یہاں سے پانی پت میں اگر پُرانے راستے پر چلتا ہوا جاتا تو راہ میں دس کوس مینار پڑتے۔ وہ شہر پڑتا جو گھرونڈا کہلاتا ہے اور جہاں قدیم مغل سرائے کے دو عظیم الشان صدر دروازے پڑتے جو آج تک ایک دوسرے کے مقابل یوں کھڑے ہیں جیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس روز کی داستان کہہ رہے ہوں جب علاقے کے کسی راجا کی فوج محمد شاہ کی مدد کے لئے وہاں پہنچی تھی اور دستک دے دے کر التجا کر رہی تھی کہ اُسے اندر آنے دیا جائے لیکن ہندوستانی فوج نے ڈر کے مارے ان دروازوں کو نہیں کھولا۔ اس دوران نادر شاہ کی فوج پہنچ گئی ہندوستانی راجا کے سپاہی دستک دیتے جاتے تھے اور گاجر مولی کی طرح کٹتے جاتے تھے۔ خون سے آلودہ انگلیوں نے اُس روز گھرونڈے کے ان دروازوں پر لکیریں کھینچ کر بربریت کی کتنی ہی داستانیں لکھی ہوں گی۔

تھوڑی دیر بعد پانی پت آ گیا۔ مَیں نے بیتاب ہو کر بس کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ میرا خیال

تھا کہ ہر طرف بابر، ابراہیم لودھی، اکبر، ہیموں بقال، احمد شاہ دُرانی اور ہولکروں، سندھیاؤں اور گائیکواڑوں کی یادگاریں نظر آئیں گی۔ لیکن ہر طرف پنج رنگے اچار کے سائین بورڈ نظر آئے۔
نیا پانی پت بہت سے پرانے پانی پتوں کے کھنڈروں کے اوپر بنا ہوا تھا۔

جمنا اور مسلم آبادی، دونوں اس شہر کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔

بُوعلی شاہ قلندر کی اس سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے مجھے دو باتوں کا خیال آیا۔ ایک تو یہ کہ کوئی ایسا پُرانا باشندہ مل جائے جو پانی پت کا سارا حال کہہ سنائے، اور دوسرے کوئی اللہ کا بندہ مل جائے جو گرم نان کے ساتھ بہت سا سالن کھلا دے کیوں کہ بُھوک اُس دوپہر بہت زور کی لگی تھی۔

میرے میزبان مجھ سے کہنے لگے کہ سب سے پہلے قلندر صاحب کی درگاہ پر چلیے۔ اِس شہر میں اُس سے زیادہ برکت والی کوئی جگہ نہیں۔ ہم بڑے بازاروں اور ان کے اندر چھوٹے بازاروں اور ان کے اندر تنگ اور پیچ بیچ بازاروں کے راستے پرانے دروازوں میں سے گزرتے ہوئے اُس شاہانہ دروازے میں داخل ہوئے جس میں سامنے حضرت شرف الدین بُوعلی شاہ قلندر پانی پتی محوِ آرام تھے اور بائیں جانب خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی محوِ خواب تھے۔

درگاہ میں حاضری دینے والے غیر مسلموں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک بورڈ پر لکھا تھا: اس درگاہ کے دروازے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

نو بیاہتا جوڑے قلندر صاحب کی آشیرواد لینے آ رہے تھے۔ مریض سہارا دے کر لائے جا رہے تھے۔ جن کی مرادیں پوری ہوئیں وہ پھُول، چادریں اور مٹھائی لئے چلے آ رہے تھے۔ ان سب کے درمیان میں الگ سا نظر آیا اور درگاہ میں رہنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور ابھی پہلے ہی شخص سے میرا تعارف کرایا گیا تھا کہ سارا عملہ، سارے نگراں، سارے خادم، مجاور اور سجادے نکل آئے۔ وہ سب بی بی سی سنتے تھے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔

سید اختر حسین سرہندی، جو درگاہ کے سجادہ ہیں، مجھ سے بولے: "خوب آئے آپ۔

کھانا لگنے ہی والا تھا۔ پہلے ہاتھ دھوئیے اور جو رکھا سو کھا ہے وہ نوش فرمائیے۔" اور ذرا ہی دیر بعد دسترخوان پر گرم نان اور بہت سا سالن چُن دیا گیا۔

اُس دوپہر رزق پہنچائے جاتے کا ایک وعدہ رہ رہ کر یاد آیا۔

اب سوال تھا کہ پانی پت کا احوال کس سے سُنا جائے؟ پرانا زمانہ دیکھے ہوئے اُردو بولنے والے بزرگ تو اس شہر سے کبھی کے جا چکے تھے، اب یہ گفتگو کون کرے گا؟ اچانک کسی کے ذہن میں ایک نام بجلی بن کر کوندا۔ لالہ رام چرن اگروال!۔ اس شہر کو جاننے والا اُن سے بہتر کوئی شخص نہیں۔

ہم پھر اُن ہی تنگ بازاروں، چھوٹے بازاروں، بڑے بازاروں اور پُرانے دروازوں سے گزرتے ہوئے لالہ رام چرن اگروال صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بزرگ، شفیق، مہربان، نرم گفتار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوش گفتار۔ وہ دیر تک پرانے پانی پت کی باتیں کرتے رہے۔ پس منظر میں سو طرح کی آوازیں تھیں۔ فرش دُھل رہے تھے، برتن منجھ رہے تھے، نل سے پانی گر رہا تھا، کھانا پک رہا تھا، سارا کُنبہ کام میں مصروف تھا لیکن اگروال صاحب کی باتوں میں ایسی لطافت تھی کہ سننے والوں کا دھیان ایک لمحے کو نہیں بھٹکا۔ وہ اس صدی کے پانی پت کا احوال کہہ رہے تھے:

"پارٹیشن سے پہلے پانی پت کی آبادی چالیس پینتالیس ہزار کے قریب تھی۔ جس میں سے ایک حصے کے قریب ہندو تھے اور تین حصے کے قریب مسلمان تھے۔ مسلمانوں میں زیادہ تر لوگ محنتی اور غریب آدمی تھے۔ تھوڑے سے مسلمان زمیندار تھے۔ جو اچھے صاحبِ حیثیت مسلمان تھے انھوں نے میٹرک تک تو یہیں تعلیم پائی اس کے بعد وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں چلے گئے اور وہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ باہر چلے گئے۔"

مَیں نے اگروال صاحب سے پوچھا کہ آج کے پانی پت کی کیا کیفیت ہے؟

انھوں نے کہا: "پانی پت ہمیشہ سے ایک صنعتی شہر رہا ہے۔ یہاں دو صنعتیں تھیں۔ ایک صنعت تھی کمبل کی جو ہاتھ سے بُنے جاتے تھے، اور ایک صنعت تھی کانسی کے برتنوں کی۔ یہ کمبل اور برتن تمام ہندوستان کو جاتے تھے۔ تو وہ تمام کاریگر مسلمان تھے اور وہ یہ چیزیں بناتے تھے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں جب کمبلوں کی ضرورت پڑی تو ان ہی لوگوں نے جو کملیا کہلاتے تھے، کمبل بنائے۔ اُن کے پاس پیسہ تو تھا نہیں۔ وہی لالہ لوگوں سے پیسہ لیتے تھے، اون خریدتے تھے، خود کتائی کراتے تھے اور کمبل بناتے تھے۔ پھر جب ۱۹۳۹ء میں جرمنی کی لڑائی شروع ہوئی، اور یہ حال ہی کا واقعہ ہے، اُس وقت انہوں نے بہت کمبل بنایا اور جہاں جہاں بھی ولایتوں میں کمبل کی مانگ ہوئی، وہ کمبل انہوں نے بنایا، اور ویسے دیسی کمبل ہاتھ کا بنا ہوا تمام انڈیا میں بھی چلتا تھا۔ اس وجہ سے یہاں لوگوں کو روزگار تو ہمیشہ ملتا رہا۔

لوگ بڑے محنتی، جفاکش تھے اور قناعت بہت تھی اُن میں۔ تھوڑی سی آمدنی کے اندر بھی خوش رہتے تھے۔ سادہ چلن تھا، سادہ لباس تھا، سادہ کھانا پینا تھا۔ یہ جو آج کل ہم اتنی چیزیں دیکھتے ہیں یہ چیزیں تو تھیں نہیں۔

اُس کے بعد پارٹیشن ہو گیا۔ پارٹیشن ہونے کے بعد مہاتما گاندھی یہاں تین دفعہ آئے اور مسلمانوں سے التجا کی کہ تم لوگ یہاں سے مت جاؤ۔ انہوں نے یہی کہا کہ واسطے اللہ کے ہم کو یہاں سے بھیج دیجئے۔ وہ لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد میں راج پلٹی ہو گئی۔ قسم قسم کے لوگ یہاں آئے۔ ضلعوں ضلعوں کے لوگ آئے۔ جو بُن گر لوگ تھے، جو ٹیکسٹائل کے آدمی تھے ان کو وہی مکان اور وہی گھر الاٹ کئے گئے جو گھر مسلمان چھوڑ کر گئے تھے اور انہوں نے، چونکہ نیا زمانہ آ گیا ہے، نئی قسم کے کمبل بنانے شروع کئے۔ نئی قسم کی کھیسیں، اور چادریں بنانی شروع کیں۔ یہ لوگ بیوپاری لوگ ہیں، وہ لوگ جو مسلمان تھے غریب آدمی

تھے، یہیں بناتے تھے یہیں بیچتے تھے۔ یہ لوگ انڈیا کے ہر چپے میں اپنا مال پہنچاتے ہیں حتیٰ کہ باہر کے ملکوں کو بھی پہنچایا۔ یہ ترقّی کی ہے انھوں نے۔"

پانی پت کے پرانے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے اگروال صاحب نے ایک دلچسپ بات کہی۔

"مجھے اچھے طریقے سے یاد ہے کہ ۳۵ء میں یا ۳۴ء میں یہاں کسی آدمی کے پاس کوئی ٹرک نہیں تھا۔ میری دکان یا بیٹھک جی ٹی روڈ پر تھی تو ہم دیکھتے تھے کہ پنجاب سے روئی کی گانٹھوں کے ٹرک دلّی کی طرف جاتے تھے۔ تو ہم یہ خیال کیا کرتے تھے کہ جس کی بس ٹوٹ جاتی ہوگی وہ چھت اُتار کر ٹرک بنا لیتا ہوگا۔

اس کے بعد یہاں ایک لالہ بشمبر داس تھے تو انھوں نے ایک ٹرک بنایا اور اب یہاں یہ حالت ہے کہ چار پانچ سو ٹرک پانی پت میں ہیں اور بھگوان سب کو روٹی دے ہی رہا ہے۔"

مَیں نے اگروال صاحب کو یاد دلایا "کچھ دیر پہلے آپ کہہ رہے تھے کہ پانی پت باہر سے آنے والوں کو بہت راس آتا ہے۔ اُس کا کیا قصّہ ہے؟"

کہنے لگے: "بس کچھ ایسا ہے کہ مَیں تو ولی اولیاؤں کا بڑا معتقد ہوں۔ یہاں تین چار درگاہیں ایسی ہیں کہ جن کے شرف سے ہم لوگ پار اُتر رہے ہیں۔"

اگروال صاحب دیر تک زمانے سے گلے کرتے رہے کہ اُس نے اس علاقے کے کیسے کیسے متبرک مقامات مٹا ڈالے۔ دو بزرگوں کے مزاروں پر دو درخت ایسے تھے جن کی پتّیاں کھانے سے بیماروں کو شفا ہو جاتی تھی، خصوصاً ایک درخت کی پتّیاں چبانے سے ہر قسم کا بخار اُتر جاتا تھا۔ لوگوں نے انھیں بھی کاٹ ڈالا۔

اگروال صاحب کے چہرے پر اُداسی کے رنگ نمودار ہونے لگے۔

ایسے شفیق، ایسے عنایت اور محبّت کرنے والے لوگ اس کے بعد نہیں رہیں گے۔

سوچتا ہوں کہ پانی پت کے اس چھوٹے سے سفر نے مجھے کتنا سرشار کیا۔ سچ ہے، کچھ

زمینیں فیض کی، برکتوں کی سرزمینیں ہوا کرتی ہیں۔

کچھ دیر پہلے قلندر صاحب کی درگاہ میں دل کو کیسی راحت ملی تھی۔ اس عمارت کے نقوش دُھندلے پڑ گئے تھے اس کے باوجود گواہی دے رہے تھے کہ اسے علاؤالدین خلجی جیسے بادشاہ نے بنوایا تھا۔ کبھی یہ روضہ کتنا دلکش رہا ہوگا۔

یہ وہی عمارت تو ہے جس میں کسوٹی کے پتھر کے چھ ستون ہیں۔ چار سالم اور دو آدھے۔ نہ کہیں جوڑ، نہ کوئی شگاف۔ کہتے ہیں کہ کسوٹی کے اتنے بڑے پتھروں سے تراشے ہوئے ستون پورے برصغیر میں اور کہیں نہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ کبھی کوئی یورپی جہاز سوات کے آس پاس کہیں ڈوبا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں غوطہ خوروں نے سمندر کی تہہ میں جا کر اس میں سے یہ پتھر نکالے۔

ان تین سو برسوں میں بے شمار خواتین نے آتے جاتے اپنے سونے کے زیور آزما کر دیکھے ہوں گے۔ ستونوں پر ہزاروں سنہری لکیریں کھنچی ہیں۔

پانی پت کیا شہر اور کیا مقام رہا ہوگا کہ دُور دُور سے بزرگ آکر یہاں آباد ہوتے اور پھر یہیں کی خاک میں سو رہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جرنیلی سڑک کے کنارے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک اولیاء اللہ نے کتنے بہت سے ڈیرے ڈالے ہوں گے کہ آج تک کوئی شہر، کوئی قصبہ ان کی نشانیوں سے محروم نہیں۔ بالکل یہی بات اس روز سیّد اختر حسین سرہندی صاحب نے بھی کہی :

"دلّی سے آپ کسی بھی بڑے شہر میں جائیں، امرتسر تک نہیں بلکہ لاہور۔ بلکہ پشاور تک جائیں، کوئی بھی شہر آپ دیکھ لیں۔ یہاں راستے میں سونی پت آتا ہے، پھر پانی پت آتا ہے۔ اس کے بعد کرنال ہے۔ کروکشیتر ہے، انبالہ ہے، سرہند ہے، کھنّا ہے، پھگواڑہ ہے، جالندھر ہے۔ کوئی شہر ایسا نہیں جہاں پر اولیاء اللہ کے مزارات نہ ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ اس سڑک پر آپ کو ہر طرف

رونق ہی رونق نظر آتی ہے ان اولیاء اللہ کے طفیل سے۔"

اختر حسین صاحب دیر تک اُس علاقے کی باتیں کرتے رہے۔ مثلاً مولانا حالی کی عمدہ قبر بن گئی ہے اور شہر کے ایک پارک کا نام حالی پارک رکھا گیا ہے۔ پانی پت کی پہلی جنگ جہاں لڑی گئی تھی وہاں اس کی یادگار قائم کر دی گئی ہے اور یہ کہ بو علی شاہ قلندر کا اصل مدفن یہی ہے۔ انھوں نے ریاضت بہت عرصے کرنال میں کی تھی لیکن وفات پانی پت آکر پائی۔ کرنال والوں کو جب یہ خبر ملی تو وہ میت لے جانے کے لئے ایک تابوت لے آئے۔ اُس وقت تک حضرت دفن کئے جا چکے تھے مگر کرنال والے بضد تھے کہ میت ہمراہ لے جائیں گے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انھیں خالی ہاتھ لوٹ جانے پر آمادہ کیا گیا۔ چلتے وقت انہوں نے خالی تابوت اُٹھایا تو اسے بہت وزنی پایا۔ اوپر سے چادر سرکا کر دیکھا گیا تو بو علی شاہ آنکھیں موندے محوِ آرام تھے چنانچہ کرنال میں بھی ان کی نہ صرف ایک قبر بلکہ اس پر شاندار عمارت بھی بنی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ دلّی سے لوٹتے ہوئے نادر شاہ نے پانی پت میں ان کی قبر پہ حاضری دی، اس کے بعد جب وہ کرنال پہنچا اور اُسے بتایا گیا کہ اِس قبر میں بھی بو علی شاہ قلندر دفن ہیں تو اُسے طیش آگیا۔ اُس نے کہا کہ ایک فقیر دو جگہ دفن ہو، یہ کیا تماشا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے قبر کے تعویذ پر تلوار ماری۔ کہتے ہیں کہ اُس کا نشان آج بھی موجود ہے۔

تصدیق کے لئے مجھے دوبارہ کرنال جانا پڑے گا۔

البتہ جس بات کی تصدیق کے لئے دوبارہ جانے کی ضرورت نہیں وہ یہ ہے:

قلندر کی درگاہ کے احاطے میں بہت سے لوگ جمع ہوگئے اور دنیا زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔ مجھے جس کی باتوں نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ دین محمّد تھا۔ دین محمّد رُہتک کا دیہاتی ہے اور وہیں کے ایک گاؤں موگرا کھیڑی کا باشندہ ہے۔ اُس گاؤں میں مسلمانوں کے اب صرف دو گھرانے رہ گئے ہیں۔

دین محمّد مجھے پانی پت کے بارے میں، رُہتک کے دیہات کے رسم و رواج کے متعلق

اور باقی رہ جانے والے مسلمانوں کے سلسلے میں بتا رہے تھے۔ مَیں نے دین محمّد سے اس علاقے کے دیہات کی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ اس گفتگو میں کچھ باتیں ایسی بھی آئیں گی جو ممکن ہے کچھ پڑھنے والوں کو ناگوار محسوس ہوں مگر توجہ سے پڑھئے گا کہ معاشروں پر جب بُرا وقت پڑتا ہے یا زوال آتا ہے یا زندگی دشوار ہو جاتی ہے تو اُس زندگی میں لطف ڈھونڈنے کی سوچ کتنی بدل جاتی ہے اور اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ دین محمّد کی یہ ساری گفتگو رہتک کے مخصوص لب و لہجے میں ہے۔ مَیں نے پوچھا: "دین محمّد! تمہارے علاقے میں لوگ کیا کھاتے پیتے ہیں؟"۔

"کھاویں پیویں گے کیا۔ دیہاتی آدمی ہیں۔ اپنی چٹنی روٹی، گنٹھا پھوڑا اپنی روٹی کھالی۔ گاؤں کھیت میں چلے گئے۔ لسّی کا لوٹا اور جی یہ گنٹھا پھوڑا اور اُس سے اپنا پھوڑ کے کھالی۔ اور سارا یہ ہے یہاں تو، مسلمان ہو ہندو ہو، مطلب یہ کہ یہاں کے باشندن کا رواج سب کچھ ایک ہے۔ کھانا پینا سب ایک ہے"۔

مَیں نے پوچھا "پہنتے کیا ہیں؟"۔

جھٹ جواب ملا "پہنتے کیا ہیں، اپنا یہ سادا سا پہلے گھاگھری پہنتے تھے اب سلوار لگ گئے پہننے، مسلمان پہنتے تھے صرف سلوار، پاجاما۔ اور مسلماناں کا پھَین پکڑ لیا۔ گھاگر تو اکیس گز کا ہوتا تھا اُس میں جُواں ہو جاتی تھیں۔ اور ایک ہمارے گاؤں کی بات ہے یہاں، موگرا کھیڑی کی ایک عورت میرے پڑوس میں لوٹ رہی تھی۔ چارپائی کے پائے کے ساتھ منہ بایا پڑی، اور کتے نے ٹانگ اُٹھا کے اُس پے مُوت دیا۔ وہ کہنے لگی کیا کری؟ میرا باپ کہنے لگا چدر سے تو منہ ڈھک کر سویا کر۔ وہ کہنے لگی جائے رو کا منہ میں مُوت گیا، کیا کروں؟ پانی لے کر کلا کرنے لگ گئی۔ میرا باپ کہنے لگا: نہیں۔ گردن کٹوا دے۔ بالکل ناپاک ہو چکی تُو تو"۔

میرا اگلا سوال، میرا آخری سوال بہت دشوار تھا۔

"دین محمّد" مَیں نے پوچھا "کیسی زندگی گزرتی ہے تمہاری اب ان دیہات میں؟

لوگ تمھیں پریشان تو نہیں کرتے ؟ سر پھٹول تو نہیں ہوتی ؟"

اس پر دین محمد نے اپنی زمینوں کے چھن جانے کا اور پھر سر پھٹول اور مقدمے بازی کا قصہ سنایا اور بتایا کہ کس طرح عدالت نے دونوں مسلم گھرانوں کی زمین واپس دلوا دی اور خیانت کرنے والوں کو سزائیں دیں۔ مگر زندگی اب بھی کچھ اتنی سہل نہیں۔ وہ سارا ماجرا سنا کر دین محمد نے یوں کہا:

"بس ہم خدا کی طاقت سے ہیں۔ ہم اب بھی کہتے ہیں گاؤں والوں سے۔ جیسے گاؤں والے چلتے ہیں ویسے ہم چلتے ہیں۔ وہ ایمانداری پر چلیں گے، ہم بھی ایمانداری پر چلیں گے، وہ بے ایمانی پر چلیں گے، ہم بھی چلیں گے۔ ہم نے صاف کہہ دیا۔ لیکن دب کر نہیں رہیں گے۔ کب تک رہیں گے دب کر؟"

کیا شکل بدل کر پانی پت کی جنگ اب بھی جاری ہے؟ میں سوچتا رہ گیا۔

Hasnain Sialvi

اب دلّی دُور نہیں

دلّی ابھی دُور تھی کہ کارخانوں کی لمبی لمبی چار دیواریوں پر اتنی ہی لمبی لمبی تحریروں میں گیروے چونے سے لکھے ہوئے اشتہار نظر آنے لگے: "بہترین رشتوں کے لئے ہم سے ملیں، نمبر چالیس فلاں فلاں روڈ۔ شادی بیاہ کے لئے ہمارے پاس آئیں، نمبر چالیس فلاں فلاں روڈ۔"

اتنی زیادہ دیواروں پر یہ اشتہار اتنی زیادہ مرتبہ لکھا جا چکا تھا کہ شادی کے اِس دفتر والے نے بعد میں اِس لمبی چوڑی تحریر کا تکلّف اُٹھا دیا۔ اب اُس نے جگہ جگہ لکھوا دیا: چالیس۔ چالیس! ۔ لوگ پڑھتے تھے اور سمجھ جاتے تھے کہ بہترین رشتوں کے لئے نمبر چالیس فلاں فلاں روڈ جانا پڑتا ہے۔

بالآخر بس دہلی کے علاقے میں داخل ہوئی۔ رونق اور چہل پہل کے اِس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہماری بس جس سینما گھر کے سامنے سے گزرتی تھی، اُس پر لکھا ہوتا تھا: بہو کی پکار۔ بہو کی پکار۔ یہ نئی فلم کا نام تھا۔ ساتھ ہی ایک تصویر بھی بنی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ ساس اور نندیں مل کر، وعدے سے کم جہیز لانے والی بہو پر مٹّی کا تیل چھڑک کر اُسے آگ لگا رہی ہیں اور وہ چلّا رہی ہے۔

مَیں نے اپنی بس میں بیٹھی ہُوئی اُس لڑکی کو ایک بار پھر دیکھا جو سارے راستے سرکاری ملازمتوں کے امتحانوں کے بارے میں ہر مہینے چھپنے والے رسالے پڑھتی رہی تھی، اعلیٰ ملازمتوں

کے خواب دیکھنے والے لاکھوں دوسرے نوجوانوں کی طرح !

سانولی سی رنگت، چہرہ شادابی سے محروم، کس کر گوندھی ہوئی چوٹی، موٹے سے سوتی کپڑے کا کرتا اور شلوار، اسی چھاپ کا چار تھوں کا دوپٹہ، پیروں میں سادہ مگر خوش نما چپل اور وہ موزے جو شاید صرف ہندوستان میں بنتے ہیں اور جن میں پیر کے انگوٹھوں کے لئے الگ جگہ ہوتی ہے تاکہ خواتین انگوٹھے والی چپل با آسانی پہن سکیں۔ اس کے پیروں کے پاس ٹین کا چوکور کنستر رکھا تھا جس کے اوپر ڈھکن لگا دیا گیا تھا اور اس میں چھوٹا سا تالا پڑا ہوا تھا۔

وہ سارے راستے رسالے پر جھکی رہی۔ قریب بیٹھے ہوئے کچھ نوجوان آپس میں چہلیں کر رہے تھے۔ ان کے کسی لطیفے پر لڑکی ذرا سا مسکرا دیتی تھی تو وہ ایک ہی لطیفے کو بدل بدل کر طرح طرح سے بیان کرتے تھے اور ہنس ہنس کر دُہرے ہوتے جا رہے تھے، صرف اس لئے کہ لڑکی بھی ہنس دے۔

میں سوچنے لگا ! اچھا فرض کیجئے کہ لڑکی ہنس دے۔ فرض کیجئے کہ بالوں میں تیل چپڑے، بیل باٹم کے پتلون اور ربڑ کی چپل والے نوجوان پر اُس کا دل آجائے۔ لگن کے دن یہی لڑکی بیاہ کر اسی نوجوان کے گھر میں جا رہے تو کیا یہ اسی طرح لطیفے سناتا رہے گا ؟

میری بس پھر ایک سینما گھر کے سامنے سے گزری، پھر اس کے پوسٹر پر میری نگاہ پڑی، ساس اور نندیں مل کر ٹین کے چوکور کنستر سے مٹی کا تیل بہو پر چھڑک کر اُسے آگ لگا رہی تھیں۔ پھر اچانک بس اسٹاپ آگیا۔ سامنے ایک بہت لمبی سی دیوار پر اتنی ہی لمبی عبارت تھی : بہترین رشتوں کے لئے ہم سے ملیں، نمبر چالیس فلاں فلاں روڈ۔

دفتروں میں چھٹی ہوئی تھی۔ ہزاروں لوگ سائیکلوں پر سوار گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ سائیکلوں کے پیچھے کیریئر پر یا تو وہ سوکھی لکڑی بندھی تھی جو گھر جا کر رات کا کھانا پکانے کے لئے جلائی جائے گی، یا وہ بیوی بیٹھی تھی جو جلنے سے بچ گئی۔

"کہاں چلوگے باؤ جی ؟" آٹو رکشا والے نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ہوٹل کا نام بتایا : فلاں یاتری نواس۔

"کسی بڑھیا ہوٹل لے چلوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کی مرضی" اُس نے کہا۔

"میٹر سے چلو گے؟" میں نے پوچھا

"ہاں جی، بالکل میٹر سے چلوں گا"

اور یہی ہوا۔ وہ بالکل میٹر سے چلا مگر تین میل کے راستے کو اُس نے تیرہ میل کا راستہ بنا دیا۔

"وہ سامنے کون سا دروازہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خونی دروازہ، باؤ جی"

"کیا یہاں مسافروں کو لوٹتے تھے؟"

"نئیں جی" میرے طنز کا تیر نشانے پر نہیں لگا "نئیں جی۔ یہاں لوگوں کو پھانسی پر چڑھاتے تھے"

جب سارے شہر کی سیر مکمل ہوگئی تو فلاں یاتری نواس آیا۔ یاتری نواس یعنی مسافر خانہ۔ نئی دہلی کے بیچوں بیچ اٹھارہ منزلہ عمدہ روشن عمارت۔ کشادہ کمرے اور کرایہ صرف اسّی روپے۔ ہندوستان بھر سے جو لوگ اپنے کام کاج کرانے دہلی آتے ہیں اور سرکاری دفتروں کے قریب ٹھہرنا چاہتے ہیں اور کمرے کے روزانہ تین تین سو روپے ادا نہیں کر سکتے۔ اُن لوگوں کو ذہن میں رکھ کر یہ بہت بڑا ہوٹل تعمیر کیا گیا ہے اور اس میں سارے فالتو خرچ بالکل ختم کر دیئے گئے ہیں تاکہ مسافر پر مالی بوجھ نہ پڑے۔ میرے دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ تجربے کی خاطر ایک رات سہی، اس ہوٹل میں رہ کر دیکھو۔

میں نے پوچھا "کوئی کمرہ مل جائے گا؟"۔

انگریزی میں جواب ملا "'YES' - WE HAVE GOT A ROOM"

دِلّی کے ہوٹلوں کا یہ ایک عجیب رواج ہے۔ ہوٹلوں کے اندر سب انگریزی بولتے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے لوگ یہاں آتے ہیں اور ان کی مشترکہ زبان ہندی نہیں، انگریزی ہے۔

ہندوستان بھر کے لوگ شاید یہاں سے جاتے وقت کچھ واجب الادا رقم اپنے ساتھ لے جایا کرتے ہوں گے لہذا کمروں کا کرایہ نہ صرف پیشگی لے لیا گیا بلکہ اُسّی کی بجائے سو روپے لئے گئے۔ وعدہ یہ تھا کہ بیس روپے چلتے وقت لوٹا دیئے جائیں گے۔

مَیں نے سو روپے گن دیئے۔ میرے ہاتھ میں چودھویں منزل کے ایک کمرے کی چابی تھما دی گئی۔ اپنا وزنی تھیلا اُٹھائے مَیں اپنے کمرے کی تلاش میں چلا اور جا کر لفٹ کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ اَسّی روپے کی رات کا کوئی دسواں حصہ تو یوں نکل گیا۔ کچھا کھچ بھر کر جب لفٹ چلی تو طبیعت کی آزاد نکلی۔ مثلاً مَیں نے چودھویں منزل کا بٹن دبایا تھا، وہ سولہویں پر رُکی۔ بڑی مشکل سے کمرہ ملا۔ اب رات کے کھانے کا مرحلہ تھا جو پھر وہیں سب سے نیچے والی منزل پر ملتا ہے۔

دوبارہ لفٹ کا انتظار کیا۔ آٹھ روپے کی رات یوں گزری۔ نیچے ریستوران میں پہنچا تو ایک لمبی قطار میں لگنا پڑا۔ پوری بھاجی اور دال کا کوپن ایک جگہ سے ملا، میٹھے کا دوسری جگہ سے اور چائے کا تیسری جگہ سے۔ اب دوسری قطار میں لگنا پڑا۔ کھانا ایک جگہ سے مِلا، میٹھا دوسری اور چائے تیسری جگہ سے۔

اور آخر وہی ہوا جس کا یقین تھا۔ سخت بدمزہ کھانا!

سامنے بورڈ پر لکھا تھا: "صبح چائے اپنے کمرے میں منگانا چاہیں تو تین روپے یہیں ابھی جمع کرا جایئے۔" مَیں بہت خوش ہوا۔ چلو ایک چیز تو ہے جو ہوٹل والے خود زحمت کر کے کمرے میں پہنچائیں گے۔ جھٹ تین روپے دیئے اور تیسری بار لفٹ کا انتظار شروع کر دیا۔ پھر وہی رات کا دسواں حصہ کھویا تو اپنا کمرہ پایا۔

باقی چھپّن روپے کی رات انگاروں پر گزاری۔ دہلی میں قیامت کی گرمی تھی اور چودھویں

منزل پر بھی حبس کا عالم تھا اور پنکھے سے ہوا کی بجائے لُو نکل رہی تھی۔

وہ رات مَیں نے اسی شہرِ دہلی کے قدیم شاعروں کی طرح تڑپ تڑپ کر کاٹی اور جدید شاعروں کی طرح سحر کا انتظار کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے صبح آئی اور کمرے کے دروازے پر دہ دستک ہوئی جو جرسِ کاروان صبح سے کم نہ تھی۔

"چائے آگئی" مَیں نے خوش ہو کر خود سے کہا اور لپک کر دروازہ کھولا۔ اب ایک سفید پوش بیرا آئے گا۔ گڈ مارننگ کہے گا اور میرے سرہانے گرم گرم چائے کی کیتلی، صاف ستھری پیالی، چمکتا ہُوا شکر دان اور دُودھ دان چُنے گا اور سلام کر کے چلا جائے گا۔

مَیں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک ٹرالی کھڑی تھی۔ اُس پر ٹونٹی والا بڑا سا فلٹر رکھا تھا اور ہوٹل کا ملازم وہیں کھڑا تھا جو خالص بیورو کریٹک لہجے میں بولا "اندر سے اپنا گلاس لائیے اور اُس میں چائے لے جائیے"۔

اُس صبح مَیں نے چائے کا گلاس اور صبر کا پیمانہ، دونوں اکٹھے پیئے۔

اب دِلّی کی شکل بدل چکی تھی۔ ایشین گیمز ختم ہو گئے تھے اور شہر کے نقشے پر کتنے ہی پہاڑ جیسے اسٹیڈیم اُبھر آئے تھے، فلائی اوور بن گئے تھے، فائیو اسٹار ہوٹل بن گئے تھے۔ وزیرِاعظم مسز گاندھی قتل ہو چکی تھیں، سکھوں پر جو گزرنا تھی گزر چکی تھی مگر اس کی داستانیں ابھی زبانوں پر تھیں۔ کسی نے بتایا کہ گولی لگنے کے بعد اس اسپتال میں لائی گئی تھیں اور یہاں ہزاروں کا مجمع تھا، اور جب مجمع کو وزیرِاعظم کی موت کی خبر سنائی گئی تھی تو یہاں سکھ راہ گیروں اور ٹیکسی اور ٹرک ڈرائیوروں کو مارا گیا تھا اور یہاں اُن کی گردنوں میں جلتے ہوئے ٹائر ڈالے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ پورا شہر ایک بہت بڑا سینما ہال بن گیا ہے، سڑکوں پر فلم "بہو کی پکار" چل رہی ہے جس میں ایک خلقت ساس اور نند کا کردار ادا کر رہی ہے۔

مجھے جامع مسجد جانا تھا۔ مَیں نے بس پر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہی ٹاٹا کی لوہے کی بسیں جن میں ٹکٹ دینے کے لئے کنڈکٹر آپ کے پاس نہیں آتا۔ وہ بس کے پچھواڑے اپنے خانے میں

بیٹھا ہوتا ہے، آپ کو ٹکٹ لینے اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔ آپ اُسے نوٹ دیتے ہیں، وہ آپ کو ریزگاری نہیں دیتا بلکہ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے چھپے ہوئے کوپن دے دیتا ہے کیوں کہ ہندوستان میں اب ریزگاری نہیں ملتی۔ کہتے ہیں کہ پچاس روپے کی ریزگاری پگھلا لو تو وہ ساٹھ روپے میں بک جاتی ہے۔ بہت سے کاروبار والوں نے ریزگاری کی جگہ اپنے کوپن چھاپ کر چلائے۔ کسی نے ایک ہزار روپے کی مالیت کے کوپن جاری کئے۔ بارہ سو روپے کے کوپن واپس آچکے تھے اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔

مَیں جامع مسجد پہنچا تو ہاتھ میں فرمائشوں کی وہ فہرست تھی جو مَیں پاکستان سے لے گیا تھا۔ کسی نے کہا تھا، کرتے شلوار کا کپڑا لانا۔ کسی نے دوپٹوں کی ململ منگائی تھی، کسی نے ہری الائچیوں کی فرمائش کی تھی اور کسی نے امرس منگایا تھا جسے دلی والے آم پاپڑ کہنے لگے ہیں۔

ایک دکان دار سے اچھا سا کپڑا مانگا تو اُس نے ازراہ عنایت اندر سے 'خاص' کپڑا نکلوایا: "یہ لے جایئے۔ پاکستان سے آیا ہے۔"

مَیں نے کچھ پاکستانیوں کو دیکھا جو چتلی قبر پر سونے کا زیور خرید رہے تھے۔ ہندوستان میں سونا سستا ہے اور پاکستانیوں کے پاس اُسے خریدنے کے لئے پیسہ بہت۔

جس بوڑھے بزاز سے مَیں نے ململ خریدی وہ سڑک کے کنارے دکان لگائے بیٹھا تھا۔ کہنے لگا: "بابو جی۔ یہ جو پاکستان والے آتے ہیں، بڑا سینہ تان کر چلتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں جیسے ضیاء الحق یہی ہیں۔"

کسی اور نے بھی مجھ سے کہا: "ٹھیک ہے، پاکستان والے بہت مالدار ہیں مگر یہاں ہندوستان آکر ہمارا مذاق تو نہ اُڑایا کریں۔ ہم سے یہ تو نہ کہا کریں کہ حیرت ہے تمہارے گھر میں یہ چیز نہیں، تعجب ہے تمہارے پاس وہ چیز نہیں۔"

ایک دلچسپ بات دلی کے ایک سائیکل رکشا والے نے کہی: "آپ کے لندن سے ایک پریوار آیا تھا باؤجی۔ امروہے کے مسلمان تھے۔ اُن کے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اُن بچوں

نے رکشا پر چڑھنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ اسے انسان کھینچتا ہے، یہ انسان پر ظلم ہے، ہم اس پر نہیں بیٹھیں گے۔ بڑی مشکل سے پیچھے رکشا پر بیٹھے۔ مَیں نے دو روپے مانگے تھے، انہوں نے ضد کر کے مجھے دس روپے دیئے باؤ جی"۔

دلی میں سائیکل رکشا شہر کے صرف پرانے علاقے میں چلتے ہیں۔ اب مجھے ہری الائچی اور آم پاپڑ لینے دریبہ کلاں جانا تھا۔ دُور بھی تھا، گرمی بھی بہت تھی۔ میرے میزبان نے اصرار کیا کہ سائیکل رکشا پر چلیں۔ رکشا والا دو روپے بتا رہا تھا۔ میں اس کی سوکھی ہوئی سیاہ پنڈلیوں میں پھولی ہوئی خشک رگوں پر بہتا ہوا پسینہ دیکھ رہا تھا اور سُن رہا تھا کہ میرے میزبان ڈیڑھ روپے پر اصرار کر رہے ہیں۔ سائیکل رکشا والے نے جلد ہی ہار مان لی۔ ڈیڑھ روپے میں سودا ہو گیا۔ میرے میزبان مجھے کہنی مار کر بولے "دیکھا آپ نے، ڈیڑھ روپے میں مان گیا ورنہ یہاں کا ریٹ دو روپے ہے"۔

اس کے بعد غریب رکشا والے نے انسانوں اور بھانت بھانت کی گاڑیوں، ٹھیلوں اور ریڑھوں کے سیلاب کے درمیان یوں چلنا شروع کیا جیسے بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ تپتی ہوئی دھوپ میں وہ کاندھے پر پڑے ہوئے کپڑے سے پسینہ پونچھتا جاتا تھا اور پیڈل چلانے کے لئے کبھی ایک ٹانگ پر پورا زور ڈالتا تھا، کبھی دوسری پر۔ وہ جہاں چاندنی چوک کے بیچوں بیچ نہر سعادت خاں بہتی تھی اور سائے دار درخت لگے تھے، بعد میں جہاں گھنٹیاں بجاتی ہوئی ٹراموے دوڑا کرتی تھی۔ وہیں جان کھپاتا ہوا رکشے والا ہمیں دریبہ لے گیا۔ میں نے اپنے میزبان سے کہا کہ میں تو اسے پانچ روپے دوں گا۔ وہ بولے کہ یہ غضب نہ کیجئے گا۔ اس طرح آپ لوگ ان کے بھاؤ اور دماغ دونوں خراب کر جاتے ہیں۔

غریب رکشا والے کو یہ رکشا سات روپے روزانہ کرایہ پر ملتا ہے۔ چونکہ کئی ہزار آدمی رکشا چلا رہے ہیں اس لئے ہر ایک کے حصے میں روزانہ بارہ سے سولہ روپے آتے ہیں۔ اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے دن بھر میں ان کے پاس صرف سات آٹھ روپے بچتے ہیں

اوران کا بھی کچھ یقین نہیں۔ پتہ نہیں کس دن گھر کا وہ اَن داتا خون تھوکنے لگے اور نہ جانے کس روز دم توڑ دے۔

حوض قاضی کے پاس ارتھیوں اور کریا کرم کے مال اسباب کی بہت بڑی دکان دیکھ کر اُس روز مجھے احساس ہوا کہ اس دکان دار کا دھندا کس زور شور سے چل رہا ہوگا۔

ہم دلّی کی تنگ گلیوں میں چل رہے تھے۔ جامع مسجد کے پہلو سے ملا ہوا یہ مٹیا محل کا علاقہ تھا۔ دکانیں ہی دکانیں، ہوٹل، دفتر، کتب فروش، مالی، نان بائی، دیواروں پر چپکے ہوئے لاکھوں نئے پرانے پوسٹر، اوپر بجلی کے تاروں میں اُلجھی ہوئی سینکڑوں پرانی پتنگیں، لوگوں کا شور، آٹو رکشا اور بسوں کا شور اور سودے والوں اور پھیری والوں کی صدائیں:

حضرت نظام الدین کے دربار کی ٹکیاں لو

چار پیسے میں ڈبل دو پیسے کا مال

ایک آنے کے پچاس گرام لگا دیئے شربت کو!

فالسے بھیّا، کالے پیلے لال سرخ سبز کاسنی اودے لگا دیئے شربت کو۔

اوروں کی زنانی کھرنیاں

یار کے مردانے فالسے لگا دیئے شربت کو۔

اور جن صاحب نے ہمیں شربت پلائے بغیر نہیں چھوڑا وہ ان ہی گلیوں میں رہنے والے ایک بزرگ لالہ امرناتھ تھے۔ بہتر پچھتر کی عمر لیکن خوب چونچال۔ مسلمانوں کی گلیوں میں یوں رہتے ہیں جیسے دانتوں کے بیچ میں زبان لیکن علاقے کے معاملوں میں پوری طرح شامل۔ ان گلیوں کی سدھار کمیٹی کے خزانچی ہیں۔ محلّے میں ہونے والے دنگے فساد میں فیصلے کراتے ہیں اور وہ پرانی وضعداری رکھ رکھاؤ اور شفقت خوب ہے مزاج میں۔ مَیں پہنچا تو دالان میں چارپائی ڈالے بیٹھے تھے۔ فوراً ہی لڑکوں کو دوڑایا کہ وہ اندر سے کرسی لائیں مگر مَیں چارپائی ہی پر بیٹھا اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد ہی پرانی دِلّی کی باتیں شروع ہوگئیں۔

لالہ امرناتھ بتا رہے تھے: "سات پیڑھیاں گزر گئیں اِس محلّے کے اندر۔ ساری عمر ہماری یہیں گزر گئی۔ ہمارے والد کی، ہمارے دادا کی۔ سب یہیں رہے اور اب تک یہاں سب بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔ ہندو مسلمان سب! ہم ان کی عزّت کرتے ہیں، یہ ہماری عزّت کرتے ہیں۔ سمجھئے بڑے آرام سے زندگی گزر رہی ہے۔ اب تک۔ اور کل کی کہتے نہیں حضور، کل کیا ہونے والا ہے۔"

مَیں نے پوچھا: "ان گلیوں میں آپ نے جو بچپن گزارا تھا وہ یاد ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔"

"اُس وقت کی دلّی کیسی تھی؟"

"وِس وقت کی دلّی تو کیا پوچھتے ہیں۔" اب لالہ امرناتھ اپنے مخصوص لہجے میں بولنے لگے: "بازار میں اِس ٹائم پے سوختہ ہو جایا کرتا تھا، کوئی کوئی آدمی دِکھتا تھا اور شام کے ٹائم میں چمار جوتیاں لے کر کے بیچنے جایا کرتے تھے، یہ حالت تھی اِس بازار میں۔ اور اب تو جناب جتنی پبلک دن میں چلتی ہے اُتنی رات کو چلتی ہے۔ یہ حالت ہے اس وقت ہندوستان میں۔"

مَیں نے پوچھا: "آپ تو جامع مسجد کے بالکل پچھواڑے رہا کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں جامع مسجد میں کیسی رونق ہوا کرتی تھی؟"

"جامع مسجد کے اندر اتنی رونق نہیں تھی جو اب رونق ہے۔ اب بیچ سڑک پر ایک کھمبا لگا ہے۔ ہمارے بچپن میں اس کھمبے پر ایک گیس کا ہنڈا ٹنگا رہا کرتا تھا وِس زمانے میں۔ اور ایک چتلی قبر پے ہنڈا اور گلیوں میں لالٹینیں جلا کرتی تھیں مٹّی کے تیل کی۔ سمجھے؟ اور شر شام اکیلا بچّہ رات کو آٹھ بجے جا نہیں سکتا تھا، اتنا سوختہ محلّے کے اندر رہا کرتا تھا۔"

مَیں نے لالہ جی سے پوچھا: "جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھانے پینے کی چیزیں نہاری اور حلیم نان اور کباب یہ سب چیزیں آپ کے زمانے میں بھی ہوتی تھیں؟"

"جی ہاں، وِس زمانے میں بھی ہوتی تھیں۔"

"اُس وقت زیادہ مزے کی ہوتی تھیں یا اب زیادہ چٹ پٹی ہوتی ہیں ؟"

"جی اب زیادہ چٹ پٹی ہیں وِس زمانے سے، اب زمانہ تو پلٹ گیا حضور، اب زیادہ لذت ہے ہر چیز ہیں۔ کیوں، آمدنی پیسے کی ہر انسان کو ہے۔ روپیہ دو روپیہ تو چھوٹا بچہ بھی اُٹھا دیتا ہے اور پہلے جناب ہم اتنے بڑے تھے، ایک دھیلا ملتا تھا اور بہت کوئی تہوار ہوا تو پیسہ مل گیا، دو پیسے مل گئے۔ بڑے خوش ہوا کرتے تھے۔"

مَیں نے پوچھا "یہ بتائیے کہ آپ کو وہ اپنے زمانے کی دلّی زیادہ اچھی لگتی تھی یا آج کی دلّی زیادہ پسند ہے ؟ سکون کس زمانے میں تھا ؟"

"سکون وِس زمانے میں تھا۔ سکون کی زندگانی جو تھی وِس زمانے میں تھی، کیوں، کھانے پینے کی بہت موج تھی۔ پہلے جیسا گھی نہیں، دُودھ نہیں، دہی نہیں۔ پہلے زمانے میں ہمارے چار پیسے سیر دودھ، سمجھے ؟ اور ڈیڑھ سیر کا ہم نے گھی کھایا ہے بچپن میں، ڈیڑھ سیر کا۔ سمجھے ؟ اب وہ گھی نہیں۔ سمجھے ؟ کوئی عزت نہیں انسان کی۔ اب تو پیسے کی عزت ہے۔ انسان کی عزت نہیں ہے، اور وِس زمانے میں انسان کی عزت تھی، پیسے کی عزت نہیں تھی، سمجھے ؟ پہلے بڑے بوڑھے کی عزت کیا کرتے تھے۔ اٹھایا کرتے تھے، بٹھایا کرتے تھے اور اب پیسے والے کی عزت ہے، بڑے کی عزت نہیں ہے حضور۔"

ٹیا محل کی گلیوں میں جس کی سات پیڑھیاں رہی ہوں اُس نے سمجھئے اِس زمین میں جڑیں پکڑ لیں۔ لالہ امرناتھ کی چاہے کتنی ہی تکلیفیں ہوں پھر بھی ان کی اس بات میں مبالغہ نہ تھا کہ "بڑے آرام سے زندگی گزر رہی ہے اب تک۔ اور کل کی کہتے نہیں حضور، کل کیا ہونے والا ہے۔"

بعد میں اطلاع ملی کہ لالہ جی کے بیٹے نے پرانے شہر سے باہر کہیں اپنا نیا اور کشادہ مکان بنا لیا ہے۔ وہ آکر لالہ جی کو یہاں سے لے گیا۔ یہ روتے ہوئے گئے اور اب اُن کے پُرانے دالان میں سوختہ ہی سوختہ ہے۔ سمجھے ؟

وہیں گلی مدرسہ حسین بخش میں میری ملاقات ایک ہونہار نوجوان حبیب الرحمان سیفی سے ہوئی۔ اس تنگ گلی میں اُن کا مکان میں اندر سے دیکھنا چاہتا تھا جس کے دروازے فوراً ہی کھول دیئے گئے اور تنگ سیڑھیوں پر احتیاط سے پیر رکھتے ہوئے ہم اوپر اُس کمرے میں پہنچے جو اُن کے پورے کنبے کا 'مکان' تھا۔

مَیں نے حبیب الرحمان سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں یہاں دِلّی میں ؟"

"جناب اعلیٰ ہمارا فیبری کیٹرس کا کام ہے، گیٹ جالی کا۔ اور ہم یہ کام اپنے والد اور دادا پردادا کے زمانے سے کرتے آرہے ہیں۔"

مَیں نے پوچھا کہ آپ جو لوہے کا کام کرتے ہیں کیا اس کے لئے آپ نے کہیں فیکٹری، کوئی کارخانہ لگا رکھا ہے ؟۔ اُنہوں نے بتایا "جی ہاں یہ گھر کے نیچے ہی ہماری شاپ ہے جس کے اندر والد اور مَیں، دونوں ہی کام کرتے ہیں۔ اچھے پیسے ملتے ہیں ماشاءاللہ۔ اس علاقے میں، مٹیا محل کے اندر ہم جو ہیں بہت ٹاپ پر ہیں۔ ہمارا کام عروج پر ہے۔"

"مگر وہ نیچے تو بہت چھوٹی چھوٹی سی دکانیں بلکہ کوٹھڑیاں ہیں، اُس میں آپ یہ سارا ٹھوکا پیٹی کا کام کر لیتے ہیں ؟"

"جی ہاں۔ گلی کے اندر ہمارا مال پڑا ہوا ہے۔ بس لوگوں سے تعلقات بنا رکھے ہیں۔ وسیع تعلقات ہیں۔ ہمدردی کے طور پر لوگ بھی بچارے اعتراض یا شکایت نہیں کرتے۔"

اب مَیں نے حبیب الرحمان سیفی سے پوچھا "آپ کا جو یہ گھر ہے دکان کے اوپر یہ کتنا بڑا ہے۔ اس میں کتنی گنجائش ہے ؟"۔

"اس میں تقریباً بارہ فٹ لمبا بارہ فٹ چوڑا یہ کمرہ ہے۔ اس کے باہر بارہ فٹ بائی، بارہ فٹ کی انگنائی ہے جس کے اندر ایک سائیڈ میں باتھ روم ہے۔ ایک سائیڈ میں لیٹرین۔ ایک طرف زینے کا راستہ ہے۔ تیسری سائیڈ اوپر جانے کا راستہ ہے۔ اوپر ایک عارضی سا کمرہ بنا ہوا ہے۔ کبھی چھت پر سو رہے ہوں اور بارش ہو جائے تو اُس کے اندر چلے جاتے ہیں۔"

مَیں نے پوچھا کہ اس گھر میں ماشاء اللہ کتنے افراد رہتے ہیں سب ملا کر ؟

انہوں نے بتایا " دس افراد تھے پہلے، اب گیارہویں ہماری وائف ہوگئی ہیں، سمجھے ؟ ہمارے آٹھ بہن بھائی ہیں۔ چھ بھائی، دو بہنیں۔ والد، والدہ، اہلیہ "

مَیں نے سوال کیا " گھر کے بچّوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہے ؟ "

" ہاں جناب اعلیٰ ہمارے سارے ہی بھائی بہن پڑھ چکے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ مَیں نے بھی انٹر کیا ہے اینگلو عربک ہائی اسکول سے۔ مَیں نے ۱۹۷۸ء میں تعلیم چھوڑی ہے۔ اس کے بعد مَیں کام میں آگیا۔ میرے چھوٹے بھائی ہیں شفیق۔ انہوں نے دسویں جماعت پاس کی ہے۔ اس کے بعد ہمارے رئیس ہیں، ان کا دسویں کا امتحان ہو چکا ہے، اب نتیجہ آنے والا ہے۔ اس کے بعد میری چھوٹی بہن ہے، شہناز بیگم، یہ چھٹی جماعت میں ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی سلیم ہیں، یہ آٹھویں میں ہیں۔ اس کے بعد مجیب ہیں، وہ چوتھی میں ہیں۔ تقریباً سلسلہ جاری ہے پڑھائی کا اور ہماری کوشش بھی یہ ہے کہ کم سے کم بچے اپنے تعلیمی معیار میں بلند ہوں اور پچھڑے طبقوں سے اوپر رہیں "

اس پر مَیں نے کہا کہ آپ سب نے ماشاء اللہ تعلیم پائی ہے اور آپ کے حالات بہتر ہوگئے ہیں تو اس پرانی دلّی کے اس پُرانے شہر کی ان تنگ و تاریک اور پر پیچ گلیوں میں رہتے ہوئے آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے ؟

حبیب الرحمان ہنستے ہوئے بولے " جناب اعلیٰ بچپن یہیں ہمارا گزرا ہے۔ پیدائش ہماری یہیں کی ہے۔ والد کی پیدائش یہیں کی ہے۔ تو الحمدللہ بڑے مزے کے دن گزرتے ہیں اور جتنا سکون اور لطف ہمیں اِن علاقوں میں آتا ہے، کہیں اور جا کر نہیں آتا "

بعد کی خبر یہ ہے کہ حبیب الرحمان سیفی نے جمنا پار، عثمان پور میں نیا اور بڑا مکان بنوا لیا ہے۔ اُن کے کنبے کے کچھ لوگ اب اپنے کشادہ مکان میں رہیں گے۔ وہاں سے اب دلّی دُور نہیں۔

قیامت کے گلی کوچے

لوگ کہتے ہیں کہ ہمایوں کو شکست دے کر جب شیر شاہ دہلی میں داخل ہوا تو ایک بوڑھی عورت نے کہا "آخر دہلی کو اُس کا دولہا مل گیا"

اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس روز شیر شاہ نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو ڈاڑھی میں سفید بال دیکھ کر وہ اُداس ہو گیا۔ آئینے میں سفید بال دیکھ کر اُس نے سوچا ہو گا کہ اُس نے تو بہت سے کام کرنے کے ارادے باندھے ہیں اور مہلت اب کم معلوم ہوتی ہے چنانچہ یہ افغان بادشاہ ہندوستان کی تعمیر میں جُٹ گیا اور صرف پانچ برس کی حکمرانی میں اتنا کام کر گیا کہ عقل حیران ہے۔ سڑکیں، سرائیں، کنویں، مسجدیں، عدالتیں، یہ سب تعمیر ہوئیں۔ قانون کے نفاذ، امنِ عامہ، زمین، کاشتکاری، لگان، ڈاک، تعلیم، کرنسی اور صحتِ عامہ کے بے مثال نظام قائم ہوئے ——— اور یہ سب صرف ساٹھ مہینوں میں۔

مَیں دلّی پہنچا تو یہ طے کر کے پہنچا کہ جس شیر شاہ کے بارے میں اودھی کے معروف شاعر جائسی نے لکھا تھا: بادشاہ تم جگت کے، جگ تمھارا محتاج، شہر دہلی میں اُس کی نشانی ضرور دیکھیں گے، یعنی وہ کھنڈر جو کبھی عظیم الشان شہر شیر گڑھ یا حضرتِ دہلی تھے اور اب پرانا قلعہ کہلاتے ہیں۔

مَیں نے انجمنِ ترقی اُردو (ہند) کے معتمد خلیق انجم کو ساتھ لیا جو دہلی کو اچھی طرح جانتے

ہیں اور ہم فیروز شاہ کوٹلہ سے ہمایوں کے مقبرے تک اُس سڑک پر چلے جس پر تاریخ کے کتنے ہی قافلے چلے ــــــ چلتے گئے اور وقت کی دُھند میں گم ہوتے گئے۔

کوٹلہ کے قریب شیر شاہ کے شہر کا پہلا دروازہ ملا۔ لال دروازہ، کابلی دروازہ یا خونی دروازہ۔ اور پھر پرانے قلعے کے سامنے اس کے شہر کا جنوبی دروازہ ملا۔ نہایت بلند، نہایت پُرشکوہ۔ اور اس دروازے سے نکل کر ایک سیدھی سڑک آ رہی تھی۔ ہم اُسی سڑک پر کھڑے تھے اور چہار جانب بوڑھی اینٹیں، بوسیدہ فصیلیں، خستہ حال بُرج اور خمیدہ دیواریں چُپ کی زبان میں ہزار داستانیں کہہ رہی تھیں۔ خلیق انجم نے کچھ وہی باتیں ذرا اونچی آواز میں دُہرائیں تو مجھ اجنبی پر اُس در و دیوار کا حال کھلا:

"یہ جو آپ سامنے دروازہ دیکھ رہے ہیں یہ شیر شاہ سُوری کا بنوایا ہُوا دروازہ ہے۔ اور یہ فصیل کا حصّہ بھی غالبًا شیر شاہ ہی کا بنوایا ہُوا ہے کیونکہ شیر شاہ کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے اسلام شاہ نے اِس فصیل کو پورا کیا تھا اور پھر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کئی شہر آباد ہُوئے، اس میں یہ فصیل ضائع ہو گئی۔"

مَیں سوچ رہا تھا کہ شیر شاہ نے اپنے شہر کے گرد جو زبردست فصیل اُٹھائی تھی اس کا سارا ملبہ، اس کی ساری اینٹیں، اس کے سارے پتّھر کہاں گئے؟

کتابوں میں لکھا ہے کہ بعد میں جب شاہ جہاں نے اپنی دہلی آباد کی اور شاہ جہاں آباد بسایا تو اُس کے مزدور یہی سارے پتّھر اُکھاڑ کر لے گئے تھے۔

اس پر دِل نے ایک اور سوال کیا۔ شاہ جہاں اگر شیر شاہ کی دیواریں گرا کر اُس کے پتّھر لے گیا تو خود شیر شاہ اپنی دیواروں کے پتّھر کہاں سے لایا ہوگا؟

کتابوں میں لکھا ہے کہ اُس نے قریب ہی فیروز شاہ کوٹلہ کے شاندار شہر کی فصیلیں ڈھا کر اُس کے پتّھروں سے اپنا شہر بسایا تھا۔

کہتے ہیں کہ دِلّی سات مرتبہ بسی اور اُجڑی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک درجن سے زیادہ

حکومتوں نے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس کی ساری آبادیاں جمنا کے مغربی کنارے پر تھیں۔ یہیں پہلے پہل وہ شہر بسا جس کا نام اندرپت تھا۔ اندرپت کے آگے سونی پت، باگھ پت، تل پت اور پانی پت تھے۔ اِن ہی پتوں کی خاطر حضرت عیسیٰؑ سے ایک ہزار سال پہلے مہابھارت کی جنگ ہوئی تھی۔

جمنا کے کنارے جہاں اندرپت تھا، وہیں کے کھنڈروں پر ہمایوں نے اپنے شہر دین پناہ کی تعمیر شروع کی۔ وہ بستی ابھی ادھوری تھی کہ اس منظر سے ہمایوں رُخصت ہُوا اور شیر شاہ آیا۔ اُس نے ہمایوں ہی کے شہر کو بڑھا کر اپنا شاندار شہر بنایا: حضرتِ دہلی!

مگر مہلتیں تخت اور تاج سے مرعوب نہیں ہوا کرتیں۔ کالنجر کے قلعے پر ذرا سی چنگاری بارود کے ڈھیر میں جا گری اور شیر شاہ مر گیا۔ کچھ یہی حال اُس کی دلّی کا ہوا۔ پُرانا قلعہ کھنڈر بن گیا البتہ اُس کے اندر تاریخ اپنی تین نشانیاں چھوڑ گئی۔ ایک شیر منڈل، ایک شاندار مسجد اور پانی کی ایک باولی۔

ہم قدیم دروازے کے راستے قلعے میں داخل ہوئے اور اونچائی پر چڑھنے لگے۔ یہ شاید پہاڑی نہیں تھی، تین ہزار سال تک اوپر تلے آباد ہونے والی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کا انبار تھا۔ وہ دُور افق پر شیر منڈل خاموش کھڑا تھا۔ اُس کے قریب ایک تاریخی مسجد کسی طویل سجدے میں تھی اور اُس سے ذرا پہلے ہماری راہ میں باؤلی تھی۔ یہ سوچ کر کہ ساڑھے چار سو سال پہلے ہمارے بزرگ اِس میں کیسے اُترتے ہوں گے، مَیں بھی اُس کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ اُس وقت لوگ پانی کو اوپر نہیں کھینچتے تھے بلکہ خود اُتر کر پانی تک جاتے تھے۔ کہیں کہیں سیڑھیوں کی بجائے ڈھلان بنائی جاتی تھی جس پر اُتر کر چوپائے پانی پیتے تھے۔

پُرانے قلعے کی اس باؤلی کی حالت خستہ تھی مگر یوں نظر آتا تھا کہ اس میں مزدور لگے ہیں جو مرمت کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا پانی سڑ گیا ہے اور اُسے ان بے شمار چڑیوں نے گندا کر دیا ہے جو باؤلی کے اندر آباد ہیں۔ وہ نسل تو ختم ہُوئی جس نے یہ باؤلی بنائی تھی

اب اس میں پرندوں کی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔

باؤلی سے نکل کر ہم شیر شاہ کی تاریخی مسجد دیکھنے گئے۔ اس مسجد کا نظارہ ذہن میں بہت سے سوال اُٹھاتا ہے۔ خلیق انجم بتا رہے تھے: "یہ مسجد بھی شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی اور اس کی دیواروں میں جو بڑے بڑے پتھر نظر آتے ہیں یہ خاص شیر شاہ کا مزاج ہے کیوں کہ شیر شاہ کی تھوڑی سی ہی عمارتیں باقی ہیں اور اُن سب میں بھی اسی طرح کا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ پُرانے قلعے کی اس مسجد کی یہ جو محراب ہے اور اس کے اطراف یہ جو سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور اُس پر جو نقش و نگار ہیں، جو خوبصورتی ہے اور جس طرح سے اس پر قرآن شریف کی آیتیں لکھی گئی ہیں اور سنگ خارا اور دوسرے رنگوں کے پتھروں کا استعمال کیا گیا ہے اُس سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ فنِ تعمیر کا یہ حصہ شیر شاہ سوری کا نہیں۔ سوری کے ہاں جلال تو ہے، عظمت تو ہے اور ہیبت ہے اُس کی عمارتوں میں، لیکن یہ جو حُسن، جمال اور نفاست ہے یہ ہمیں بعد والے مغلوں کے ہاں نظر آتا ہے جو اپنی انتہا پر تاج محل میں نظر آتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ اُس کی ابتدا ہے جو یہاں سے ہوئی ہے۔

یہ عظیم الشان عمارت کتنی لمبی چوڑی ہے۔ غالباً اُس زمانے میں یہاں جو شہر بنا ہو گا، اس کی یہ جامع مسجد رہی ہو گی اور پھر یہ ہندوستان کی پہلی مسجد کہی جاتی ہے جس میں اس طرح کے نقش و نگار بنائے گئے تھے اور جس کو سجایا گیا تھا ورنہ اس سے پہلے بڑے بڑے پتھر رکھ کر مسجدیں بنالی جاتی تھیں۔ مسجد کو سجا کر بنانے اور اس کے فنِ تعمیر میں حُسن پیدا کرنے کا خیال غالباً اس مسجد سے ہندوستان میں شروع ہوتا ہے۔"

یہاں سے ہم آگے چلے اور قلعۂ کہنہ میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی شیر شاہ کی اُس عمارت پر پہنچے جو شیر منڈل کہلاتی ہے۔ کیوں بنی تھی؟ اس کا مصرف کیا تھا؟ تاریخ کو نہیں معلوم، البتہ ہمایوں نے واپس آنے کے بعد اسے اپنا کتب خانہ بنایا اور اسی کے دریچوں میں بیٹھ کر وہ ستارے دیکھا کرتا تھا۔

اس عمارت کی منزلیں دو ہیں، پہلو آٹھ ہیں اور اونچی کرسی دے کر بنائی گئی ہے۔ نچلی منزل کے ہر پہلو میں دروازوں کے صرف نشان ہیں البتہ دروازے بند ہیں۔ بس ایک چھوٹا سا دروازہ کھُلا ہے۔ خلیق انجم بتا رہے تھے کہ سیڑھیاں چڑھ کر آپ اوپر جائیں گے تو ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں ہر طرف سے تیز اور ٹھنڈی ہوا آتی ہے، شاید یہ وہی حصہ ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ہمایوں نے اپنا کتب خانہ بنایا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اوپر جانے کے خم دار زینے کو توجہ سے دیکھئے گا جس پر سے کہتے ہیں کہ ہمایوں نیچے گرا تھا۔ مشہور یہ ہے کہ ہمایوں کو علمِ ہیئت کا بہت شوق تھا۔ ایک دن مشتری اور زہرہ کا قران تھا۔ ہمایوں اوپر اُن ستاروں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب وہ نیچے اُترنے لگا تو مغرب کی اذان ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں کے ہاتھ میں ایک عصا تھی تو وہ اذان سُن کر وہیں زینے پر بیٹھ گیا اور اذان سنتا رہا۔ جب اذان ختم ہوگئی تو وہ عصا ٹیک کر اُٹھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ لڑھکتا ہُوا نیچے تک آیا اور اس کی کنپٹی میں زخم آیا اور اس سے وہ پھر جاں بر نہ ہو سکا۔

مَیں نے کہا کہ آیئے اس کی تصدیق ابھی کر لیتے ہیں۔ یہ کہہ کر مَیں نے زینے پر چڑھنا شروع کیا۔ اس کی ہر سیڑھی بہت اونچی تھی۔ پیر ٹکانے کے لئے کافی جگہ نہیں تھی اور چونکہ زینہ خم کھاتا ہُوا جاتا ہے اِس لیے سیڑھیاں ایک جانب ذرا چوڑی اور دوسرے کنارے پر تنگ تھیں، آپ انہیں تکونا کہہ سکتے ہیں۔ ان پر اگر کوئی بیٹھ جائے اور اچانک اُٹھے تو پیچھے کی سیڑھی سے ٹکرا کر اس کا گرنا قرینِ قیاس ہے۔

یہ زینہ طے کر کے ہم وہاں پہنچے جہاں ہمایوں نے ستارے دیکھے ہوں گے لیکن اُن ستاروں میں وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ ان کے مشاہدے کے بعد جب وہ نیچے اُتر رہا ہوگا تو فرشتۂ اجل اپنی بانہیں پھیلائے وہاں اس کا منتظر ہوگا۔

خلیق انجم بتانے لگے "جب ہم بچے تھے اور یہ عمارت دیکھنے آتے تھے تو یہاں پر نیلے رنگ کے ٹائیلوں کا کام تھا۔ اب بھی کسی کونے کھدرے میں نظر آجاتے ہیں۔ کچھ

مینا کاری تھی۔ کچھ پچی کاری تھی۔ غرض یہ کہ بہت ہی خوبصورت لگتا تھا۔ اب تو کچھ نہیں رہا۔ اب آپ دیکھئے کہ یہاں جب ہم کھڑے ہیں تو کتنی تیز ہُوا آرہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمایوں نے اس کو اپنی لائبریری بنایا ہوگا اور وہ یہاں پر اپنا وقت کتابیں پڑھنے میں گزارتا ہوگا۔"

مَیں نے دیکھا کہ دیواروں میں بڑے بڑے طاق ہیں۔ ممکن ہے اُن ہی میں کبھی ہمایوں کی کتابیں چُنی ہوں۔ لیکن وقت نے اور انسان نے اس عمارت کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ وقت نے اپنے نشان یوں چھوڑے کہ اس کے رنگ و روغن ختم ہُوتے اور انسان نے اپنے نشان یوں چھوڑے کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو کوئی جیون کمار یہاں آیا ہوگا جو ہر دیوار پر اور ہر گوشے میں اپنا نام لکھ گیا ہے۔

شیر شاہ اور ہمایوں کی موت نے دہلی کے ایک دَور کا خاتمہ کر دیا۔ ہمایوں کے بعد اکبر آگرے چلا گیا اور جہانگیر اپنا پایۂ تخت اُٹھا کر لاہور لے گیا۔ خود شیر شاہ کالنجر میں مرا اور سہسرام میں دفن ہُوا البتہ ہمایوں شیر منڈل سے کچھ دُور حضرت نظام الدین کے مزار کے قریب جمنا کے کنارے دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ عبرت کی جا ہے کہ اُس میں ایک بادشاہ ہی نہیں، آخری ہچکیاں لیتا ہُوا ایک پورا دَور دفن ہُوا اور اُس کے ایک تاریک کمرے میں صرف ایک برہنہ سر، پریشان حال حکمران ہی نے نہیں، ایک عہد نے زنجیریں پہنیں۔

خلیق انجم وہ عمارت دکھا رہے تھے۔" اب ہم جہاں کھڑے ہیں، یہ جو بڑی سی قبر سنگِ مرمر کی نظر آتی ہے، یہ اصل قبر نہیں ہے، یہ اس کا اصل تعویذ ہے۔ اصل قبر تہ خانے میں ہے جہاں زہریلی گیس پیدا ہوگئی تو وہاں جانے پر پابندی لگا دی گئی۔

مغلوں کی سب سے پہلی قابلِ ذکر عمارت، ہمایوں کا یہ مقبرہ ہے۔ ہمایوں کے انتقال کے آٹھ نو سال بعد ہمایوں کی بیوی حاجی بیگم نے، جن کو بیگہ بیگم بھی کہتے ہیں، یہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ اس کے بعد جو یہاں دوسری بہت سی قبریں ہیں ان کے متعلق جو باتیں سنتے ہیں ان سے

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مغلوں کے عروج کے زمانے میں اس عمارت کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی، بس یہ ایک دلکش مقام رہا۔

لیکن جب مغلوں کا زوال ہوتا ہے تو اُس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زوال میں ہمایوں کے مقبرے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور زوال کے زمانے کے جو بادشاہ تھے، شہزادے تھے اور شہزادیاں تھیں وہ سب لا کر یہیں دفن کیے گئے۔ مثلاً فرخ سیر، عالمگیر ثانی، رفیع الدولہ، رفیع الدرجات اس طرح کے بادشاہ جو بہت ہی غیر اہم تھے ان کی قبریں یہاں بنائی گئیں اور وہ اتنے غیر اہم تھے کہ ان پر لوحِ مزار بھی نہیں لگائی گئی۔ داراشکوہ کی قبر بھی کہتے ہیں یہیں ہے، باہر چبوترے پر، آسمان کے نیچے۔ اس پر بھی کوئی کتبہ یا سنگِ مزار نہیں۔

آیئے آگے چلیں۔ دیکھئے یہ جو کمرہ ہے جس میں اب ہم داخل ہو رہے ہیں یہ وہ کمرہ ہے جہاں مغل حکومت کا سورج ڈوبا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو ہڈسن نے اسی کمرے سے گرفتار کیا تھا۔ اُس وقت بہادر شاہ ظفر کے ساتھ زینت محل، جواں بخت جو اُن کا شہزادہ اور ولی عہد تھا اور دوسرے شہزادے تھے، یہاں سے اُن سب کو گرفتار کر کے لے جایا گیا۔ اُن میں سے تین شہزادوں کو تو راستے ہی میں قتل کر کے ان کی لاشیں کابلی دروازے پر لٹکا دی گئیں اور زینت محل اور بہادر شاہ ظفر اور جواں بخت پر مقدمہ چلایا گیا تھا اور ان تینوں کو پھر رنگون بھیج دیا گیا تھا۔ یہ اہمیت ہے اِس ہمایوں کے مقبرے کی اور یہ اہمیت ہے اس چھوٹے سے تاریک کمرے کی جہاں مغل حکومت کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہُوا تھا۔"

اُس روز میری دِلّی کی سیر ختم ہوئی۔ اُس روز میری چشمِ تصوّر مجھے دِلّی کے نہیں، قیامت کے گلی کوچوں میں لئے پھری۔ اُس دن جو منظروں کا تانتا بندھا تو یوں کہ ابھی اُبھرتے بھی نہ تھے کہ ڈوب سے جاتے تھے۔ گزرے لمحوں کی ایک یلغار آتی تھی اور سر پر آئی ہُوئی گھڑیوں کے ریلے میں بہہ جاتی تھی۔ یوں لگا کہ دیواروں کو اور دروازوں کو گویائی مل گئی۔

وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے قریب چچا کبابی کے گولے کے کباب، وہ فراش خانے

کے شابو بھٹیارے کا شوربہ ، وہ لال کنویں کے حاجی نان بائی کی سو طرح کی روٹیاں اور وہ چاندنی چوک کے میاں گنجے نہاری والے جن کی گجر دم کھلنے والی دیگ سے اُٹھتی ہُوئی وہ لذت سے سرشار مہک۔

گرمیاں ہیں تو خس کی ٹٹیاں لگ رہی ہیں ، ہزارے چھوڑے جا رہے ہیں ، رؤسا تہ خانوں میں چلے گئے ہیں۔ شام کو لوگ نہا دھو کر پان کی گلوری منہ میں دباتے بیگم کے باغ جا رہے ہیں یا دِلّی دروازے سے نکل کر فیروز شاہ کے کوٹلے تک جا پہنچے ہیں۔

ساون ہے تو لڑکیوں کو کمروں میں چھپایا جا رہا ہے کہ آندھی میں جنوں کی برات ہوتی ہے اور لڑکیوں کا پنڈا کورا ہے۔ اور پھر جو ساون ٹوٹ کے برسا ہے تو پیش دالان کی چھت میں دُہرے جھولے پڑے ہیں اور دو دو لڑکیاں پیر جوڑ کر جھول رہی ہیں۔ گرم گرم پکوان اُتر رہے ہیں اور کالی گھٹا لہرانے کے گیت گائے جا رہے ہیں۔

مینہ برس کر کھُل گیا ہے تو بے فکروں کی ٹولیاں رات رات بھر کے لئے جمنا کنارے فالیزوں پر جا رہی ہیں۔ ٹھنڈی ریت پر چاندنی کا فرش ہے ، گیس کے ہنڈے جل رہے ہیں ، ریڑھیوں پر لد کر کھانا آیا ہے ، ڈھیروں خربوزے خریدے گئے ہیں۔ کبڈّی کے پالے جمے ہیں ، جوڑیاں پُگی جا رہی ہیں۔ جمنا میں چھلانگیں لگائی جا رہی ہیں۔ کھانے کے بعد خربوزے کھائے جا رہے ہیں ، آم چوسے جا رہے ہیں اور دو ٹولیوں میں گٹھلیاں چل رہی ہیں ، نقلیں اتاری جا رہی ہیں ، بیت بازی ہو رہی ہے اور غزلیں گائی جا رہی ہیں۔

گرمی ڈھل گئی ہے تو کنبے کے کنبے اور پاس پڑوسی پالکی گاڑیوں میں بھر بھر کر قطب صاحب کی سیر کو جا رہے ہیں۔ ہجوم کے ہجوم چلے جا رہے ہیں۔ راستے میں فیروز شاہ کے کوٹلے میں ٹھہر گئے۔ اشوک کی لاٹ دیکھی۔ شیر منڈل پر چڑھے ، امیر خسرو کے مزار اور پھر سلطان جی کی قبر پر حاضری دی ، ہمایوں کے مقبرے کا چکر لگایا ، مدرسے میں سستائے اور حوض خاص ہوتے ہُوئے قطب صاحب جا پہنچے جہاں میلہ لگا ہے ، سقّے کٹورے بجا رہے ہیں ، ڈھول

تاشے ہیں، اکھاڑے ہیں اور پنکھے کے آگے شہنائی بج رہی ہے۔

یہی حال میٹھی عید اور سلونی عید کا ہے۔ شادی بیاہ، روزہ کشائی، بچّے کی ولادت، بسنت پنچمی، دلّی والوں کو تو بس جی اُٹھنے کے بہانے چاہئیں۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چوک تو ہر روز کا میلہ ہے۔ سارا شہر اُمڈا چلا آتا ہے۔ کھانے پینے کی وہ دھوم ہے کہ ایک ڈاڑھ چلے، ستّر بلا ٹلے کی کہاوت سچ ہوتی جا رہی ہے۔

وہیں اُردو بازار ہے، ایک قطار سے کتابوں کی دکانیں ہیں۔ یہیں حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی ہے۔ یہیں سیّد وصی اشرف کا کتب خانۂ علم و ادب ہے۔ کوئی شاعر، کوئی ادیب ایسا نہیں جو یہاں نہ آتا ہو۔ یا پھر نواب خواجہ محمد شفیع کے دیوان خانے میں اتوار کی اتوار شعر و ادب کی محفلیں جمی ہیں اور مشاعرے ہو رہے ہیں۔

پھر کہیں رمضان خاں اور کہیں چاند خاں اور مظفر خاں راگ راگنیوں کو اپنے سروں سے سجا رہے ہیں تو کہیں بندو خاں اور ممن خاں کی سارنگی نے فضاؤں میں تانیں بکھیر دی ہیں۔ اللہ دیئے خاں پکھاوجی اور نتھو خان طبلہ نواز کے ساتھ ساتھ استاد گامی خاں نے باج پر تال کا وہ جادو جگایا ہے کہ ایک عالم مسحور ہے۔

اِن ہی گلیوں میں امیر جان اور مجیدن بائی سے لے کر تو شابہ جان تک کتنی ہی آوازوں نے دلّی کی فضاؤں میں رس گھولا ہے۔

وہ پتنگوں کے پیچ، وہ کبوتروں کی اڑانیں، وہ بٹیروں اور مرغوں کی لڑائیاں، وہ اکھاڑوں میں کُشتیاں اور وہ جمنا میں تیراکیاں ــــــ سب جیسے ایک مسلسل خواب کی طرح چلی جا رہی ہوں کہ اچانک آنکھ کھل جائے اور وہ سارے منظر بھاپ بن کر اُڑ جائیں۔

شام ہو چلی تھی اور مَیں ہوٹل کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ڈیری کے کیبن میں تازہ دودھ کی سپلائی آنے میں ابھی دیر تھی اور سینکڑوں لڑکے، لڑکیاں اور چھوٹے بڑے منجھی ہوئی پتیلیاں

اور بالٹیاں لیے لمبی سی قطار میں کھڑے دودھ کا انتظار کر رہے تھے۔ دن کا رنگ سنولا چکا تھا، جامع مسجد کی اندرونی دیواروں میں جتنی اونچائی تک انسان کا سراپا پہنچتا ہے اُتنی اونچائی تک دیواریں میلی چکٹ ہو چکی تھیں اور اُردو بازار کے دوسرے سرے پر مرغیوں اور مچھلیوں کی بدبُو نے ٹوٹے ہوئے خواب کو اور بُری طرح توڑ ڈالا تھا۔

دِلّی کی آخری شمع کبھی کی بجھ چکی تھی اور وہ شعر کبھی کا پڑھا جا چکا تھا

تذکرہ دلّیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

آگرے کا دھندا

جس دن میں آگرہ پہنچا، یوں لگتا تھا کہ اس دن کے بعد شہر میں کوئی بن بیاہا نہیں رہے گا، ہر طرف شادیاں ہو رہی تھیں۔ اتنی باراتیں آرہی تھیں، جارہی تھیں کہ راہ چلنا دوبھر تھا۔ بینڈ باجوں کا وہ شور کہ خدا کی پناہ۔ جو عورتیں گھروں کے اندر بیٹھی تھیں وہ بھی شادی کے گیت گا رہی تھیں اور جن کی رنگ برنگی ٹولیاں سڑکوں پر چلی جارہی تھیں، وہ بھی بیاہ کے گیت گانے میں مصروف تھیں۔

اتنی ڈھیر ساری شادیاں دیکھ کر میں نے سوچا کہ اگر ہر دس سال میں آگرہ کی آبادی لاکھ سوا لاکھ بڑھ جاتی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

میں بس سے اُترا اور سائیکل رکشا پر بیٹھ کر ہوٹل کی طرف چلا تو پہلے ہی چوراہے کے درمیان ایک پرائیویٹ کلینک کا پوسٹر نظر آیا۔ اُس پر لکھا تھا "کیا آپ اُمید سے ہیں؟ اور کیا آپ کو بچّہ نہیں چاہیئے؟ ہم آپ کی مشکل آسان کر سکتے ہیں۔"

میں نے دِلّی میں شادی کرانے کے دفتر اور بہو کو جلانے کی فلم کے اشتہار دیکھے تھے اور صرف ۱۹۷ کلومیٹر جنوب مشرق میں سڑکوں پر شادیاں ہو رہی تھیں اور جن کے پیر بھاری تھے اُن کے سر سے بوجھ اُتارا جارہا تھا۔

آگرہ یوپی کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ ایک تو بے شمار صنعتیں، اوپر سے تاج محل۔ اِس عمارت

کی صرف ایک جھلک دیکھنے اور آٹھ دس تصویریں اتارنے کے لئے دنیا کے کونے کونے سے آئے ہُوئے سیّاح آگرے کی زندگی میں اتنا پیسہ گھول جاتے ہیں کہ مجھے اپنے قیام میں نہ کوئی فاقہ زدہ نظر آیا نہ ننگا۔ کوڑے کے ڈھیر تو تھے مگر انہیں کریدنے والے بچّے نہیں تھے۔

میرا رکشا والا آگرے کا پرانا مسلمان تھا۔ عرصے سے رکشا چلا رہا ہے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلوا رہا ہے تاکہ انہیں اچھا روزگار ملے۔ وہ سارے راستے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ مثلاً یہ کہ وہ دن بھر خون پسینہ ایک نہیں کرتا۔ ادھر دن کی آمدنی پوری ہُوئی، اُس نے رکشا بند کیا اور گھر چلا گیا۔ ایک بار وہ آگرے سے جے پور گیا تھا۔ وہ بھی سیّاحوں کا شہر ہے مگر وہاں سائیکل رکشا چلا کر دو وقت پیٹ بھرنا مشکل ہُوا تو آگرے واپس آنے ہی میں عافیت سمجھی۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ جے پور اور آگرے کے دھندے میں کیا فرق ہے؟

"جے پور کا دھندا اور ہے صاحب آگرے کا دھندا اور ہے۔ آگرے میں ہم ایک سواری سے پچاس، سو روپے بھی کما سکتے ہیں۔"

مَیں تو دِلّی دیکھے ہُوئے تھا جہاں رکشا والا دو روپے مانگتا ہے اور مسافر ڈیڑھ روپے پر اصرار کرتا ہے۔ مَیں نے حیران ہو کر اپنے آگرے کے رکشا والے سے پوچھا "مگر تم ایک مسافر سے پچاس روپے سو روپے کیسے کماتے ہو؟"

وہ مسکرایا اور یوپی کے مخصوص لہجے میں بولا "ارے، کماتے کیوں نہیں؟"

آگرے سے کافی باہر ہی سے اکبر اور شاہ جہاں کے زمانے کی شاندار عمارتوں کے کھنڈر ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کیسی کیسی حویلیاں رہی ہوں گی، اب خارزاریں ہو گئی ہیں۔

مجھے آگرے کے نامور شاعر اور دانش ور میکش اکبر آبادی صاحب سے ملنا تھا۔ وہ پرانے وقتوں کی نشانی ہیں اور اُردو ادب میں ان کا بڑا رتبہ ہے۔ پرانے شہر میں کہیں کوئی سیو کا بازار ہے، اس کے اندر میوہ کٹرا ہے، اس میں رہتے ہیں۔ چنانچہ میں پرانے شہر کی طرف چلا۔ اکبر اور شاہ جہاں کے قلعے کی شوکت و عظمت کو سراہتا، جہاں آرا بیگم کی

بے مینار مسجد کے تین بڑے بڑے گنبدوں کی سربلندی کا دم بھرتا میں آگے بڑھا۔ بیچ چوراہے میں ٹوپی اور ڈاڑھی والے کسی شخص کا مجسمہ نظر آیا۔ میں نظیر اکبر آبادی سمجھا، وہ شِواجی نکلے۔

اِس کے بعد آگرے کے بازار آگئے۔ کناری بازار، سیو کا بازار، جوتے چپلوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی دکانیں، سلے سلائے کپڑوں سے بھری ہوئی دکانیں، پانچ ڈالر میں دن گزارنے والے پھٹے حال گورے نوجوانوں کے لئے سستے ہوٹل، متھرا کے میٹھے سے لے کر برف پر آراستہ مکھن کے پیڑوں تک سو طرح کی مٹھائی بیچنے والے حلوائی۔ اور پھر آگرے کی چاٹ کی دکانوں میں تلی جاتی والی آلو کی ٹکیوں کی نہایت لذیذ مہک۔

اِن منظروں سے گزرتے ہوئے بازاروں اور گلیوں کے فرش پر جو نگاہ گئی تو دیکھا کہ جن سُرخ پتھروں سے شاہ جہاں کے قلعے بنے تھے، ویسے ہی سُرخ پتھروں کی لمبی لمبی سلوں سے یہ گلی کوچے پختہ کئے گئے تھے۔ یہ پتھر اس خوبی سے جمائے گئے تھے کہ کئی سو برس کی کوئی بارش، کوئی سیلاب چار چار چھ چھ فٹ لمبی اِن سلوں کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ فرنگی نے اِن پتھروں کی خوبی کو تاڑ لیا اور ہاتھ نہیں لگایا لیکن نئے دَور میں جب پانی کی فراہمی اور نکاسی کے لئے نالیاں اور پائپ ڈالنے کی ضرورت پڑی تو غضب ہوگیا۔ شاہ جہاں کے زمانے کے یہ پتھر اُٹھائے گئے اور بعد میں جب انہیں دوبارہ جمانے کی کوشش کی گئی تو کوئی انجنیئر ایسا نہ ملا جو ان پتھروں کو دوبارہ ویسے ہی سلیقے اور قرینے سے چُن دے۔ نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ شہر آگرہ کے کسی گھر کے راستے میں اب کوئی کہکشاں نہیں ہے۔ میں اِن ہی پتھروں پہ چل کر مکیش صاحب کے گھر پہنچا۔ بہت ضعیف اور کمزور ہوگئے ہیں۔ نقاہت کا عالم تھا۔ میرے آنے کی خبر پائی تو اُٹھ بیٹھے اور دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ میں نے پوچھا کہ پُرانے آگرے کے مقابلے میں آج کا آگرہ کیسا لگتا ہے آپ کو؟

مکیش صاحب نے کہا ”یہ سڑکوں کے پتھر تو ابھی وہی ہیں لیکن آدمی بالکل تبدیل ہوگئے۔ اب ایسا ہے کہ ہم بازار میں چلے جائیں تو معلوم ہوتا ہے ہم کسی اَور شہر میں آگئے ہیں۔ وہ آدمی

ختم ہوئے، وہ مکین تبدیل ہو گئے، ہم پہچانتے نہیں ان آدمیوں کو کہ وہ کون ہیں جو ہمارے ہمسایہ ہیں۔"

میکش اکبرآبادی صاحب بہت مُصر تھے کہ میں دو دن اور رُک جاؤں۔ دہلی سے غالب انسٹی ٹیوٹ کا پورا وفد آگرے آرہا تھا جو میکش صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ایوارڈ پیش کرنے والا تھا۔ اور چونکہ میکش صاحب بیمار اور کمزور تھے اس لئے یہ پوری تقریب وہیں اُن کے مکان پر ہونے والی تھی۔ قدر و منزلت کی یہ ادا اچھی لگی۔

جن مکانوں اور بازاروں کا میکش صاحب ذکر کر رہے تھے وہ شاہ جہاں اور اورنگزیب کے عہد کی تصویر ہیں۔ لمبے لمبے بازار، دو رویہ دو دو منزلہ عمارتیں، اوپر برآمدے، سایہ بان، دریچے، کٹہرے، محرابیں، چھجے اور چلمنیں۔ نیچے دکانیں ہی دکانیں۔ یہی حال ایک کے اندر ایک چلی جانے والی تنگ گلیوں کا ہے۔ مگر اب لوگ پُرانی عمارتیں ڈھا کر مارکیٹیں اور فلیٹ بنا رہے ہیں۔ جہاں مزدور لگے ہوں اور جہاں توڑ پھوڑ ہو رہی ہو، سمجھئے مارکیٹیں بن رہی ہیں، دکانیں نکالی جا رہی ہیں، فلیٹ کھڑے کئے جا رہے ہیں۔ بے شمار عمارتیں کھنڈر ہوئیں پھر بھی مغل عہد کا یہ شہر ابھی اپنی اصل حالت میں ہے مگر کچھ عرصے میں نہیں رہے گا۔

آگرے کی پُرانی آبادی اور ان گلیوں کے بارے میں شہر کے قدیم باشندے حکیم مبین الزماں صاحب نے دلچسپ باتیں بتائیں:

"شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں آگرے کی آبادی جمنا پار سے شروع ہوتی تھی۔ اور وہاں سے لے کر فتح آباد تک سب آبادی تھی۔ اور اکبر کے زمانے میں جو آبادی تھی وہ لوہا منڈی سے لے کر متھرا تک تھی۔ بڑے بڑے محل تھے، حویلیاں اور عمارتیں تھیں۔ وہ سب ختم ہو گئیں۔ اَب وہاں سب قبرستان ہو گئے — اب آبادی شاہ جہاں کے بعد جو ہُوئی ہے تو بستی میں ہُوئی ہے۔ اس زمانے میں یہ عمارتیں بنیں اور پتلی پتلی سڑکیں بنیں۔ پہلے زمانے میں چوڑی سڑکیں نہیں ہوتی

تھیں۔ اِس سے پہلے جو آبادی تھی وہ اُدھر ہی تھی، شہر باہر۔"

یہ تھے حکیم مبین الزّماں صاحب۔ ان کی باقی باتیں ذرا دیر بعد!

اب مرحلہ تھا آگرے کی سیر کا۔ کہتے ہیں کہ سفر شرط ہے، مسافر نواز بہتیرے ہیں۔ میرے ساتھ یہی ہُوا۔ وہیں سیو کے بازار میں، اُسی میوہ کٹرا کے اندر آگرے کے نامور صوفی، عالم، شاعر اور ادیب شاہ دلگیر مرحوم کا گھرانہ تھا۔ وہیں قدیم حویلی میں اُن کے بیٹے سیّد قیام الدّین شاہ صاحب رہتے ہیں۔ اب ضعیف ہو گئے ہیں اور نہ صرف اپنے خانوادے کے علم و ادب کے خزانوں کو بلکہ اعلیٰ روایات کو سینے سے لگائے ہُوئے ہیں۔

مَیں نے بھی حاضری دی۔ آگرے کے اس قدیم گھرانے میں ہندوستان کی وہی روایتی محبّت، شفقت اور عنایت آج تک گھر کئے ہوئے تھی۔ شاہ صاحب سب سے بڑے مہمان نواز نکلے۔ طے پایا کہ وہ مجھے فتح پور سیکری اور سکندرہ دکھانے لے جائیں گے۔ سخت تھکا دینے والا کام تھا مگر جب وہ خود اپنی ضعیفی کو بھُول گئے تھے تو مجھے کیا جو یاد دلاتا۔

اُن کے حکم پر ان کے بھتیجے نواب شاہ کی سفید جھلملاتی کار نکالی گئی اور یوں مجھے آگرے کی سیر نصیب ہُوئی۔ نواب میاں چوڑے چکلے گورے چٹے جوان۔ پورے شہر پر اُن کا دبدبہ۔ راہ میں ہر ایک نے انہیں سلام کیا۔

اِسی دوران نئی بستی میں ہندوستان کی ایک عظیم شخصیت سے ملاقات ہوئی، اور وہ ہیں شمس الدّین! مصوّر ہیں۔ اتنے نازک اور خوبصورت نقش اُبھارتے ہیں کہ تاج محل اگر اِس زمانے میں بنتا تو وہ بناتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے دوست تھے۔ ان کی مصوّری کی نمائشیں دنیا بھر میں ہُوئیں اور ایک ایک تصویر کئی کئی لاکھ روپے کی ٹھہری۔ وہ کاغذ پر رنگوں سے نہیں بلکہ کپڑے پر دھاگے سے نقش اُبھارتے ہیں اور رنگوں اور موتیوں سے ایک عالم کا حُسن سمیٹ لیتے ہیں۔

مَیں بھی شمس الدّین صاحب کے شاہکار دیکھنے گیا۔ وہ خود ضعیف ہو رہے تھے، اُن

کی آنکھوں میں شدید تکلیف تھی اور ڈر تھا کہ اس نامور مصوّر کی بینائی اُس کا ساتھ چھوڑ رہی ہے، بہت سے احباب کی طرح۔ ایک عظیم مصوّر اپنے ماضی کے قصّے دُہرا کر جی بہلا رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کی تصویروں میں ٹکے ہُوئے لاکھوں موتی جھلملا رہے تھے مگر وہ دو موتی ماند پڑ چلے تھے جو انہیں آراستہ کیا کرتے ہوں گے۔

آگرے کی ایک اور شخصیت جسے بھولنا مشکل ہے حکیم سیّد مبین الزّماں قادری صاحب تھے جنہیں دنیا مولانا مبین کے نام سے جانتی تھی۔ چھوٹا سا قد، سرخ و سپید رنگت، مہندی سے رنگے ہوئے جھلملاتے بال اور ڈاڑھی، سفید براق لباس، چاندی کے کام کے سلیم شاہی جوتے، پھرتیلا بدن اور کھلاڑیوں جیسا جسم۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں اُس محفل کی جان بن جائیں اور اُسے گل و گلزار بنا دیں۔ میں اصرار کر کے حکیم صاحب کی جوانی کے قصّے سُن رہا تھا۔ مَیں نے پوچھا: "آپ نوجوانی میں کھلاڑی رہے ہیں، آپ کیا کھیلتے تھے؟" جواب ملا:

"مَیں ایک تو کرکٹ کھیلتا تھا، ایک فٹ بال میں گول کیپر کھیلتا تھا۔ مَیں کرکٹ میں فاسٹ بولر تھا۔ اُس وقت کے اخباروں پانیر اور لیڈر وغیرہ سب میں میرا ریکارڈ ہے اور یہاں تک ریکارڈ ہے کہ پانچ رن دے کر پانچ کھلاڑی آؤٹ کئے۔ مَیں اُنیس قدم بھاگ کر گیند پھینکتا تھا اور کئی آدمی میرے لنگڑے کئے ہُوئے موجود ہیں۔ دو کی ناکیں مَیں نے توڑ دی ہیں۔ ایک صاحب کا گھٹنا ٹوٹ گیا آج تک وہ بیساکھیاں لے کر چلتے ہیں۔ یہاں مثالیں موجود ہیں۔ یہاں ایک استاد مجید تھے، ان کی ناک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ انور بھی ابھی موجود ہے۔ اس کی ناک توڑ ڈالی۔"

۸۵ء میں جب حکیم مبین صاحب سراپا شگوفہ بنے ہُوئے تھے وہ اکیاسی برس کے ہو چکے تھے اور یوں لگتا تھا کہ ابھی بہت جئیں گے مگر اگلے ہی سال کہیں راہ چلتے گر پڑے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹروں نے بچانا چاہا مگر قدرت کی فاسٹ بولنگ کے آگے

وہ خود بھی نہ ٹھہر سکے۔

اُس روز انگریزوں سے اپنی دوستی کا اور خود اُن ہی کی طرح انگریزی بولنے کا قصّہ سُنا رہے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کے لب و لہجے کی ٹھیک ٹھیک نقل کرتے تھے۔ مَیں نے پوچھا کہ حکیم صاحب آپ نے انگریزی کہاں تک پڑھی ہے؟

"صرف کنگ ریڈر پڑھی ہے۔ انگلینڈ تک! ایک انگریز تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ تو جب کبھی ملتا تو کہتا: ڈاکٹر، چیئر یُو۔ اِس پر مَیں کہتا: او، آل رائٹ، چِڑ یُو۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ چِڑ یو کہہ رہا ہے کہ چیئر یُو کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا: آل رائٹ، نیکسٹ ٹائم آئی وِل کم۔ مَیں کہتا: آل رائٹ۔ یُو وِل کم اِن مائی ہاؤس۔ وہ کہتا آل رائٹ آل رائٹ۔ وہ چیئر یُو کہہ کر چلا، مَیں نے چِڑ یُو کہہ دیا۔"

اِس گفتگو کے وقت جو احباب قریب بیٹھے تھے ہنستے ہنستے دُہرے ہو گئے۔ حکیم صاحب نے دنیا دیکھی تھی۔ رؤسا کا علاج کیا کرتے تھے۔ مرض بھی وہی مخصوص رؤسا اور نوابین والا ہُوا کرتا تھا۔ اس دن یوپی کے دیہات کی زندگی کا حال سُنا رہے تھے اور گاؤں کی عورتوں کے قصّے سنا رہے تھے۔ اب ان کی گفتگو کا ٹیپ چلا کر سُنتا ہُوں تو سوچتا ہُوں کہ ایسے زندہ دِل لوگ بھی مر جایا کرتے ہیں۔

کہنے لگے: "گاؤں کا یہ قصّہ ہے کہ جب عورتوں کی شادی ہو جاتی ہے، وہ اپنا میکہ چھوڑ کر سُسرال جاتی ہیں تو ایک رتھ ہوتا ہے۔ رتھ میں پردے ڈال کر وہ بیٹھ جاتی آگے آدمی بیٹھ جاتے ہیں اور وہ روتی ہُوئی جاتی ہیں۔ اُن کا رونا یہ ہوتا ہے:

ارے میرے للوے، کدھر کو جاوُوں، تری نانی رے۔
ادئے موڑا۔ ارے مَیں جائی کے گھر کو کیسے دیکھوں گی۔
رے میتو۔ او میتو۔ مَیں کیا کروں میتو!

تو لوگ آن کے کھڑے ہو جاتے تھے دروازوں پر کہ یہ کون عورت جا رہی ہے روتی ہوئی۔ تو اس طریقے سے ان کا رونا ہوتا تھا اور ان کا گانا ایک اور ہوتا ہے۔ ان کا گانا یہ ہوتا ہے اور ذو معنی ہوتا ہے۔ آپ ہی شاعر نہیں ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ان کو بھی شاعر بنایا ہے۔ دیکھئے ان کی شاعری ذو معنی ہوتی ہے۔

او رے فرنگی نل مت لگوا وے رے

موری طبیعت گھبراوے رے۔ او رے فرنگی!

کیا مطلب ؟ ۔ پن گھٹ پر عورتیں پانی بھرنے آتی ہیں تو وہاں ایک دوسرے سے اپنا قصّہ کہتی رہتی ہیں۔ تو وہ کہہ رہی ہیں کہ جب نل لگوا دے گا تو ہم کوئی بات بھی نہیں کر سکیں گے، تو نل مت لگوا ورنہ میری طبیعت گھبراوے گی۔

پھر اس کا دیور جو ساتھ لے کر جاتا ہے گاؤں سے تو وہ یہ گاتی ہوئی چلتی ہے:

ارے کانٹا لاگو رے دیوریا
موپے گیل چلا نہ جائے
جوتے چنا کی کھا لوں گی
تو لے چل گنگا پار ؎

اُداس عمارتیں

یہ سیکری ہے۔ فتح پور سیکری۔ حضرتِ شیخ سلیم چشتی کی آخری آرام گاہ۔ جلال الدین محمد اکبر کے شیخو بابا کی جائے پیدائش۔ سرزمین ہند کا ایک عظیم الشان شہر جسے اکبر نے بسا کر سنسان ٹیلوں کو گل و گلزار کر دیا اور جہاں سے وہی اکبر ایک روز اٹھا اور چلا گیا۔ جو مدفون تھے وہ تو منوں مٹی تلے دبے رہ گئے۔ باقی امیر اُمراء، وزراء، رؤسا، درباری، بازاری سب نے اپنا مال اسباب سمیٹا اور بادشاہ کے ساتھ اِس شہر سے نکل گئے اور اپنے پیچھے ویرانے چھوڑ گئے۔ حضرتِ سلیم چشتی کا مدفن نہ ہوتا تو آج اِن محلوں میں جنگل اُگے ہوتے، اِن درباروں میں درندوں کا بسیرا ہوتا اور حویلیوں کے دالانوں میں ہُو کا عالم۔

مَیں جو پہنچا تو قیامت کی گرمی تھی۔ دس ہزار نمازیوں کے لئے بنائی جانے والی مسجد بڑی جامع مسجد کا فرش پُھک رہا تھا اور بادشاہی دروازے سے شیخ سلیم چشتی کے روضہ تک ننگے پیر جانے والوں کے لئے ایک ڈیڑھ فٹ چوڑی ٹاٹ کی پٹی بچھا دی گئی تھی۔

جون پور سے جاپان تک ہر جگہ سے لوگ چلے آ رہے تھے۔ کوئی دکھیا یہ تمنا لے کر کہ جودھا بائی کی طرح اس کی بھی گود ہری ہو اور کوئی سیّاح یہ دیکھنے کہ وہ مکان دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں جنہیں دیکھ کر یوں لگے کہ اُن کے مکین ابھی چند روز پہلے بادلوں پر چلتے ہُوئے آسمانوں میں چلے گئے ہوں گے۔ شیخ کی درگاہ میں غیر ملکوں کے سیاحوں کو آگرے

کی انگریزی میں بتایا جا رہا تھا کہ یہ اکبر کے "گرو" کی قبر ہے۔

فتح پور سیکری میں اِن سیاحوں کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ مَیں لندن سے چل کر ۱۹۸۵ء میں یہاں آیا ہُوں، انگلستان کا اوّلین سیاح رالف فِنچ پورے چار سو سال پہلے ۱۵۸۵ء میں لندن سے یہاں آیا تھا اور اس نے لکھا تھا کہ آگرہ اور سیکری، دونوں شہر لندن سے بڑے ہیں۔ دونوں کے درمیان ۲۳ میل لمبی سڑک دکانوں سے بھری ہُوئی تھی اور یہاں سے وہاں تک ایک شہر معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرف ریشمی کپڑا، عقیق، ہیرے اور موتی فروخت ہو رہے تھے اور امرا سونے چاندی کے کام والے ریشمی پردوں سے ڈھکی دو پہیوں والی خوبصورت گھوڑے گاڑیوں پر گزر رہے تھے۔ اور گھوڑے بھی تمام دنیا کے گھوڑوں سے تیز!

رالف فِنچ کے چار سو سال بعد مَیں جب ۲۳ میل لمبی اس سڑک سے گزرا تو بائیں ہاتھ کو ہندوستانی فضائیہ کا زبردست اڈّہ تھا کہ جس کی توانائی پھٹ پڑے تو پورے پُورے ملک لرز اُٹھیں لیکن چند میل آگے ویرانے میں وہ پُل تھا جہاں ڈاکو دن دہاڑے مسافروں کو روک کر ان کے بٹوے چھین رہے تھے، گھڑیاں اُتروا رہے تھے اور کوئی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

فتح پور سیکری دیکھنے کی جا ہے۔ نوبت خانہ، ہاتھی خانہ، دارالضرب، خزانہ، دیوانِ عام، دیوانِ خاص، خواب گاہ، دفتر خانہ، اصطبل، لڑکیوں کا مکتب، محل کی عورتوں کے لیے چھوٹی سی مسجد، ہندو جیوتشی کے بیٹھنے کا ٹھکانا، وہ پچیسی جس کے خانوں میں کنیزیں چلا کرتی تھیں، بادشاہ اور ان کے ساتھی بلندی پر بیٹھ کر پانسے پھینکتے تھے اور خانوں میں کھڑی کنیزیں گھنی سیاہ پلکیں اُٹھائے آگے بڑھنے کے اشارے کی منتظر رہا کرتی تھیں اور جو پِٹ جاتیں تو تھکی ہاری وہیں ایک چبوترے پر بیٹھ کر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رویا کرتیں اور بادشاہ ہنسا کرتے۔

اب وہاں سناٹا سسکیاں بھرا کرتا ہے۔

قریب ہی چار چمن ہے جہاں گلاب کے فوارے چلا کرتے تھے اور دلکش حوض کے درمیان آرائشی چوکی پر بیٹھ کر میاں تان سین گایا کرتے تھے۔ میرے رہنما، نواب بھائی بتاتے جا رہے تھے "یہاں بادشاہ آرام کرتے تھے۔ یہاں بیٹھتے تھے۔ تان سین یہاں گانا گاتا تھا بیٹھ کر۔ آرام کرنے کی جگہ نیچے ہے جہاں گلاب کا فوارہ چلا کرتا تھا۔ وہاں بڑا سا پھول بنا ہوا ہے جس میں گلاب بھرا رہتا تھا اور فوارہ چلتا تھا۔"

وہیں اکبر کی راجپوت مہارانی کا مکان ہے۔ اس میں سواستیکا کا نشان، پوجا پاٹھ کا استھان اور تلسی کا پودا آج بھی موجود ہے۔ وہیں وہ دنیا کا سب سے خوبصورت کمرہ ہے جس میں کہتے ہیں کہ اکبر کی ترک سلطانہ رہا کرتی تھی۔ اس کی دیواروں پر جنگل اور باغوں کے ایسے خوبصورت منظر تراشے گئے ہیں کہ آنکھ طے نہیں کر پاتی کہ کیا نہ دیکھے، کیا دیکھے اور کتنی دیر دیکھے۔ آج بھی ایک ایک پتہ ایک ایک بوٹا صحیح سلامت ہے البتہ بعد میں کسی نے جانوروں اور پرندوں کے نقش توڑ دیئے کیونکہ وہ مذہب میں حرام ہیں۔

وہیں پنج محل ہے۔ اوپر تلے پانچ منزلیں۔ نیچے بڑی، اوپر چھوٹی اور سب سے اوپر نہایت دلکش چھتری جس میں جا کر شہزادیاں عید کا چاند دیکھا کرتی ہوں گی، آنکھیں بند کر کے دعائیں مانگا کرتی ہوں گی اور کنیزیں آئینہ لئے کھڑی ہوتی ہوں گی تاکہ چاند کے بعد شہزادی سب سے پہلے خود اپنا چہرہ دیکھیں۔

وہیں وہ عمارت ہے جس کا نام آنکھ مچولی ہے۔ شہزادیاں وہاں آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھیں۔ وہیں وہ طاق بنے ہیں جن میں وہ اپنے زیور رکھ دیا کرتی تھیں تاکہ بھاگ دوڑ اور چھینا جھپٹی کے دوران کہیں نگ نہ جھڑ جائیں، کہیں موتی نہ بکھر جائیں۔

کیسی رونق کی جگہ ہوگی کہ آج پورے چار سو سال بعد بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ لڑکیوں کے کھلکھلا کر دوڑنے اور ہنسنے کی آوازیں جیسے ابھی ذرا دیر پہلے تک گونج رہی تھیں۔

اس بھنڈارے محل کے سارے گوشے تنہا اور ویران سے تھے مگر بے رونقی کہیں نہیں تھی، خوف کبھی نہیں آتا تھا۔ نواب بھائی نے جو وہیں فتح پور سیکری کے باشندے ہیں اُس روز یہی بات اپنے فلسفے کے رنگ میں کہی تو کچھ یوں کہی :

"جو بھی آپ کہہ لیں۔ نیک پیسہ سمجھیں یا اس کی نیک محبّت سمجھیں جو یہ بنوایا ، ورنہ آج ایک محل بنا کے اگر اکیلے گھس جائیں اُس میں تو آپ کی طبیعت نہیں لگے گی۔ اِسے آپ تنہا بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں اور آپ کی طبیعت خوش ہوتی رہے گی۔ یہ چیز دیکھنے کی ہے۔ یہ فرق ہے ہمارے اور اُس کے پیسے میں اور آج کے زمانے میں۔"

اکبر کے محلوں سے چل کر ہم اکبر کے مقبرے پر پہنچے۔ آگرہ سے پندرہ میل دُور سکندرہ میں تمام بستیوں اور آبادیوں سے دُور زرعی زمینوں کے بیچ یہ شاندار عمارت تنہا کھڑی ہے۔ بڑے بڑے شاہانہ دروں سے گزر کر آپ ایک لمبے اندھیرے اور تنگ راستے سے ہوتے ہوئے اکبر کی قبر پر پہنچتے ہیں جس کے اوپر سو واٹ کا بلب جل رہا ہے۔ ننگا سا بلب جسے ایک معقول شیڈ بھی نصیب نہیں۔ اکبر کی اس قبر کے بارے میں کچھ مورخ کہتے ہیں کہ جب جاٹوں نے آگرے کو لُوٹا تھا تو قبر کھود کر اور اکبر کی ہڈیاں نکال کر جلا دی تھیں۔

قبر کا خوبصورت تعویذ عمارت کی چوتھی منزل پر یعنی کھلی چھت پر ہے۔ سفید پتھر میں اللہ کے ننانوے نام تراشے گئے ہیں۔ قبر کی ایک جانب اللہ اکبر اور دوسری جانب جل جلالہٗ لکھا ہے۔ اطراف میں اونچے در ہیں، جالیاں اور جھروکے ہیں۔ ہندو اور مسلم طرزِ تعمیر کی آمیزش نے اس عمارت کو عجب کردار عطا کیا ہے۔ پھر کچھ بے رونقی بھی ہے۔ سنّاٹا بھی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ عہدِ مغلیہ کا سب سے بڑا شہنشاہ یہاں دفن ہے۔

مَیں بالائی منزل کے فرش پر چلتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سچے دین سے پھر گیا تھا اس لئے مقبرے پر ویرانی ہے۔ کہیں یوں تو نہیں کہ اُس نے اپنا الگ مذہب بنا لیا تھا اِس لئے قبر پہ بے رونقی ہے۔ یہ تو نہیں کہ قدرت نے حساب

بیباق کیا اور آخر اُس کی ہڈیاں نکال کر جلائی گئیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ نیچے عمارت کے برآمدوں میں دو مغل شہزادیوں کی قبریں ہیں جن پر نور اُتر رہا ہے اور جن پر رحمتوں اور برکتوں کا سایہ صاف نظر آتا ہے لیکن شہنشاہ کے مرقد کے مقدر میں سو واٹ کے ننگے بلب سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے کہ یک لخت میرے ایک ساتھی نے زور سے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف کھینچ لیا۔ اُس وقت میرے سامنے فرش میں کھلنے والا زینہ اپنا منہ کھولے ہُوئے تھا، وہ مجھے نظر نہیں آسکا تھا اور اُس وقت مجھ میں اور میری یقینی موت میں بمشکل دو قدم کا فاصلہ تھا۔ مَیں سہم کر رہ گیا۔ کیا قدرت وہیں موقع پر سرسری سماعت کر کے حساب بیباق کر دینا چاہتی تھی؟

اتنے میں زور کی آندھی اُٹھی۔ گرد نے سب کچھ چھپا لیا۔ اکبر کی قبر کا تعویذ بھی دھندلا گیا البتہ اُس کے سرہانے اور پیتانے کی تحریر صاف نظر آ رہی تھی۔

اللہ اکبر ـــــ جل جلالہٗ

اب اگلا پڑاؤ تاج محل تھا۔ جرنیلی سڑک کا یہ سفر آخر مجھے وہاں لے گیا جہاں مَیں نے عمر بھر چاہا تھا کہ کوئی مجھے لے جائے۔

تاج محل ـــــ وہی نہر، وہی فوارے، وہی اونچے چبوترے پر ہشت پہلو عمارت اور اس کے وہی مینار اور وہی گنبد۔ سب جیسے دیکھا بھالا مگر سب جیسے بالکل نیا، بالکل اچھوتا۔

عمارت، محبت سے سرشار ایک بادشاہ کی بنوائی ہوئی۔

نام، پورب پچھم، اُتر دکھن سے آنے والے دیہاتیوں کا رکھا ہوا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تاج محل کا یہ نام کبھی نہ تھا۔ یہ روضۂ ممتاز محل تھا۔ دیہاتیوں کے منہ سے ممتاز محل نہ نکلا تو اُنہوں نے اسے تاج محل بنا دیا۔

اور یہ بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ خوابوں جیسی اس شفاف عمارت کو کس کس طرح

داغ دار کیا گیا۔ ۱۷۶۱ء میں جب بھرت پور کے جاٹوں نے آگرہ لوٹا تو وہ تاج میں جڑے ہُوئے نگینے خنجروں کی نوک سے اُکھاڑ اُکھاڑ کر لے گئے۔ اس سے پہلے ایک بادشاہ کو سونے کی ضرورت پڑی تو اُس نے قبر کے گرد لگی ہوئی سونے کی نہایت دلکش جالی پگھلا کر سکّے بنا لئے اور ایک انگریز وائسرائے نے آکر ہندوستان کی مالی حالت بہتر بنانے کی ٹھانی تو سوچا کہ تاج محل گرا کر اِس کا پتھر بیچ دیا جائے۔ حساب لگایا تو پتہ چلا کہ بہت تھوڑے پیسے ملیں گے۔ جو پتھر جہاں جما ہے وہیں قیمتی ہے۔ ایک بار نیچے آ رہا تو راہ کے پتھر جیسا حقیر ہو گیا۔ وہ تو لارڈ کرزن نے آکر شاہ جہاں کی اس یادگار کو مرمت کرا کے تقریباً نیا کرایا، اس کی چھت میں خوبصورت لیمپ آویزاں کیا اور جو رنگ برنگے پتھر نوچ لئے گئے تھے ان کی جگہ رنگ بھروایا۔

مَیں جس وقت تاج محل کی عمارت میں داخل ہوا، پورب پچھم، اتر دکھن سے آئے ہُوئے نوعمر لڑکے گردنیں اونچی کر کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ مَیں ڈرا کہ نوجوان ہیں، شاید ان کے دماغ پر بن گئی ہے، مگر پتہ چلا کہ ارجمند بانو کی قبر پر آنے والے من چلے نوجوان چلاّ چلاّ کر اس پُرشکوہ عمارت کے عظمت اور جلالت والے گنبد میں اپنی آواز کی گونج سُن رہے ہیں۔

آج جہاں یہ ہاؤ ہُو ہے، سترہویں صدی تک یہ عمارت بند رکھی جاتی تھی! اُن دِنوں تاج محل صرف کبھی کبھی کُھلتا تھا اور غیر مسلموں کو بہر حال داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ شروع شروع کے یورپین سیّاح اسے اندر سے دیکھنے کی تمنا لئے واپس چلے گئے۔ اب تو نیچے تہ خانے میں شاہ جہاں اور ارجمند بانو کی اصل قبریں بھی سیر کرنے والوں کے لئے کُھلی ہیں اور اُس ذرا سے کمرے میں اتنی خلقت ٹھنسی رہتی ہے کہ دَم گُھٹتا ہے اور صحیح معنوں میں قبر کا لطف آتا ہے۔ اب سُنا ہے کہ وہ جگہ بند کی جا رہی ہے۔

میرے رہنما نے مجھے سنگِ مرمر کے ایک ایک پتھر میں تراشی ہوئی وہ بڑی بڑی جالیاں

دکھائیں کہ اس سائنسی دور کی کوئی مشین اور کوئی کمپیوٹر ویسی جالیاں نہیں تراش سکتا۔ دیواروں میں تراش کر اُتارے ہُوئے وہ نقش دکھائے جن کا ایک ایک پُھول چونسٹھ مختلف پتھروں سے بنایا گیا ہے اور ایک ایک پنکھڑی میں تین تین چار چار رنگین پتھر بٹھائے گئے تھے جن پر رکھ کر ٹارچ روشن کی گئی تو دیوار اندر تک منوّر ہو گئی۔

پوری عمارت میں اس قدر ترتیب ہے کہ جو چیز دائیں جانب ہے ویسی ہی چیز بائیں جانب بھی ہے۔ ایک طرف سنگِ سُرخ کی مسجد ہے تو دوسری طرف اس کا جواب ہے جو تسبیح خانہ کہلاتا ہے۔ صرف ایک چیز نے اس ساری ترتیب کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور وہ ہے خود اس عمارت کے خالق شاہ جہاں کی قبر۔

سامنے قلعہ آگرہ صاف نظر آتا ہے۔ اُس میں وہ بُرج بھی ہے جہاں بسترِ مرگ پر پڑا ہُوا ضعیف بادشاہ بُجھی بُجھی سی آنکھوں سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔ بیٹے کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں اُٹھا کر جب شاہ جہاں اس دُنیا کی قید سے آزاد ہُوا تو اورنگ زیب نے لا کر اُسے تاج محل کے اندر دفن کر دیا۔

اب لوگوں نے شاہ جہاں کو پہنچا ہُوا بزرگ قرار دے دیا ہے اور ہر سال رجب کی ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ تاریخ کو یہاں شاہ جہاں کا عرس ہوتا ہے۔ قوّالیاں، میلاد اور مشاعرے ہوتے ہیں۔ اَور تو اَور، لوگوں نے منّتیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، مگر بڑا غضب ہُوا۔ کسی سرکاری دفتر میں بیٹھے ہُوئے کسی بابو صاحب نے یہ چڑھاوے بند کرانے کا فیصلہ کیا مگر اس کی خاطر اس عمارت کے سینے میں جس طرح کیل گاڑی گئی، وہ دیکھنے والے کے اپنے دل تک اُترتی ہُوئی محسوس ہوتی ہے۔

ہُوا یہ کہ تاج محل کی اصل عمارت کے صدر دروازے کی دیوار پر ایک بورڈ ٹھونکنے کا فیصلہ کیا گیا جس پر اُردو میں لکھا ہُوا ہے: "مزار میں کسی قسم کے چڑھاوے کی اجازت نہیں ہے۔ آنے والوں سے لہٰذا درخواست ہے کہ وہ کسی قسم کا چڑھاوا نہ کریں۔

سپرنٹنڈنٹ آرکیولوجسٹ "۔

ایک روز مزدور یہ بورڈ، چار بڑے بڑے کیلے اور ہتھوڑا لے کر آئے اور سنگِ مرمر کی دیوار پر پہلا ہی کیلا گاڑ رہے تھے کہ عمارت کا ایک حصّہ ٹوٹا اور نیچے فرش پر آ رہا۔ لوگ جو تاج محل دیکھنے آئے ہُوئے تھے چیخنے اور احتجاج کرنے لگے۔ مزدوروں کو حکم ہوا کہ ادھر کی دیوار چھوڑیں اور یہ بورڈ سامنے والی دیوار پر لگا دیں۔ چار کیلوں سے وہ بورڈ اب تک وہاں ٹھنکا ہُوا ہے لیکن سنگِ مرمر کی دیوار کو جو نقصان پہنچا ہے اب خود شاہ جہاں آکر بھی اسکی مرمّت نہیں کر سکتا۔

اِس عمارت کی عین پشت پر ٹیلی ویژن کے ایریل کا بے حد اونچا کھمبا کھڑا کر دیا گیا ہے جس پر اوپر سے نیچے تک سُرخ بتّیاں جلتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی رخسار پر خراش ڈالی گئی ہو اور اُس سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔

چاروں بڑے دروازوں کے گرد سنگِ مرمر میں تراش کر سیاہ پتھر سے قرآن کی جو آیتیں لکھی گئی ہیں، ان کا سیاہ پتھر ڈھیلا پڑ گیا تھا، حروف اپنے جوڑ سے باہر نکل رہے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ یہ آیاتِ قرآنی کسی بھی لمحے نیچے آ رہیں گی۔ پچھلے دنوں اخباروں میں پڑھا کہ یہی ہُوا۔

تاج محل چاندنی راتوں میں کھلا رہا کرتا تھا۔ اب سورج ڈوبنے کے بعد بند کر دیا جاتا ہے۔ ڈر ہے کہ سکھ دہشت پسند اُسے بارود سے نہ اُڑا دیں۔

ممتاز محل کی قبر کے اوپر کرزن کا پیش کیا ہُوا عظیم الشان لیمپ تاریک پڑا رہتا ہے۔ یہاں بھی وہی سو واٹ کا ایک ننگا بلب لگا ہے، وہ بھی فیوز ہو جاتا ہے یا لوڈ شیڈنگ کی زد میں آکر شام ہی سے مفلس کا چراغ ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ تاج محل کا اپنا حُسن اپنی جگہ مگر اس کے اصل حُسن کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک تو یہ کہ اُسے دیکھنے کے لئے آپ کس کے ساتھ آئے ہیں اور دوسرے یہ کہ دن یا رات

کے کس حصے میں آئے ہیں۔

مَیں جب وہاں پہنچا، سکندرہ والی آندھی گزر کر کہیں دُور جا چکی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹ میں خاک مل جانے سے فضا سنولائی گئی تھی اور خود تاج محل کی عمارت روشنی کے رُخ گلابی اور سائے کے رُخ سرمئی سی ہو گئی تھی۔ مَیں واپس لَوٹ رہا تھا۔ باہر کے بڑے دروازے سے نکلتے ہُوئے ہر مسافر کی طرح مَیں نے بھی آخری بار پلٹ کر دیکھا۔ نیلے آسمان پر ٹھہری ہُوئی گرد نے فضا میں عجب رنگ بھر دیئے تھے اور تاج محل خاموش کھڑا تھا۔ کہیں عمارتیں بھی اُداس ہُوا کرتی ہیں مگر اُس روز مجھے وہ عمارت اُداس لگی۔

شاید اس لئے کہ اُس روز مَیں وہاں اپنی تنہائی کے ساتھ گیا تھا۔

مولا آئیں گے

بچپن کی خواہشوں کا عجیب معاملہ ہے۔

وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔

میں چھوٹا سا تھا تو ریل گاڑی اور ٹرین کا سفر اچھا لگتا تھا۔ شاید ایک بار طوفان میل سامنے سے گزر گیا تھا۔ اُس وقت میں نے جی میں ٹھانی تھی کہ کبھی نہ کبھی طوفان میل میں بیٹھوں گا ضرور۔ اس کے بعد کتنے ہی طوفان نہ صرف سامنے سے بلکہ سر پر سے گزر گئے اور طوفان میل نے خوابوں میں بھی آنا چھوڑ دیا۔

اُس روز جب آگرے سے کانپور جانے کے لئے میں اپنے احباب سے مشورہ کر رہا تھا اور ہر ایک مختلف بات کہہ رہا تھا، ایک گوشے سے کسی کی آواز آئی: طوفان میل سے چلے جایئے!

یہ سُن کر میں اُتنا ہی خوش ہوا جتنا بابر آگرہ فتح کر کے ہوا تھا، بس یہ ہے کہ میں اُس کی طرح کابل کے ہر باشندے کے لئے ایک ایک اشرفی نہ بھجوا سکا۔

طوفان میل پکڑنے کے لئے میں مقررہ وقت پر آگرہ چھاؤنی کے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سناٹا پڑا تھا۔ میں شاید عالمِ شوق میں ذرا زیادہ ہی جلدی پہنچ گیا تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی میں منہ ڈال کر میں نے صدا لگائی: "کانپور کا ٹکٹ دے دیجئے، طوفان میل سے۔"

ٹکٹ بابو نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا "طوفان میل ؟ وہ تو نکل بھی گیا"

"ارے ! اب کیا ہوگا ؟ " میں گھبرا گیا۔

"ایسا کیجئے " ٹکٹ بابو بولے " سامنے سے آٹو رکشا پکڑیئے اور جلدی سے آگرہ فورٹ چلے جایئے۔ طوفان میل شاید وہاں کھڑا ہو"

اتنی مستعدی سے میں نے شاید ہی کبھی کسی کا مشورہ مانا ہو۔ اپنا سامان اٹھا کر لپکا۔ سامنے سے آٹو رکشا لیا (جس نے دوگنے پیسے مانگے) اور فرّاٹے بھرتا آگرہ فورٹ کے اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں بھی پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ میں ہانپتا ہوا ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہنچا " سنیئے، کیا طوفان میل نکل گیا ؟ "

ٹکٹ بابو بولے " نکل گیا کا کیا مطلب ؟ ابھی آیا ہی نہیں "

معلوم ہوا کہ راستے میں شہر کے کسی چوراہے پر کھڑا ہے۔ پھر کافی انتظار کے بعد آیا اور اب جو روانہ ہوا تو نہ اس کا حال طوفان جیسا تھا، نہ چال میل جیسی۔ وہ ایک فضول سی ٹرین تھی جو چلتی کم اور رکتی زیادہ تھی۔ گندی، ناقص، اندر لاپروائی سے ٹھونکے ہوئے تختے جن کی کیلیں نکلی پڑ رہی تھیں۔ فرسٹ کلاس کے اُس ڈبے میں کرایہ دے کر سفر کرنے والا تنہا مسافر میں ہی تھا۔ باقی سب ریلوے کے ملازم تھے جو مفت سفر کی پرچیاں کٹوا کر لائے تھے۔ ان کے علاوہ دو کانسٹیبل تھے جن کے ہاتھوں میں شاید دوسری عالمی جنگ کی ایک ایک رائفل تھی۔ کسی ویرانے میں جوں ہی گاڑی رُکتی، وہ لپک کر باہر اتر جاتے۔ تب پتہ چلا کہ یہاں گاڑیاں روک کر لوٹ لی جاتی ہیں اور ڈاکوؤں کے مقابلے کے لئے ہر ٹرین پر دو مسلح کانسٹیبل چلتے ہیں۔

اتنی ادھ موئی ٹرین کو کوئی احمق ہی لوٹے گا۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا اور جہاں تا حدِ نگاہ پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھنے لگا جن کی فصلیں کٹ چکی تھیں اور خالی پڑی ہوئی زمین پر دھوپ کھولتے ہوئے لاوے کی طرح برس رہی تھی۔ دریا سوکھا ہوا تھا اور

خشک ریت میں خربوزے، کھیرے اور ککڑی کی فصلیں اگالی گئی تھیں۔ دور دور تک سناٹا تھا۔ ریل کے چلنے سے یہ سناٹا ٹوٹتا لیکن ریل چلے، تبھی تو۔

البتہ ایک بات کی داد دینا پڑے گی۔ اِدھر اُدھر ویرانوں میں تو یہ طوفان میل ایک ایک گھنٹے کھڑا رہتا البتہ جو اس کے کھڑے ہونے کا مقام ہے یعنی ریلوے اسٹیشن، وہاں یہ عالم کہ ابھی پوری طرح رکا بھی نہیں کہ چل پڑا۔ بچارے مسافر پانی پانی پکارتے رہ گئے۔ پلیٹ فارموں پر بیٹھے ہوتے ہو تق بندروں کو بھی مسافروں کے ہاتھ سے آلو پوری جھپٹنے کا موقع نہیں ملا۔

گاڑی کو اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے کانپور پہنچ جانا تھا لیکن ابھی آدھی راہ کٹی تھی کہ رات آ پہنچی۔ اور وہ بھی اس شان سے کہ تمام ریلوے اسٹیشنوں پر بجلی کی لوڈشیڈنگ ہو رہی تھی۔ پلیٹ فارموں پر گھپ اندھیرا تھا اور مسافر چلّا رہے تھے: پانی کہاں ہے؟ نل کدھر ہے؟

ہر مرتبہ جواب میں گارڈ کی سیٹی سنائی دیتی۔

خدا خدا کر کے روشنیاں نظر آئیں مگر روشنیاں ایسی جیسے دھوئیں میں گھول دی گئی ہوں اور اس میں کچھ گرد بھی ملا دی گئی ہو۔ یہی کانپور تھا۔

ٹرین کھیتوں میں چلتے چلتے اچانک کارخانوں میں داخل ہو گئی۔ ہر طرف فیکٹریاں ہی فیکٹریاں، پلانٹ ہی پلانٹ، چمنیاں ہی چمنیاں — اور ریلوے لائن کی دونوں طرف جھگیاں ہی جھگیاں، جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں۔ اور خالی کھڑی ہوئی کئی ہزار سائیکل رکشا جنہیں صبح ہوتے ہی کرائے پر لے کر یہ سوکھی سوکھی ٹانگوں والے، دھنسی دھنسی آنکھوں والے محنت کش لاکھوں کی آبادی کے اِس شہر کے ریلے میں کود پڑیں گے۔

اور شہر بھی ایسا کہ اس کی اُدھڑی ہوئی سڑکوں کا حال بیان کرنے کے لئے کتنا ہی زورِ خطابت صرف کر دیا جائے سننے والوں کے ذہن میں تصویر نہیں بن سکتی۔ میں جو اسٹیشن

سے سائیکل رکشا پر بیٹھ کر چلا تو ذرا دیر بعد یہ حال تھا کہ ایڑی کی ہڈی اور گردن کی ہڈی میں تمیز نہ رہی۔

میں حیران تھا کہ اس کانپور میں جو ابھی ۱۷۸۰ء تک چھوٹا سا گاؤں کانہہ پور تھا، اتنی خلقت کہاں سے آگئی کہ شہر کے بخئے اُدھڑے جا رہے ہیں۔ غالباً ہوا یہ کہ یہاں کپڑے چمڑے اور اوزار سازی کی صنعت نے اتنا فروغ پایا کہ دور دور تک کی آبادی اُمڈ کر یہاں آگئی۔ اب کانپور یو پی کا سب سے بڑا شہر اور شمالی ہندوستان کا جدید صنعتی مرکز ہے۔ یہاں کی خاک میں خشک چمڑا اور ہوا میں سیاہ دھواں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ مشہور ہے کہ اگر آپ گرمیوں میں کھلے آسمان کے نیچے سفید چادر بچھا کر سو جائیں تو صبح تک چادر کا صرف اتنا حصہ سفید رہتا ہے جس پر آپ لیٹے ہیں۔ باقی فضا کی کثافت سے کالا ہو جاتا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جس شہر میں اتنی بھاری صنعت ہو وہاں چاہے پیسے کی ریل پیل نہ ہو مگر ظاہری خوش حالی تو ہو۔ لیکن جیسی مفلسی اور تنگ دستی کانپور کے حصے میں آئی ہے اُس سے خدا ہر نگر ہر بستی کو محفوظ رکھے۔

شمالی ہندوستان کے بہت سے پرانے شہروں کی طرح کانپور میں بھی یہی منظر دیکھنے میں آیا کہ شہر کا قدیم حصہ کھنڈر بنا ہوا ہے اور شہر کے گرد نئی بستیاں، نئی آبادیاں ابھر رہی ہیں۔ پرانے علاقوں میں لوگوں نے کیسے کیسے جتن کر کے پرانی دیواروں اور چھتوں کو گرنے سے روک رکھا ہے اور نئی آبادیوں میں کوٹھیاں اور بنگلے بن رہے ہیں، کاریں کھڑی ہیں اور اسکوٹر چل رہے ہیں۔

قدیم محلوں میں لوگ جینے کی جدوجہد میں لگے ہیں اور جہاں گھر کا ایک شخص کماتا تھا اور پورا گھر کھاتا تھا، وہاں اب چھوٹے بڑے، عورتیں مرد، سبھی کھانے کمانے کی فکر میں لگے ہیں۔ سفید پوشی برائے نام رہ گئی ہے اور تعلیم نے جہالت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے

ہیں کیونکہ جس نے تعلیم پائی اُس نے اُس کا پھل نہیں پایا۔ گلیوں میں غلاظت کے انبار لگے ہیں۔ زمین کے نیچے پڑے ہوئے صاف پانی اور گندے پانی کے پائپ آپس میں اس طرح گڈ مڈ ہو گئے ہیں کہ یرقان کے مارے ہوئے مریض اپنی زبان سے نہیں، اپنی ہلدی جیسی رنگت سے بتا رہے ہیں کہ غلاظت پینے کے پانی کی ٹونٹی کے راستے لوٹ آئی ہے۔

ٹپکا پور، کانپور کا بہت قدیم علاقہ ہے۔ یہاں کے کھاتے پیتے گھرانے، یہاں کے شرفا، یہاں کے اعلیٰ خاندان، علماً، وکیل، حکیم، اساتذہ اور رہنما آج تک یاد کئے جاتے ہیں۔ اسی ٹپکا پور میں گندی نالیاں پھلانگتا ہوا میں ایک پرانے خستہ مکان کی بیٹھک میں داخل ہوا جس میں کوئی مشین چل رہی تھی۔ ایک بزرگ کام کر رہے تھے اور کاپیوں اور رجسٹروں کے سادہ کاغذ پر سطریں چھاپ رہے تھے، وہی کام جو پرانے زمانے میں مسطری کہلاتا تھا۔ میں سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اپنا تعارف کرایا، اُن کا نام پوچھا۔ وہ یونس علی صاحب تھے۔ انہوں ہی نے بتایا کہ یہ ٹپکا پور کا علاقہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں جب سے اس علاقے میں آیا ہوں میں دیکھ رہا ہوں کہ مختلف گھروں میں یا تو دستکاریاں یا جلد سازی یا رولنگ کا کام ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کام آپ کب سے کر رہے ہیں؟

" یہ ہمارا آبائی کام ہے، ہمارے والد صاحب کے وقت سے "

میں نے پوچھا " آپ کے اس رولنگ کے کام میں آپ کے ساتھ مددگار کتنے ہیں؟"

انہوں نے بتایا " اس میں کم سے کم چار آدمی لگتے ہیں "

میں نے پوچھا " تو کیا آپ اجرت دے کر باہر کے لوگ رکھتے ہیں یا آپ کے اپنے گھر کے لوگ آپ کی مدد کرتے ہیں؟ "

یونس علی صاحب بولے " جیسا موقع ہو۔ اگر گھر کے لوگ نہیں مل پاتے ہیں تو پھر اُجرت دے کر رکھنا پڑتا ہے، ویسے زیادہ تر گھر ہی کے لوگ کام کرتے ہیں، مثلاً بائنڈنگ وغیرہ سب گھر ہی کے لوگ کو آپریٹو کر کے اس کو کر لیتے ہیں تو آپس میں سب۔۔"

میں نے کہا" گھر کے لوگوں سے آپ کی مراد باپ اور بیٹے اور بھائی وغیرہ ہیں یا گھر کی عورتیں بھی اس میں شامل ہوتی ہیں ؟"

انہوں نے کہا" نہیں - گھر کے مرد اس میں شامل ہوتے ہیں - اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ فولڈنگ، سلائی اور بائنڈنگ کے کام میں مدد دیتی ہیں - ہاں یقیناً اس میں گھر کی عورتیں شامل ہوتی ہیں"

اب میں نے یونس علی صاحب سے پوچھا کہ آپ ٹپکا پور کے پرانے باشندے ہیں تو آپ نے اس عرصے میں کیا دیکھا، اقتصادی طور پر یہاں کے لوگوں کی حالت بہتر ہوئی ہے یا خراب ہوئی ہے ؟ -

انہوں نے کہا" جب سے گھر کے سب لوگ مل جل کر کام کرنے لگے ہیں تب سے حالت بہتر ہوئی ہے - کیونکہ پہلے گھر کے ایک شخص سے پورے گھر کا نظام چلتا تھا - ایک کماتا تھا اور سب کھاتے تھے - اب یہ ہے کہ سب کو تعاون دینا پڑتا ہے، سب کو کرنا پڑتا ہے - اس میں مجبوری بھی شامل ہے لیکن اس سے یہ ہے کہ ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو جاتی ہے - اور پریشانیوں سے بچ جاتے ہیں"

لوگوں کی حالت اور گھروں کی حالت دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ذمے دار کون ہے ؟ حالات ؟ یا خود یہ لوگ ؟

محمودہ اشرف صاحبہ ان ہستیوں میں سے ایک ہیں جن سے قدرت بڑے کام لیتی ہے - کانپور کے غریبوں کو سہارا دینے اور اوپر اٹھانے کی خاطر جن کے دل درد کی دولت سے سرشار ہیں، محمودہ اشرف ان ہی میں شامل ہیں - ان سے مفصل باتیں آگے چل کر ہوں گی - اُس روز میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ ٹپکا پور، یہ چمن گنج، یہ لاکھوں کی آبادی کے علاقے بدحالی کا شکار کیوں ہیں ؟ کیا یہاں بڑی اقتصادی دشواریاں ہیں؟

انہوں نے کہا:

"اقتصادی دشواریاں تو ہیں اس میں تو دو رائیں نہیں۔ مگر یہ کہ کچھ لوگوں کی ذہنیت بھی ایسی بن گئی ہے کہ اگر وہ کما بھی رہے ہیں تو وہ اپنے حالات کو بہتر بنانا نہیں چاہتے۔ بس جیسے رہ رہے ہیں ویسے ہی رہتے چلے آرہے ہیں حالانکہ حکومت کا اور عالمی بینک کا قرضہ بھی ملا ہے گندے علاقوں میں صفائی ہو رہی ہے کافی صفائی ہو چکی ہے اور کام جاری ہے مگر یہ کہ کچھ ذہنیت اس قسم کی بن گئی ہے کہ زندگی کے حالات کو بہتر نہیں بناتے۔"

مرزا محمود الحسن صاحب کانپور کے پرانے باشندے ہیں۔ گزرے ہوئے وقتوں کی تصویریں ابھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتیں۔ معاملات کو کروٹیں بدلتے ہوئے انہوں نے غور سے اور قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ پرانے کانپور اور آج کے کانپور کی زندگی میں کیا فرق آیا ہے؟۔ انہوں نے کہا:

"اُس میں نمایاں فرق دیکھئے سب سے پہلے یہ ہے کہ اُس وقت آبادی اتنی نہیں تھی کانپور کی۔ ۱۹۳۰ء میں کانپور کی آبادی تقریباً دو لاکھ تھی۔ دو لاکھ آدمیوں کے لئے شہری وسائل موجود تھے، اُن کی ضرورت بھر کے، واٹر سپلائی، الیکٹرک، ہر چیز اُن کی ضرورت سے زیادہ تھی چنانچہ وہ آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور آج وہ آبادی بڑھ کر میرے خیال میں چالیس لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ وسائل اتنے ہیں نہیں۔ لہٰذا پانی کی، بجلی کی، ان سب چیزوں کی بہت بڑی پرابلم سامنے ہے۔"

میں نے کہا" لیکن اب یہ ہے کہ چھوٹے پسماندہ علاقوں میں بھی گھر گھر کہیں دستکاری ہے، کہیں جلد بندی ہو رہی ہے، کہیں رولنگ اور کہیں کشیدہ کاری ہو رہی ہے۔ لوگ منہمک ہیں اپنے گھروں میں۔ کچھ نہ کچھ کام کر رہے ہیں جس میں خواتین بھی

شامل ہیں۔ تو آپ کا خیال کیا ہے۔ ان گھروں میں وسائل پہلے سے زیادہ نہیں؟"

مرزا محمود الحسن صاحب نے کہا "پہلے سے زیادہ وسائل ان کے آمدنی کے ذریعے بڑھ گئے ہیں۔ اور اگر یہ نہ کریں تو کھائیں کیا؟ سوال یہ ہے۔ پہلے ایک آدمی کام کرتا تھا دس کھاتے تھے۔ تو اب اس قدر شدت سے افراط زر میں جو اضافہ ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قیمتیں جو بڑھی ہیں تو اب ایک محدود آمدنی میں ایک آدمی کی کمائی میں کسی ایک فیملی کا گزر ہونا ذرا مشکل ہوگیا ہے۔ اس لئے آدمی مجبور ہے کہ اُس کا ہر بچہ کمانے کا ذریعہ پیدا کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام بچے ان پڑھ ہیں اور بالخصوص مسلمانوں میں تو یہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔"

یہ تھے کانپور کے ایک بزرگ اور یہ ہے کانپور کا ایک بچہ۔ نام ہے اس کا قائم رضا عمر یہی کوئی گیارہ بارہ برس۔ بوڑھی نانی کے ساتھ رہتا ہے۔ نانی بڑی کربلا میں سادات کی پرانی قبروں اور مسجد کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ کچھ بھلے لوگ آکر انہیں ماہانہ تنخواہ دے جاتے ہیں: ساٹھ روپے۔ چنانچہ ننھا قائم رضا ہر چند زمین کے اوپر ہے مگر حال شاید اُن سے بہتر نہیں جن کی مٹی کی ڈھیریوں کی نگرانی اس کی نانی کرتی ہیں۔ میں نے قائم رضا سے پوچھا، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک پوری نسل سے پوچھا "اسکول جاتے ہو؟"

"جی نہیں"

"پھر کیا کرتے ہو؟"

"کام سیکھتے ہیں"

"کیا کام سیکھتے ہو؟"

"اسکوٹر کا"

"کون سکھاتا ہے تمہیں یہ کام؟"

"مفضل عباس"

"دن میں کتنے گھنٹے ان کے پاس کام کرتے ہو؟"

"نو بجے جاتے ہیں، چار بجے چلے آتے ہیں۔"

"کتنا کام سیکھ لیا ہے تم نے؟"

"انجن ونجن کھول لیتے ہیں۔ صفائی، سروسنگ۔"

"کتنے پیسے ملتے ہیں تمہیں؟"

"ابھی دیتے ہی نہیں۔"

"کب دیں گے؟"

"جب دیں!"

"اور بھی لڑکے کام کرتے ہیں وہاں؟"

"بہت لڑکے کرتے ہیں۔"

"ان کو کتنے پیسے دیتے ہیں؟"

"جتنے دیں!"

"پانچ، دس، کتنے پیسے دیتے ہیں مہینے کے؟"

"ایک کو تیس روپے دیتے ہیں۔"

"تمہیں کب ملنے شروع ہوں گے پیسے؟"

"جب دیں!"

یہ بچہ نوجوان ہو کر اکیسویں صدی میں داخل ہوگا، اس بچے کو بالکل نہیں معلوم کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔

"آگے چل کر کیا ہوگا؟" میں نے قائم رضا کی نانی سے پوچھا۔

"مولا آئیں گے۔ ہم لوگ انتظار میں ہیں کس وقت آئیں مولا۔"

حسرت کا شہر

یہ کانپور ہے۔ اتوار کی صبح ہے اور دریا پار سے آئی ہوئی سبزی بک رہی ہے۔ میری پشت پر نگر پالیکا یعنی بلدیہ کا بہت بڑا کتب خانہ ہے۔ سامنے انگریزوں کے زمانے کی ہال روڈ اور اس کے ساتھ ساتھ پھول باغ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہلاکتوں کا حساب بیباق کیا گیا تھا تو یہیں کہیں درختوں پر کانپور کے باشندے سینکڑوں کی تعداد میں پھانسی پر ٹکائے جاتے تھے اور ان کی لاشیں کئی کئی دن جھولا کرتی تھیں۔ سنا ہے اب وہ درخت کاٹ دیئے گئے ہیں اور شاید ان کے ساتھ ہی اس شہر کا ماضی بھی اس سے کٹ گیا ہے۔ یہ جو نوجوان سبزی خریدنے آئے ہیں انہیں شاید خبر تک نہ ہو کہ یہاں کیسا جوالا مکھی پھٹا تھا اور نانا راؤ اور عظیم اللہ خاں نے سفید فام حکمرانوں سے کیسی ٹکر لی تھی۔ پہلے گورے حاکموں کا خون ایک دریا میں بہا تھا اور پھر کالے محکوموں کے خون سے کئی دریا بہائے گئے تھے۔

اس شہر کی نئی نسل کو کہاں معلوم ہو گا کہ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں کیسا معرکہ ہوا تھا۔ جب سڑک چوڑی کرنے کے لئے مچھلی بازار کی مسجد کا ایک حصّہ گرایا جا رہا تھا تو اس شہر والوں نے فرنگی سنگینوں اور گولیوں کی باڑھ کو کس طرح اپنے سینوں پر لیا تھا اور کس طرح بچوں اور نوجوانوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔

یہ مولانا عبدالرزاق اور منشی رحمت اللہ رعد کا شہر ہے جنہوں نے اہل کانپور کی پیشانی سے جہالت کا داغ دھویا۔ منشی صاحب کے نامی پریس کو اور ان کی انجمن اخوان الصفا کو یہ شہر کیسے بھول سکتا ہے۔ یہیں مفتی عنایت احمد نے مدرسہ فیض عام کی بنیاد رکھی تھی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی اسی مدرسے کے صدر مدرس تھے، بعد میں یہی منصب مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا غلام یحییٰ اور مولانا احمد حسن کو ملا۔

یہ آزاد سبحانی، حسرت موہانی اور نثار احمد کانپوری کا شہر ہے جو کراچی کے مشہور مقدمہ بغاوت کے سرکردہ قیدی تھے۔ یہیں حسرت موہانی کے سودیشی اسٹور میں سب سے پہلے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی بنی تھی۔

مدرسہ فیض عام کے علاوہ مدرسہ جامع العلوم ٹپکا پور اور جامعہ الہیات نے صرف دماغوں ہی نہیں بلکہ دلوں کی تربیت کا بھی اہتمام کیا تھا۔ یہ چمڑے کے تاجر تھے، سامان بساط خانہ کے تاجر تھے۔ چھاپہ خانوں کے مالک تھے اور بانس اور لکڑی کے تاجر تھے جنہوں نے اسکول، کالج اور یتیم خانے قائم کرکے، قومی تحریکوں میں چندے دے کر اور غریبوں کی مدد کرکے کن بیاپور کو یوپی کا عظیم شہر بنا دیا۔ وہ کیسے فیاض، فراخ دل اور علم کے شیدائی حافظ محمد حلیم تھے جن کی رکھی ہوئی بنیاد پر آج حلیم مسلم کالج قائم ہے۔

پھر جب برا وقت پڑا تو یہ ساری روایتیں مٹنے لگیں۔ غریبوں سے ان کے سہارے چھن گئے۔ گرتی ہوئی عمارتوں میں جہالت کا بسیرا ہونے لگا اور وہ جرأتیں، وہ اعلیٰ ہمتیں وقت کی سختیوں تلے حوصلے ہارنے لگیں۔ لیکن اب یوں لگتا ہے کہ اُس راکھ سے وہی شرارے پھوٹنے لگے ہیں۔ اس شاخ پر وہی پتیاں نکلنے لگی ہیں اور ایک قافلہ جو تھک ہار کر بیٹھ رہا تھا، پھر اُٹھا ہے، پھر چل پڑا ہے اور قدرت نے اسے سہارا دے کر چلانے والے لوگ پھر سے پیدا کر دیئے ہیں۔

کانپور والوں کے اعلیٰ حوصلوں کا حال اُس روز مجھ پہ کُھلا۔ شہر میں ایک مذاکرہ تھا۔

عنوان تھا: جگر مراد آبادی اور قومی یک جہتی؛ مسز گاندھی کے قتل کے بعد اس شہر میں خدا جانے کتنے سکھ مارے جا چکے تھے۔ ان کی کتنی ہی جلی ہوئی دکانیں اس وقت تک سیاہ پڑی ہوئی تھیں۔ اور بحث کا موضوع تھا 'قومی ایکتا'۔

کوئی مہتا صاحب تقریر کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جھگڑے کی جڑ ووٹ ہے۔ کائستھ کائستھ کو ووٹ دیتا ہے اور برہمن برہمن کو۔ ووٹ کے طلب گار سیاست داں کا کام اسی نظام سے نکلتا ہے۔ پارلیمنٹ یا اسمبلی کی سیٹ کی خاطر وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ یہ ذات پات مٹ جائے، چنانچہ مہتا صاحب نے کہا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس ووٹ ہی کو مٹا دیا جائے۔

مہتا صاحب کی بات غلط سہی، مگر انہوں نے بھری بزم میں بے دھڑک کہہ دی۔ اس طرح اُس روز میں نے کانپور میں جمہوریت کے درخت پر پھل آتے دیکھے۔

مہتا صاحب کے بعد حلیم کالج کے پرنسپل عبدالحلیم صدیقی صاحب کی تقریر تھی۔ صاف گوئی کے معاملے میں وہ ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ کہنے لگے:

"میں یہ بات بڑے وثوق سے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ کتنے ہی سیمینار کر لیجئے، کتنے ہی اس سلسلے میں مشاعرے کر لیجئے، کتنا ہی لٹریچر فراہم کر لیجئے قومی ایکتا کا تعلق اُس درس گاہ سے ہے جو آپ کا گھر ہے جہاں سے آپ کی نشو و نما ہوتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کسی کے بھی والد یا والدہ نے بچپن میں کسی بچے کو یہ سکھایا تھا کہ تم نہ ہندو ہو نہ مسلمان، تم انسان ہو اور ساری زندگی انسانیت کا پرچار کرنا۔ باتیں تو بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور چھپتی ہیں لیکن چونکہ یہاں پڑھے لکھوں کا مجمع ہے، میں آپ سے یہ بات بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ قومی یک جہتی ایسا HOAX ہے، ایک ایسا نعرہ ہے ایک ایسی نہ ختم ہونے والی خواہش ہے کہ جس کو ہم اپنے سینے سے لگاتے لگاتے

ختم ہو جائیں گے اور قومی ایکتا اِس ملک میں نہیں ممکن ہو پائے گی۔"
تقریر ختم ہوئی تو صرف ایک شخص نے تالی بجائی۔ بہت سے چہروں پر خفگی کے رنگ آتے جاتے صاف نظر آ رہے تھے۔ مگر کسی نے اُٹھ کر کسی کے گریبان پر ہاتھ نہیں ڈالا۔

اب باری تھی جناب صدر کی اور صدر تھے نامور سکھ ادیب اور شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی۔ انہیں اس قسم کی تقریروں پر کوئی تبصرہ کرنا تھا اور تبصرہ بھی چہروں کی بدلتی ہوئی رنگتوں کے بیچ اور تازہ جلی ہوئی سکھوں کی دکانوں کے پچھواڑے! کنور صاحب نے اپنا مخصوص لب ولہجہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ بولے:

"مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ جس جس نے بھی جو کچھ کہا ہے اُس نے خلوصِ دل سے کہا ہے، کسی تخریبی نکتہ چینی کی نیت سے نہیں کہا، تعمیری نکتہ چینی کی نیت سے کہا اور تعمیری نکتہ چینی ہر ایک کاز کے لئے، ہر ایک مہم کے لئے واقعی بہت ضروری ہوتی ہے ورنہ انسان غلط سلط طریقے اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تو۔۔ اچھی ہی بات ہوئی۔ اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی بات ہوئی۔"

کنور مہندر سنگھ بیدی اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہندوستان میں اردو کے چراغ کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ کانپور کی سرزمین نے یُوں بھی اَن گنت دیئے جلائے جن کی کرنیں آج بھی غریب کی کُٹیا کو منور کئے ہوئے ہیں۔ حسرت موہانی پر یہ شہر صدیوں ناز کرے گا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ غریبوں کے دُکھ دور کرنے کا اُن کا مشن پھر سے جی اٹھا ہے اور چمن گنج کے علاقے میں خدا کے نیک بندوں نے حسرت موہانی کے نام پر غریبوں کیلئے اسپتال قائم کیا ہے۔

میں وہاں پہنچا۔ حسرت موہانی چیریٹیبل ہاسپٹل۔ پرانی سی، تاریک سی عمارت۔ مگر اندر

جا کر دیکھئے نور ہی نور بھرا ہوا۔ نیکیوں کا، محبتوں کا اور عبادتوں کا نور۔ بہت سے ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ رہے ہیں۔ بہت سا عملہ دکھیوں کو سنبھال رہا ہے۔ دوائیں دی جا رہی ہیں۔ انجکشن لگ رہے ہیں۔ آپریشن ہو رہے ہیں اور پریشان حال لوگوں کی ڈھارس بندھائی جا رہی ہے۔ اسپتال کے نگراں ڈاکٹر عزیز احمد تھے جنہیں اٹھارہ سال کی کامیاب پریکٹس کے بعد یہ خیال آیا کہ دنیا اپنی ہی ذات تک محدود نہیں، اس سے آگے بھی ہے۔ چنانچہ لاکھوں غریبوں کی بستی کے بیچوں بیچ یہ بے مثال اسپتال ایک مینار بن کر اٹھا۔ ڈاکٹر عزیز احمد بتا رہے تھے:

"اس محلے کے چاروں طرف قریب قریب دس لاکھ کی آبادی ہوگی۔ اس کے بیچ میں یہ اسپتال ہے اور یہ غریبوں کا علاقہ ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ یہاں رہتے ہیں اور ہر طبقے کے لوگ یہاں علاج کے لئے آتے ہیں۔ وہ صرف ایک روپے کا ٹکٹ بنوا کر دس دن تک مفت علاج کرا سکتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ روزانہ تقریباً کتنے مریض آتے ہوں گے؟۔ انہوں نے کہا "ہمارے ہاں اس وقت قریب ڈیڑھ پونے دو سو مریض صبح اور شام میں آتا ہے۔"

میں نے کہا کہ ظاہر ہے کہ اس علاج کا خرچہ ایک روپے سے تو پورا نہیں ہو سکتا اور آپ کو کافی وسائل کی، پیسے کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ وہ آپ کہاں سے لاتے ہیں؟۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا "ایسا ہے کہ ہماری یہ سوسائٹی ہے، ہر آدمی خواہ وہ کسی بھی قوم یا مذہب کا ہو وہ ایک سو روپے کا ممبر بنتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو ممبر بنایا جاتا ہے اور جو ہمارے ہاں کے خوشحال لوگ ہیں اور جو کاروباری طبقہ ہے، یہ ہمارے اسپتال میں آتے ہیں۔ آنے کے بعد کوئی دو ہزار روپے کوئی پانچ ہزار روپے کوئی آٹھ ہزار روپے عطیہ دے جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ آپ دوا منگا لیجئے گا یا جو بھی ادویات کی

ضرورت ہو یا اوزاروں کی ضرورت ہو وہ منگا لیجئے گا۔"

ڈاکٹر عزیز احمد نے مجھے اپنی سوسائٹی کی صدر محمودہ اشرف صاحبہ کے بارے میں بتایا اور پھر شہر میں ہر ایک ہی نے بتایا کہ وہ جو خدا کبھی کبھی کسی کے دل میں بڑی نیکی ڈال دیتا ہے، ویسی ہی ایک شخصیت محمودہ اشرف صاحبہ کی ہے۔ اُن کے ہونے سے ہزاروں بے سہاروں کو سہارا ملا ہوا ہے اور لاکھوں گھرانوں سے جہالت مٹی ہے اور علم کے چراغ جلے ہیں۔

میں پہنچا تو بیگم صاحبہ ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ دو پریشان حال حضرات انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کر رہے تھے۔ اور وہ دھیمے دھیمے لہجے میں انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ جب وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے تو میں نے محمودہ اشرف صاحبہ سے پوچھا کہ یہ دو حضرات شاید اپنا کوئی مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئے تھے؟ یہ کیا گفتگو ہو رہی تھی؟۔ انہوں نے بتایا:

"یہ گفتگو جو ابھی مجھ سے ہو رہی تھی اس کا قصہ یہ ہے کہ یہاں ایک ہڈرز اسکول ہے۔ پہلے اس کا معیار واقعی بہت اچھا تھا کیونکہ خود میرے بچوں نے اُسی اسکول میں تعلیم پایا۔ مگر اب حال میں کچھ ایسا ہوا ہے کہ آپ سن ہی رہے ہیں کہ اِن کے بچے کو صرف ایک رنچ ٹوٹنے پر ایسا مارا کہ بچے کی حالت خطرناک ہوگئی اور یہاں تک ہوا کہ اس کا میجر آپریشن ہوا۔ اس کی دس اِنچ کی آنت کاٹنا پڑی اور ابھی تک وہ اسپتال میں ہے اور اس کی حالت تشویشناک ہے۔ یہ جو میرے پاس آئے تھے اُس کے سرپرست تھے۔"

میں نے محمودہ اشرف صاحبہ سے پوچھا کہ یہ لوگ اپنا مسئلہ لے کر آپ کے پاس کیوں آئے تھے؟ انہوں نے کہا" میرے پاس مسئلہ لے کر یوں آئے تھے کہ میں یہاں کانپور میں زیادہ تر لوگوں کے سماجی مسئلے حل کرنے میں مدد دیتی ہوں۔ اور بچاؤں کے

لئے جو کچھ مجھ سے ہوتا ہے میں اِن کی مدد کرتی ہوں۔ ان کی رہنمائی کرتی ہوں جس طریقے سے بھی ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا کہ اور یہاں کی سرگرمیوں اور اداروں سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ -
انہوں نے کہا "یہاں کا جو مسلم یتیم خانہ ہے جو یو پی کا سب سے بڑا مسلم یتیم خانہ ہے اُس کی میں صدر ہوں۔ ہمارے ہاں تقریباً ایک سو بچے ہیں۔ وہاں لڑکیاں بھی ہیں، لڑکے الگ، لڑکیاں الگ رہتی ہیں، پردے کا پورا انتظام ہے۔ بچوں کے کھانے کا، تعلیم کا، سب کا بہت اعلیٰ انتظام ہے۔"

میں نے پوچھا کہ اس یتیم خانے کے اخراجات کون برداشت کرتا ہے؟ انہوں نے بتایا "اخراجات ایسے ہیں کہ عطیات اور زکوٰۃ جو آتی ہے اور جو کرایہ آتا ہے اس سے سارے خرچ پورے ہوتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ اس کے علاوہ اَور آپ کیا کر رہی ہیں؟ - محمودہ اشرف صاحبہ نے بتایا "اس کے علاوہ ہمارے ہاں ایک مسلم جوبلی گرلز کالج ہے اس کی میں منیجر ہوں۔ یہ ادارہ درحقیقت یہاں کی جو مسلم ایسوسی ایشن ہے، جو چمڑے والوں کی تنظیم ہے، وہ لوگ ان اداروں کو چلاتے ہیں۔ تو اس میں لڑکیوں کا جو کالج ہے اس کو میں دیکھتی ہوں۔ یہ لوگ پرائمری اسکول بھی چلا رہے ہیں۔ حلیم ڈگری کالج کا جو طالبات کا سیکشن ہے وہ بھی میں دیکھتی ہوں۔ جوبلی کالج میں قریباً اٹھارہ سو طالبات ہیں، پردہ نشین لڑکیاں ہیں۔"

میں نے کہا غریب اور نادار بچوں کی تعلیم کا کیا بندوبست ہے؟ انہوں نے کہا "غریب بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام ہے کہ جوبلی کے اندر ہی ہم لوگ مستحق بچوں کو کافی وظیفے دیتے ہیں۔ یہ مسلم ایسوسی ایشن ہی اُن کے تعلیمی اخراجات برداشت کرتی ہے۔"

محمودہ اشرف صاحبہ کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ کانپور کے چمڑے کے تاجر اپنی ایک سو برس کی روایت کے مطابق آج بھی غریبوں کو اٹھا کر اونچا مقام دلانے میں

اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چل کر ان تاجروں سے بھی ملا جائے اور دیکھا جائے کہ اس نیکی کا انہیں کیا اجر مل رہا ہے، ان کی چمڑے کی صنعت کس طرح پھل پھول رہی ہے۔ چنانچہ کانپور کی ایک ٹینری میں اقبال احمد صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے بتایا کہ سو سے زیادہ ٹینریوں میں پانچ سے سات ہزار تک افراد کو روزگار ملا ہوا ہے اور بھینس کا بہترین چمڑا تیار ہو رہا ہے جس کا ساٹھ فیصد حصہ ملک سے باہر جاتا ہے۔

مگر میرے ایک سوال نے بات کا رُخ موڑ دیا۔ میں نے اقبال احمد صاحب سے پوچھا کہ کانپور میں چمڑے کی صنعت کا مستقبل کیسا دکھائی دیتا ہے؟ انہوں نے کہا:

"چمڑے کی صنعت کے فروغ کے امکان تو اب آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے ہیں، چونکہ اس میں زیادہ تر لوگ تیار شدہ مال میں اور چمڑے سے مختلف چیزیں بنانے میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں، اس لئے کہ ان کو حکومت سے بونس ملتا ہے اور دوسری سہولتیں ملتی ہیں، لوگوں کا رجحان زیادہ تر اُس طرف ہو گیا ہے۔ چمڑے کی دباغت اور اُس کی برآمد سے اب اتنی دلچسپی نہیں رہی۔ لوگ زیادہ تر گڈز ہی کے چکر میں رہتے ہیں کہ یہاں سے گڈز مینوفیکچر کر کے ایکسپورٹ کئے جائیں۔"

یہ شاید بالکل سچ ہے کہ سادہ چمڑے کی بجائے اب چمڑے کی مصنوعات تیار کرنے کا زمانہ آ گیا ہے اور چمڑے سے مختلف چیزیں بنانے کا کاروبار اتنی ترقی کر رہا ہے کہ میں ایک صنعت کار خاتون سے ملا جو اس ترقی پر خود حیران تھیں اور یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ خاص طور پر ان کی اپنی صنعت اتنی زبردست ترقی کیوں کر رہی ہے اور کس کے لئے کر رہی ہے۔ اُن خاتون کا نام ہے صابرہ نسرین صدیقی۔ پھول والی گلی میں ان کا چمڑے کا کاروبار ہے اور میں ان سے یہ پوچھ کر دنگ رہ گیا کہ آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟

انہوں نے کہا:

"کاروبار تو ماشاء اللہ بہت عروج پر ہے لیکن شروع میں ذرا دقتیں ہوئی تھیں۔"

میں نے پوچھا "کس کا۔ کس چیز کا کاروبار ہے؟"

بولیں "کاروبار میرا ہنٹر کا ہے۔ لیدر کی ویسے تو دکان ہے لیکن اب میں جو ہوں، ہنٹر بنواتی ہوں۔"

میں نے وضاحت چاہی "یعنی وہ جسے چابک یا کوڑے کہا جاتا تھا وہ آپ چمڑے کے کوڑے بنواتی ہیں؟"

صابرہ نسرین صدیقی نے تصدیق کی تو میں نے اگلا سوال کیا "پھر یہ ہنٹر کہاں جاتے ہیں؟"

انہوں نے کہا "وہ جاتے ہیں غیر ملکوں کو لیکن ہم سپلائی کرتے ہیں مقامی پارٹیوں کو۔ کوئی پارٹی دہلی میں ہے، کوئی مراد آباد میں۔ وہ ہمیں آرڈر دیتے ہیں ہم انہیں مال بھیجتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر یہ پارٹیاں ان ہنٹروں کو سمندر پار بھیجتی ہوں گی۔"

"جی ہاں۔ وہ لوگ ہنٹر ایکسپورٹ کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "تو کتنے ہنٹر بناتی ہیں آپ۔ مثلاً مجھے بتائیے کہ سال بھر میں آپ کتنے ہنٹر بناتی ہیں؟" اب صابرہ نسرین صدیقی صاحبہ نے بتایا "ہمارے تو سمجھئے کہ ہر مہینے دس ہزار، پندرہ ہزار، بیس ہزار جتنے تیار ہو جائیں، سب چلے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا تو اتنے سارے ہنٹر باہر کے ملکوں کو جاتے ہیں، باہر کے ملکوں میں ان ہنٹروں کا کیا مصرف ہے؟ لوگ ان کا کیا کرتے ہیں؟"

وہ بولیں "یہ تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتا ہے کہ لوگ کیوں منگواتے ہیں اور یہ

کیا کام آتے ہیں؟ - اتنا زیادہ اُس کی مانگ بڑھتی جارہی ہے کہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے - اب اس وقت مجھے جاجمؤ میں چار جگہ سے ہمارا مال بٹ رہا ہے - اور قریب ایک ہزار سے اوپر عورتیں ہیں جو یہ مال اپنے گھروں کو لے جاتی ہیں اور وہاں بیٹھ کر ہنٹر بناتی ہیں۔"

واقعی سوچنے کی بات تھی۔ ہر سال ہزارہا ہنٹر بن کر دنیا میں خدا جانے کہاں جارہے ہیں اور کس کام آرہے ہیں۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں اُس وقت تو مجھے بھی اندازہ نہ تھا، لیکن جب میں برطانیہ واپس آگیا اور کچھ عرصے بعد جنوبی افریقہ میں کچلے ہوئے کالوں نے سڑکوں پر نکل کر صدائے احتجاج بلند کی تو ٹیلیویژن پر دیکھا کہ جنوبی افریقہ کی سفید فام پولیس انہیں ڈنڈوں یا لاٹھیوں سے نہیں بلکہ چمڑے کے ہنٹروں سے مار مار کر خود ان کی چمڑی ادھیڑ رہی ہے۔

میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مظلوموں کی پیٹھ پر برسنے والے یہ ہنٹر کہیں پھول والی گلی کے بنے ہوئے تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہنٹر جاجمؤ سے چل کر جوہنسبرگ تک پہنچے ہیں۔

شاید ایسا نہ ہو۔

مگر شاید ایسا ہی ہو!

علم اور تاریخ کا سنگم

جرنیلی سڑک کا یہ سفر مجھے گنگا اور جمنا کے سنگم پر لے آیا ہے۔ یہ اکبر اعظم کا شہر الہ آباد ہے۔ یوپی کا پانچواں بڑا شہر اور ہندوستان کے سب سے پرانے شہروں میں سے ایک ہے۔ کبھی یہاں آریاؤں کی آبادی تھی۔ یہیں تو برہما نے اپنے گھوڑے کی قربانی دی تھی چنانچہ یہ پریاگ کہلایا۔ یعنی قربانی کا مقام۔ ایسا مقدس اور برکتوں والا مقام کہ اگر برہمن کو اس جگہ دکشنا دی جائے تو اس کا ثواب ہزار گنا ہوتا ہے۔ یہیں اماوس کی وہ شبھ گھڑی آتی ہے کہ اُس گھڑی گنگا جل میں اشنان کر لیا جائے تو سارے پاپ دُھل جاتے ہیں۔ اُسی گھڑی اپنے گناہ دریا میں بہانے کے لئے لاکھوں کا مجمع گنگا کی طرف دوڑا تھا تو اِسی جگہ تین چار سو آدمی پیروں تلے روندے گئے تھے۔

میں سست رفتار سائیکل رکشا پر بیٹھ کر پہنچا۔ رکشا والا بلا کا قیافہ شناس نکلا۔ پاپی جان کر مجھے سیدھا ہنومان جی کے مندر لے گیا اور اس کے دروازے پر مجھے اتارتے ہوئے بولا۔ "اصلی ہنومان جی یہی ہیں"۔ اگلے ہی لمحے میں یاتریوں کے ریلے میں بے بسی سے تیرتا ہوا مندر کے اندر جا پہنچا۔ بہت بڑی عمارت ہے جس کے درمیان اتنا ہی بڑا حوض سا ہے جس میں ہنومان جی کی مورتی لیٹی ہوئی ہے۔ چاروں طرف کٹہرا ہے۔ یاتری اسی طرف چلے آرہے تھے۔ ہنومان جی پر پھول برسا رہے تھے اور گنگا جل چھڑک رہے تھے۔ اتنی بڑی

مورتی گیندے کے پھولوں میں چھپ گئی تھی۔ عقیدت نے پیشانیوں پر نور پھیلا دیا تھا۔ صدقِ دل سے اس مورتی پر نگاہ کرنے والوں کی آنکھوں سے اعتقاد کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ لوگوں نے ہاتھ جوڑ لئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہے تھے۔ کہیں کوئی مذہبی گیت گا رہا تھا۔ آتے جاتے یاتری گھنٹہ بجاتے جا رہے تھے اور گنگا جل میں شرابور گیندے کے پھولوں تلے چھپے ہوئے ہنومان جی کی نگاہیں مندر کی چھت کو تکے جا رہی تھیں۔

اس سے پہلے میں اکبر کے قلعے کے نیچے تہ خانوں میں پریاگ کے اس تاریخی مندر میں تھا جس میں زمین دوز راہ داریاں چلی جاتی ہیں اور نیم تاریک راستوں میں طرح طرح کی مورتیاں کھڑی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ڈر سا لگا، شاید میرا عقیدہ مختلف ہوتا تو انہی کو دیکھ کر احترام سے میری نگاہیں جھک جاتیں۔ اس تہ خانے جیسے مندر کی سرنگیں بالآخر وسطی ہال میں پہنچتی ہیں جہاں شیولنگم ایستادہ ہے۔

میں تو خیر وہاں پہنچ گیا مگر میرا سائیکل رکشا والا ہراساں تھا کیونکہ یاتریوں کے جوتوں کی رکھوالی کرنے والی گیارہ برس کی کالی کلوٹی لڑکی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہی تھی " بابا، یہ دیکھو رکشے والا اندر آگیا ہے۔ اسے نکالو" اور رکشے والا خوشامد کر رہا تھا " ارے جانے دے میّا جانے دے" اور لڑکی چلّائے جا رہی تھی " بابا، یہ دیکھو رکشے والا آگیا مندر میں "

اس خوف سے کہ اگر کہیں میرا حال کھل گیا تو اللہ جانے کیا ہو، مندر کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں اور لپک کر باہر آگیا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ اکبر کے قلعے سے تو یہ مندر اچھا کہ جیسے بھی بنا دیکھ تو لیا۔ قلعے میں داخلے کی اجازت نہیں۔ اسی قلعے کے اندر اشوک کا وہ ۳۵ فٹ اونچا مینار کھڑا ہے جسے غالباً فیروز شاہ تغلق یا شاید اکبر کسمبھی سے الہ آباد لایا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں یہ زمین پر لیٹا ہوا ملا تھا اور اسے دوبارہ کھڑا کیا گیا تھا۔ اسی مینار پر

اشوک کی تاریخی تحریریں ہیں جو حضرت عیسیٰ سے ڈھائی سو سال پہلے لکھی گئی تھیں۔ پھر جو حاکم آتے رہے، اس پر اپنے نام کندہ کراتے رہے۔ بعد کی تحریریں فارسی میں ہیں۔ اُس وقت مینار زمین پر پڑا تھا، اُسی حالت میں کھودی گئی ہیں۔

قلعے کے اندر فوج رہتی ہے، مجھے خبر نہیں تھی اور میں اپنا تھیلا اٹھائے اندر چلا جا رہا تھا۔ کچھ ڈر سا لگا تو راستے ہی سے لوٹ آیا ورنہ پکڑا جاتا۔ البتہ اس کا یہ فائدہ ہوتا کہ قلعہ اندر سے دیکھنے کو مل جاتا۔ سنتے ہیں کہ وہاں چونسٹھ ستونوں کی ایسی شاندار عمارت ہے کہ فرگوسن کے بقول ایسی آرائشی اور دیدہ زیب طرز کی عمارت شاید ہی کہیں ہو۔

اب وہاں اسلحہ خانہ ہے۔

کاش میں قلعے کی بلند فصیل پر چڑھ کر گھاٹ کا وہ منظر دیکھ سکتا جہاں شمال کی طرف سے ڈیڑھ میل چوڑی گنگا بہتی آتی ہے اور مغرب کی جانب سے آدھ میل چوڑی جمنا اس سے ملتی ہے۔ گنگا کا پانی اُتھلا، گدلا اور تیز ہے۔ جمنا کی تہ گہری اور پانی نیلگوں ہے۔

یہیں کہیں سے اکبر کو دریا دو مرتبہ پار کرنا پڑا تھا تو اُسے احساس ہوا تھا کہ اس جگہ کی فوجی اہمیت بہت ہے چنانچہ اُس نے قلعہ بنوایا اور وہ شہر بسایا جو اس وقت الہ باس کہلاتا تھا۔ یہیں اکبر کے بیٹے جہانگیر نے باپ کے خلاف بغاوت کی، یہیں جہانگیر کے بیٹے خسرو کی قبر ہے جس نے باپ کے خلاف بغاوت کا علَم بلند کیا۔

تاریخوں پر نگاہ کی جائے تو عجب تاریخ ہے الہ آباد کی۔ ۱۷۳۹ء میں اس پر مرہٹوں نے قبضہ کیا۔ ۱۷۵۰ء میں فرخ آباد کے پٹھانوں نے اُسے لوٹا۔ ۱۷۶۴ء میں برطانوی فوج شاہ عالم کو بکسر میں شکست دے کر الہ آباد پہنچی۔ ۱۷۶۵ء میں یہیں لارڈ کلائیو نے شاہ عالم سے ملاقات کی اور وہ معاہدہ ہوا جس نے ہندوستان کی تاریخ بدل دی اور جس کے تحت بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو مل گئی۔ ۱۸۰۱ء میں اودھ کے نواب وزیر سعادت علی خاں نے اُٹھا کر پورا الہ آباد انگریزوں کو سونپ دیا۔ ۱۸۵۷ء میں اس شہر والے

تو چھپکے رہے البتہ انگریزوں کو لکھنؤ والوں کے نرغے سے چھڑانے کے لئے ۲۵ دسمبر کو کمک یہیں سے روانہ کی گئی۔ ۱۸۵۸ء میں لارڈ کیننگ کا مشہور دربار الہ آباد میں ہوا جس میں ملکہ وکٹوریا کا یہ فرمان پڑھ کر سنایا گیا کہ آج سے ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کی نہیں بلکہ تاج برطانیہ کی ملکیت ہے۔ پھر ۱۸۸۵ء میں پہلی انڈین نیشنل کانگریس یہیں ہوئی جس کی صدارت آئی سی ایس افسر ایلن ہیوم نے کی تھی اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی راہ میں ایک اور قدم اُٹھایا گیا تھا۔

اُس الہ آباد شہر کا، اس کے لوگوں کا اور اس کی روایتوں اور قدروں کا حال جاننے کے لئے میں نے قدیم شہر میں صحت بہادر صاحب کو ڈھونڈ نکالا۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے وکالت کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اب اسّی نوّے کے درمیان سن تھا مگر اب تک کامیاب وکالت کر رہے تھے۔ خود عدالت میں نہیں جاتے، لوگ دور دور سے چل کر آ رہے تھے اور ان سے قانونی مشورے لے رہے تھے۔

نہایت شفیق اور محبت کرنے والے بزرگ، سوچنے سمجھنے کا انداز سُلجھا ہوا، زبان بالکل صاف، اُردو ایسی نکھری ہوئی کہ کانوں میں رس گھولے۔ الہ آباد کی قریب قریب ایک صدی دیکھے ہوئے، اور الہ آباد بھی وہ جو تعلیم کا اور انصاف کا مرکز بنا رہا۔ صحت بہادر صاحب اپنے زمانے کی باتیں کر رہے تھے۔ اُس وقت نوجوانوں میں علم پانے کا جو اشتیاق تھا، اس کا حال سنا رہے تھے:

”الہ آباد ایک ایسا مقام رہا ہے کہ یہاں پر ہر جگہ کے جو طالب علم اچھے درجے میں کامیاب ہوا کرتے تھے، یعنی جو وظیفہ یاب ہوتے تھے، وہ یوپی بھر کے سب اکٹھا ہو کر الہ آباد ہی آتے تھے۔ اُن لوگوں کی خواہش رہتی تھی کہ سب اوّل درجے کے لڑکے ایک ہی جگہ پر آویں۔ مجھے اپنے ہی سال کا یاد ہے کہ میرے ساتھیوں میں ڈاکٹر امرناتھ جھا میرے کلاس فیلو تھے۔

رگھوپت سہائے فراق میرے ساتھ تھے۔ بیگ صاحب میرے کلاس فیلو تھے
علی امیر صاحب میرے ہم جماعت تھے۔ تو وہ سب لوگ کوشش کر کے
الہ آباد ہی کے کالج میں بھرتی ہوا کرتے تھے۔"

میں نے پوچھا "اچھا، اپنے زمانے کی سنائیے کہ جب آپ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو لڑکے کس جستجو اور کس لگن کے ساتھ پڑھتے تھے؟"

صحت بہادر صاحب نے کہا "میں جس زمانے میں اس پیشے میں آیا اُس وقت آپ کو دلچسپ بات یہ بتا دوں کہ دیوانی میں سید رضی الدین، سید حیدر مہدی، شیخ عبدالحق اور پنڈت لاڈلی پرشاد زُتشی اور ساتھ ہی ساتھ فوجداری میں مسٹر ہری موہن رائے، بابو درگا چرن سنگھ، مسٹر ٹبک کرشن نبرجی۔ شفیع اللہ خاں صاحب یہ سب لوگ بہت اونچے درجے کی وکالت کرتے تھے اور مقدمے کی تیاری اس قدر اچھی کرتے تھے کہ ہم لوگ جو جونیئرز تھے، دیکھ کر کے دنگ آجاتے تھے۔ تو اُس زمانے میں جب ہم نے اس کو شروع کیا، وکالت کو، تو اس وقت یہ جو سینئر لوگ تھے ان کے مقدمہ کرنے کے وقت میں ہم لوگ جا کر کے اٹینڈ کرتے تھے اور اجلاس میں سنتے تھے کہ کس طریقے سے یہ جرح کرتے ہیں، کس طریقے سے یہ سوالات پوچھتے ہیں کیسے یہ نالش ڈرافٹ کرتے ہیں، کیسے یہ جواب ڈرافٹ کرتے ہیں، اور اُس سے ہم فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔"

اب میں نے پوچھا کہ قدیم الہ آباد میں جرائم کی نوعیت کیا آج کے جرائم کی نوعیت سے مختلف ہوا کرتی تھی؟

اُن کا جواب بہت دلچسپ تھا "جہاں تک کہ جرائم کا سوال ہے، میرے شروع وکالت میں کہیں سال میں سیشن کے قتل کے ایک یا دو مقدمے آیا کرتے تھے۔ اور اُس روز یہ ہوتا تھا کہ جو سیشن جج کا کمرہ تھا وہ سرخ پردوں سے سجایا جاتا تھا اور سپاہی سامنے کھڑے رہتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت اہم چیز، بڑی ضروری چیز، کوئی بھاری مقدمہ یہاں

پر ہونے کے لئے جارہا ہے۔ اور اب تو ہمارے خیال میں حالت یہ ہو رہی ہے کہ الہ آباد میں بارہ بارہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ایڈیشنل سیشن جج ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا جب ان کے پاس قتل کا، ڈاکے کا یا سنگین جرموں کا کوئی مقدمہ نہ رہتا ہو۔"

میں نے پوچھا " اچھا یہ فرمایئے کہ آپ کے خیال میں زندگی میں، سماجی زندگی میں وہ کون سے عناصر ہیں، وہ کون سی نئی باتیں ہیں کہ جرائم بڑھ گئے ہیں اور شدت اختیار کر گئے ہیں؟ "

صحت بہادر صاحب کا جواب بظاہر سیدھا سادا تھا " جرائم کے بڑھنے کا ایک سبب صاف ہے جس کو ہر شخص بہت آسانی سے سمجھ لیتا ہے، وہ ہے آبادی کا بڑھنا۔ یہ چیز ہر طریقے سے نقصان دہ ہے ہمارے ملک کے لئے۔"

میں نے کہا " صحت بہادر جی یہ بتلایئے کہ جب آبادی کم تھی تو کیا آپ کا شہر الہ آباد پُرسکون تھا۔ کیا لوگ آرام کی زندگی گزارتے تھے؟ وہ دن آپ کو یاد ہیں؟ "

اِس مرتبہ ان کا جواب اَور دلچسپ نِکلا " آپ کچھ ہنسیں گے اگر میں بطور مثال بتاؤں۔ جب میں نے وکالت شروع کیا تو میں اپنی ماں کے ہاتھ میں تیس روپیہ ماہوار رکھ دیتا تھا اور اس تیس روپے ماہوار میں وہ اپنے چھ بیٹوں، دو بیٹیوں کی پرورش کرتی تھیں، سب کو پڑھاتی تھیں، کھاتی تھیں، گھر کا غلہ، گھی، دودھ، نمک، لکڑی، کوئلہ اتنے میں آتا تھا اور پورا ہو جاتا تھا۔ تو یہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ اب یہ حالت ہو گیا ہے کہ چند سال پہلے میں یہ دیکھتا تھا کہ میں اپنے ملازم کو صبح کے وقت سو روپیہ دیتا تھا اور شام کو وہ کہتا تھا کہ سب خرچ ہو گیا۔"

" اچھا یہ فرمایئے " میں نے حسبِ عادت اپنا سوال ' اچھا ' سے شروع کرتے ہوئے پوچھا " کہ اب تو نوعیت بدل گئی ہے۔ قدیم الہ آباد میں مختلف فرقے، مختلف طبقے، مختلف مذاہب یہ کس طرح رہتے تھے؟ "

وہ بولے ” اتنی سہولت اور محبت تھی کہ میں آپ سے اُس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ آپ کو ایک واقعہ بتا دوں۔ اس کو سنئے گا تو اُسی سے آپ کو اندازہ مل جائے گا۔ میرے والد کے ایک دوست تھے جن کا نام تھا تفضل حسین خاں، وہ بہت ہی ان کے پکے دوستوں میں تھے۔ تو ایک روز میری ماں اپنے مکان کے اندر ڈھولک بجا کر کے گانا گا رہی تھیں۔ تو ہمارے والد اُدھر سے آئے اور آکر کے یہ کہا ہماری ماں سے کہ ڈھولک بند کر دو، گانے بجانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماں نے کہا کیوں؟۔ کہنے لگے کہ تفضل حسین خاں باہر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ عشرے کا زمانہ ہے یہ دس روز تک محرم میں یہ لوگ ماتم کرتے ہیں اور تم گانا گاؤ گی تو ان کے دل کو تکلیف ہو گی۔ یہ سننا تھا کہ ہماری ماں نے گانا بند کر دیا۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ اتنی محبت تھی۔“

”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں صحت بہادر جی کہ آپ نے بہت ہی دلچسپ اور کار آمد گفتگو کی ہے، بہت بہت شکریہ آپ کا۔“

”میں بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا۔ آداب عرض!!“

اونچا نگر، نیچا نگر

پشاور سے اگر آپ جرنیلی سڑک پر کلکتے تک جائیں تو راہ میں زبان، ادب، روایت، پہناوا، رسم و رواج اور قدریں، سب کچھ بدلتا جاتا ہے مگر ایک چیز اس پندرہ سو میل لمبے راستے میں ہر جگہ موجود ہے۔ اور وہ ہے گنّے کا رس۔

سڑکوں کے کنارے، گلیوں کے نکڑ پر، پیڑ کی چھاؤں میں، لاری کے اڈّوں پر جگہ جگہ گنّے کا رس نکالا جا رہا ہے۔ پہلے اکہرا گنّا، پھر دوہرا گنّا، پھر چار تہوں، آٹھ تہوں اور بس چل جائے تو سولہ تہوں کے گنّے کا قطرہ قطرہ نچوڑا جا رہا ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ اس نئے زمانے کے کولہو کو بجلی کا موٹر چلا رہا ہے۔

گنّے کے ساتھ لیموں، ادرک کے ٹکڑے اور پودینے کی پتّیاں بھی پیلی جا رہی ہیں جس نے اس میں اور رس گھول دیا ہے مگر سب سے لذیذ رس الٰہ آباد کا تھا۔ اس میں شہد کی مکھیاں بھی بے دریغ پس رہی تھیں۔ رس پینے والا کوئی شخص شکایت یا احتجاج نہیں کر رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ رس نکالنے والوں نے مشہور کر دیا ہے اس قسم کا رس پینے سے سوئی ہوئی توانائیاں بیدار ہو جاتی ہیں۔

لوگ غٹا غٹ پی رہے تھے۔

میں بھی جب ایک کی بجائے تین گلاس پی چکا اور اپنی مونچھوں سے رس کا جھاگ

اپنے ہاتھ کی پشت پر پونچھ چکا تو شہر کے رسم ورواج کے مطابق فوراً ہی پان کھانے لپکا۔ جہاں گنّے کا رس ملتا ہے اُس کے قریب پان بھی ضرور ملتا ہے۔ جیسے جیسے بنارس قریب آتا جاتا ہے، پان نہ صرف بڑا ہوتا جاتا ہے بلکہ کئی کئی پتیوں کا ایک بیڑا بننے لگتا ہے۔ اس میں طرح طرح کے تمباکو، زردے اور قوام ڈالے جاتے ہیں۔ لوگ دیر تک پیک منہ میں جمع رکھتے ہیں اور بات کرتے ہیں تو منہ آسمان کی طرف اٹھا کر۔ اور پھر جو دیواروں پر گل بوٹے بنتے ہیں انہوں نے اکثر دیواروں کو گلزار بنا ڈالا ہے۔

کہتے ہیں کہ اسی الہ آباد کے ایک سپوت نے کہ جس کا نام سنجے گاندھی تھا، اپنی زندگی میں یہ طے کیا تھا کہ جس طرح جے پور گلابی شہر کہلاتا ہے، ہر بڑے شہر کا اپنا اپنا ایک رنگ مخصوص کر دیا جائے، اس کی تمام عمارتوں پر وہی رنگ پوتا جائے اور اس طرح ایک ایک رنگ ایک ایک شہر کی پہچان بنے۔ مثلاً کانپور کو ہرا شہر قرار دیا گیا تھا اور منادی کر دی گئی تھی کہ لوگ اپنی دیواروں پر ہرا رنگ پھیریں۔ اب تک وہاں ہر محلّے کی اکا دکا عمارتیں ہری نظر آتی ہیں۔ شہر الہ آباد کو باآسانی کتھئی شہر قرار دیا جا سکتا تھا۔ شہر میں اتنی منادی کرا دینا کافی تھا کہ آئندہ لوگ پان کی پیک ذرا اونچی تھوکیں۔

الہ آباد میں لڑکوں کے ایک کالج کی عمارت دیکھی۔ کبھی سفید رہی ہو گی۔ اب لڑکوں نے اس کے چپّے چپّے پر انتخابی نعرے لکھ دیئے ہیں۔ ایک بالشت جگہ ایسی نہیں کہ کسی نئے نعرے کا اضافہ کیا جا سکے۔ ذرا قریب جا کر دیکھا تو صدر اور جنرل سیکرٹری کے عہدوں کے اُمیدواروں نے کالج کے فرش پر بھی اپنے نام لکھوا دیئے تھے۔ غالب نے سچ کہا۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

الہ آباد ہمیشہ شمالی ہندوستان میں تعلیم کا بڑا مرکز رہا۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ

تعلیم کا بورڈ آج بھی ہے جو پورے یوپی میں ہر سال پندرہ بیس لاکھ طالب علموں کا امتحان لیتا ہے۔

مگر الہ آباد میں جو تعلیمی ادارہ دیکھنے کی جا ہے وہ الہ آباد یونیورسٹی کی عمارت ہے۔ اونچے گھنے درختوں میں گھری محرابوں، گنبدوں، میناروں اور جالیوں کی عمارتیں، لمبی راہ داریاں، بڑی بڑی غلام گردشیں، اونچے اونچے برآمدے اور اُن سے بھی اونچی چھتوں کے ٹھنڈے کمرے۔ جن دنوں میں وہاں پہنچا، یونیورسٹی کو قائم ہوئے اٹھانوے سال ہو چکے تھے اور صد سالہ تقریبات کی تیاریاں تھیں۔

آر پی مصرا نئے نئے وائس چانسلر ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چالیس سال سے بند پڑے ہوئے گھنٹہ گھر کا کلاک اتروا کر انجنیئرنگ کے شعبے کے لڑکوں سے مرمت کرایا اور اب جو اس کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو شہر کے بوڑھوں کو اپنی جوانیاں یاد آگئیں۔ صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں یونیورسٹی کی تمام عمارتوں کا پرانا رنگ کھرچ کر اُس پر نیا رنگ پوتنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب جو پرانا چونا کھرچا گیا تو ایک ایک انچ موٹی تہیں اتریں۔ مجھے یقین ہے کہ پھر جو نیا رنگ ہوا ہوگا تو انڈے جیسی عمارت نکلی ہوگی۔

وائس چانسلر مصرا صاحب کو میرے آنے کی خبر ہوئی تو وہیں کیمپس میں مجھے اپنے گھر بلا لیا۔ کھدر کا کرتا، سوتی پاجامہ اور عام سی چپل پہنے بیٹھے تھے اور مسائل لانے والوں کا ایسا تانتا بندھا ہوا تھا اور وہ اتنے انہماک سے ہر ایک کی بات سُن رہے تھے کہ دوپہر کے کھانے کی نوبت سہ پہر کو آئی۔ سادہ دال، ترکاری اور پوری کھانے کے دوران مصرا صاحب بتاتے رہے کہ دیہات کی حالت سدھارنا اُن کا بڑا مشن ہے۔ علم طبقات الارض یعنی جیولوجی کے ماہر ہیں۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی میں بھی دل لگتا ہے اور غریب علاقوں میں چھوٹی چھوٹی مقامی صنعتوں کو فروغ دینے کے قائل ہیں۔ ہر وائس چانسلر کی طرح ان کے

تقرر پر بھی کچھ لوگ ناخوش تھے۔

الہ آباد یونیورسٹی کا کتب خانہ حیرت انگیز ہے۔ اس میں کتابوں کا اتنا پرانا ذخیرہ جمع ہے کہ شاید ہی کہیں ہو۔ خصوصاً میور کالج کا اثاثہ وہاں آجانے سے نایاب ادب ہاتھ لگا ہے۔

اس یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ بہت پرانا ہے۔ ہندی اور اردو کے شعبے وہاں ایک ساتھ کھلے تھے۔ جن دنوں میں پہنچا، ہندی کے شعبے کی ڈائمنڈ جوبلی منائی جا رہی تھی، اردو کے شعبے کی اگر کہیں ایسی کوئی جوبلی منائی بھی گئی تو اُس کے ڈائمنڈ میں ایسی چمک دمک نہیں تھی۔ شعبۂ اردو کے بارے میں اس کے استاد پروفیسر عقیل رضوی نے بتایا:

"یہ شعبہ سب سے پہلے الہ آباد میں قائم ہوا۔ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔ اُس وقت ہندوستان میں یونیورسٹی کی سطح پر کہیں اَور اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اردو میں صورت حال پارٹیشن کے بعد تو خراب ہو گئی تھی، بہت تھوڑے سے طالب علم رہ گئے تھے لیکن اُردو میں آج جو صورتِ حال ہے وہ بہت ہی امید افزا ہے۔ اس لئے کہ پہلے ایم اے میں چار پانچ لڑکوں سے زیادہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ آج ہمارے پاس پچھلے سال کے ریکارڈ میں ایم اے سال اوّل میں ۱۰۲ داخلے تھے۔ اور ۵۰ سال آخر میں تھے۔"

تعلیم کی اس درس گاہ کے قریب ہی سیاست کی وہ درس گاہ بھی ہے جسے دنیا آنند بھون کے نام سے جانتی ہے اور جس کے دالانوں، برآمدوں اور کمروں میں ہندوستان کی تقدیر کے بارے میں نہ معلوم کتنے منصوبے بنے اور نہ جانے کتنے فیصلے ہوئے۔ یہ نہرو گھرانا اب قومی عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔ اس کے تاریخی لمحوں کی تصویریں دیواروں پر سجی ہیں اور تمام کمرے آج تک ویسے ہی آراستہ رکھے گئے ہیں جیسے موتی لال نہرو ابھی ذرا دیر پہلے گھر کے سب چھوٹوں بڑوں کو لے کر اور ٹم ٹم میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو

چلے گئے ہوں۔

سیاست کے معاملے میں الہ آباد کا مزاج ہمیشہ سب سے الگ رہا ہے۔ مثلاً مشہور اداکار امیتابھ بچن نے بمبئی کو چھوڑ کر الہ آباد سے پارلیمنٹ کا انتخاب لڑا اور وہ شہریوں سے ووٹ مانگنے آئے تو لوگوں نے ان کی بیوی جیا بھادُری کا نام لے کر کہا کہ جیا بھابی کو شادی کا تحفہ نہیں دے پائے تھے، وہ اب ہم ووٹ کی شکل میں دیں گے۔ امیتابھ بچن اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں سچ مچ کے آنسو آ گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ بس، بہت ہوئی بمبئی کی فلمی صنعت، اب میں الہ آباد میں رہوں گا اور جنتا کی سیوا کروں گا۔

جن دنوں میں الہ آباد پہنچا، لوگ گندے انڈے اور ٹماٹر لیے امیتابھ بچن کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ ان کا وعدہ فلمی کہانی کا ڈائیلاگ نکلا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ الہ آباد کی پرانی روایت ہے اور آج تک نہیں ٹوٹی کہ اس شہر کے باشندے اپنے ایم پی کی 'تواضع' ضرور کرتے ہیں۔

ایک صاحب کو دیکھا، ملک کی سیاست پر تقریر کرنے کی خواہش اتنی شدید ہوئی کہ انہوں نے سائیکل رکشا پر لاؤڈ اسپیکر رکھا اور سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ پُرجوش تقریر کر رہے تھے اور کہے جا رہے تھے: 'ووٹ ہٹاؤ، ووٹ مٹاؤ'۔ خدا جانے کیوں جمہوریت سے خفا تھے۔

شہر میں کبھی ایک بڑے سیاستدان کے بیٹے کی شادی ہوئی ہوگی، اس کی دھوم دھام اب تک تھی۔ لڑکی کے باپ نے ہر باراتی کو اکیاون اکیاون روپے اور ہر قریبی رشتے دار کو دو سو ایک روپے دیئے۔

مشہور ہے کہ الہ آباد میں ڈاکٹر اور ٹیچر دونوں ہاتھوں سے کما رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے پرائیویٹ نرسنگ ہوم اور ٹیچروں نے کوچنگ سنٹر اور ٹیوٹوریل کالج کھول لیے ہیں۔

بالکل دکانوں کی طرح۔ ایک دست شناس کے بارے میں سنا کہ انہوں نے لوگوں کے ہاتھ دیکھ دیکھ کر پامسٹری میں کمالات کے ایسے ایسے ہاتھ دکھائے ہیں، اور اتنی دولت کمائی ہے کہ خود ان کے اپنے ہاتھوں کی لکیریں حیران ہیں۔

مگر سب سے دلچسپ لکیر وہ ریلوے لائن ہے جس کے شمال میں سول لائنز کا علاقہ اور جنوب میں پرانا شہر آباد ہے۔ ایک طرف یوں لگتا ہے جیسے انگلستان کا کوئی شہر اور دوسری طرف تنگ گلیوں اور گنجان آبادی کی ایسی بستی جہاں اب پیر ٹکانے کو بھی جگہ نہیں۔ الہ آباد والے اپنے شہر کے ایک علاقے کو اونچا نگر اور دوسرے کو نیچا نگر کہتے ہیں۔

الہ آباد کی سول لائنز کا نام کبھی کیننگ ٹاؤن تھا۔ دو رویہ گھنے درختوں اور کوٹھی بنگلوں کے باغوں کے درمیان چوڑی چوڑی سڑکیں ایسی ہیں کہ الہ آباد کو اگر ہندوستان کا آکسفورڈ کہا جاتا تھا تو غلط نہ تھا۔

یہیں ہائی کورٹ ہے، تیرہویں صدی کے گوتھک طرز کا آل سینٹس کیتھیڈرل ہے، اطالوی طرز کا سینٹ جوزف کا گرجا گھر ہے۔ وہیں کلب ہے اور الفریڈ پارک ہے وہیں سنگ مرمر کا ملکہ وکٹوریا کا مجسمہ بڑی سی چھتری کے سائے میں بیٹھا تھا، اب کہیں دھوپ میں پڑا ہے۔

پھر سرکٹ ہاؤس ہے جس میں سردھنے کی بیگم سمرو کی تصویریں آویزاں رہا کرتی تھیں۔ وہیں میور کالج کی مسلم طرز کی عمارت ہے اور وہیں میو میموریل ہال ہے۔ یونیورسٹی کے سامنے ہولی ٹرینٹی چرچ ہے جس میں بغاوتِ ہند میں مارے جانے والوں کی یادگار ہے ظاہر ہے کہ انگریزوں کی!۔ اور یوپی کا سب سے بڑا ڈاک خانہ بھی اسی اونچے نگر میں ہے۔

میں نے عقیل رضوی صاحب سے پوچھا کہ الہ آباد اس اونچے نگر اور نیچے نگر میں

کب، کیسے اور کیوں تقسیم ہوا۔ وہ جو غریبوں کا علاقہ ہے اس کی یہ درگت کیوں بنی؟۔
انہوں نے کہا:

"اس کا سبب یہی ہے کہ جو شہر کا علاقہ ہے وہ اپنی تہذیبی سطح کے لحاظ سے منفرد اور الگ رہا۔ انگریزوں سے جو اختلافات ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئے تھے، انہوں نے اپنے کو الگ کر لیا تھا۔ ایک حصّہ جو اب کمپنی باغ کہلاتا ہے وہ سب مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو وہاں سے اجاڑ دیا گیا چنانچہ اس کے نشانات آج بھی ہیں، بیچ بیچ میں مسجدیں ہیں، مزار ہیں۔ تو ان لوگوں نے اپنے کو انگریزوں سے تقریباً الگ سا کر لیا، اور پھر انگریزوں نے ایک نیا شہر بسایا جو اسٹیشن کی دوسری طرف ہے جس کو آج سول لائنز کہتے ہیں۔ وہاں کی زندگی نسبتاً خاموش لیکن رواں دواں ضرور ہے۔ ہائی کورٹ ادھر بنا، یوپی کا سب سے بڑا ڈاک خانہ بنا اور کچہری بنی۔ یہ سب سہولتیں انگریزوں نے الگ کر لی تھیں۔"

الٰہ آباد تاریخ کی نگاہ میں ہندو دھرم کا بڑا ٹھکانا ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مسلم تصوّف کو بھی یہ سرزمین بہت راس آئی اور صوفیا نے عقیدوں کے بٹوارے مٹا کر یہاں یگانگت اور بھائی چارے کی لَو اونچی کی۔ عقیل رضوی صاحب بتا رہے تھے:

"یہاں پہ خانقاہیں اور دائرے بہت سے تھے۔ اور صوفیوں کے دائرے آج بھی قائم ہیں کسی نہ کسی شکل میں، جو بارہ کے قریب ہیں۔ ان میں خاص طریقے سے دائرہ شاہ اجمل، دائرہ شاہ محمدی، دائرہ شاہ علیم یہ بہت مشہور ہیں اور آج بھی ان کی اہمیت ہے۔ ان میں ایسے لوگ رہے ہیں جو صوفیوں کا مزاج بھی رکھتے تھے، اور خود صوفیا بھی تھے اُن میں۔ اور انہوں نے لکھنے پڑھنے کا بھی کام کیا وہ اسی نقطۂ نظر سے جسے ہم ہیومنزم کا، دردمندی کا نقطۂ نظر

کہہ سکتے ہیں - ایک مسئلہ یہ بھی رہا ہے کہ یہاں چونکہ مغلوں کے کیمپ کی سی زندگی تھی، اس لئے اس کے امکانات بھی ہوا کرتے تھے کہ آپس میں، ہندو مسلم نفاق کی بھی صورتیں پیدا ہو جاتی تھیں، جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں - اس کو دور کرنے کے لئے بھی ان دائروں نے اور صوفیائے کرام نے خاصا کام کیا۔"

یہ تھے پروفیسر عقیل رضوی -

پرانے الہ آباد میں جس نے خسرو باغ نہ دیکھا، کچھ نہ دیکھا - وہاں جہانگیر کا سرکش بیٹا خسرو، اس کی راجپوت ماں اور ایک بہن دفن ہے - وہیں خسرو کے دو بیٹے دفن ہیں - وہیں تاریخ کی یہ پہیلی دفن ہے کہ خسرو طبعی موت مرا تھا یا شہزادے کو باپ کے اشارے پر گلا گھونٹ کر مار اگیا تھا - اب املی کے بڑے بڑے درخت ان کی قبروں پر سایہ کئے ہوئے ہیں اور اس بہت بڑے باغ کی چاردیواری سے لگی لگی جرنیلی سڑک پر خلقت کا سمندر رواں ہے - یہ شیر شاہی سڑک اکثر شہروں کے باہر سے گزرتی ہے - لیکن الہ آباد کے بیچوں بیچ چلتی ہے - بہت تنگ - اوپر سے مغل دور کے اور بھی تنگ دروازے جن میں سے چند ابھی تک سلامت ہیں -

اس سڑک پر بیک وقت رکشا، سائیکل، یکہ، موٹر سائیکل، اسکوٹر، ٹرک، منی بس، ٹیمپو، ٹاڈور اور لاریاں چلتی ہیں - اس کے علاوہ دکانوں، گوداموں کا مال اِدھر اُدھر لانے لے جانے کے لئے ہاتھ سے دھکیلے جانے والے ٹھیلے چلتے ہیں اور سب سے بلند ہو کر اونٹ چلتے ہیں جو گاؤں دیہات سے بڑے بڑے تربوز، کدو اور پیٹھے لاد کر شہر لاتے ہیں - الہ آباد کی جرنیلی سڑک کے بارے میں عقیل رضوی صاحب نے دلچسپ باتیں بتائیں:

"الہ آباد میں اب تو خیر آبادیاں بڑھ گئی ہیں لیکن اصل سڑک وہیں سے شروع ہوتی تھی جو علاقہ اب کوٹھا پارچہ کہلاتا ہے جہاں پر لوہے کا ریلوے

کا پُل بنا ہوا ہے جس کو بہت سے لوگ ٹکر صاحب کا پُل کہتے ہیں اگرچہ وہاں کے لیفٹیننٹ گورنر ٹوکر نے اس کو بنوایا تھا، شاید اسی کا یہ بگڑا ہوا نام ہے۔ وہاں سے خلد آباد تک چلے آیئے تو دونوں طرف آبادیاں ہیں اور سڑک آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔

شیر شاہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ہر کوس دو کوس پر مسجدیں باؤلیاں اور سرائیں بنوائی تھیں۔ وہ صورتیں اب اتنی تو نہیں ہیں مگر اس کے آثار یا نشانات اب بھی موجود ہیں اور بڑی مسجدیں الہ آباد میں آج بھی اسی سڑک کے دونوں طرف ہیں۔ بہادر گنج میں ایک مسجد ہے، اس سے پھر تھوڑی دور چل کر ایک مسجد ہے۔ سب سے بڑی مسجد خود چوک میں ہے جو کوتوالی کے مخالف سمت میں بنی ہوئی ہے۔ پھر اس کے بعد خلد آباد جایئے تو پھر ایک بہت بڑی مسجد ہے جو خلد آباد کے پھاٹک کے قریب ہے خلد آباد کے قریب ہی وہ منڈی بھی ہے کہ جو مغلوں کو بھی سامان خورد و نوش فراہم کرتی تھی، یہ شیر شاہی دور میں بھی کرتی تھی۔ اور اس سڑک پر آپ چلتے جایئے پورے ضلع آباد میں سراتھو تک یہ صورتیں آپ کو قدم قدم پر ملیں گی۔"

اسی جرنیلی سڑک کے قریب، خسرو باغ سے ملی ہوئی اوپندر ناتھ اشک کی کوٹھی ہے دنیا کے اخباروں میں چھپا تھا کہ انہوں نے حالات سے تنگ آکر وہاں پرچون کی دکان کھول لی ہے۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ اخبار کبھی کبھی سچ بھی کہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے قافلے میں آگے آگے چلنے والے اس ضعیف افسانہ نگار نے خود اپنی زندگی کو افسانہ بنا دیا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت لاہور سے الہ آباد آکر انہوں نے اپنی کتابیں چھاپنی شروع کیں، اردو میں بھی اور ہندی میں بھی۔ ان سے یہ کتابیں پورے ملک کے کتب خانے خریدا کرتے تھے۔ مگر پھر حکومت نے نیا قاعدہ رائج کیا۔ کتب خانوں کے لئے کتابیں خریدنے

کا اختیار سرکاری افسروں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اس علاقے میں کسی کا بااختیار ہوجانا غضب ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوپندر ناتھ اشک کی کتابوں کی فروخت بند ہوگئی اور مالی ضرورت سے زیادہ احتجاج کا لہجہ اختیار کرنے کے لئے انہوں نے پرچون کی دکان کھول لی۔ اُس کا قصہ وہ خود سنا رہے تھے:

"اب میرے جیسے ادیب کی کتابیں نہیں جاتیں اور پچھلے دس پندرہ برسوں سے نہیں گئیں۔ لاکھوں کی سیل یوپی میں ہوتی، لاکھوں کی سیل مدھیہ پردیش میں، بہار میں، پنجاب میں، راجستھان میں، ہریانہ میں۔ میری کتاب کہیں نہیں گئی، تو میرا بزنس ٹھپ ہوگیا۔ تو سوال ہوا کہ کیا کروں؟ اب یہ ہے کہ میرے پاس بنگلہ ہے، برلب سڑک ہے اور یہ سڑک اب چلنے لگی ہے، تو یہ سوچا کہ دکان کون کھولے۔ میری بیوی تیار ہوگئی، حسبِ معمول اور کہا کہ میں کرتی ہوں۔ اب میں بھی شاعر ہوں، میرا لڑکا بھی شاعر ہے، تو دو شاعروں کا پیٹ پالنے کے لئے میری بیوی نے طے کیا کہ دکان کھول لے۔ اس لئے پرچون کی دکان، عابدی صاحب، کھولی ہے۔"

یہ تھے اوپندر ناتھ اشک۔ آزادی کے وقت وہ الہ آباد آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ البتہ ان کے دیکھتے دیکھتے شہر کا جو حال ہوا، اُن کے حساس دل کو اس کا دکھ ستاتا ہے۔ خسرو باغ کی چار دیواری کے سائے میں، اونٹوں کی گھنٹیوں کے پس منظر میں وہ دیر تک الہ آباد کی حالت زار پر اپنی ہندی نظم سناتے رہے۔ میں سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیسی عجیب بات ہے، ہر شہر والے سمجھتے ہیں کہ بس ان ہی کے شہر کی حالت تباہ ہے۔ مگر اب انہیں کون بتائے کہ ہر شہر کا حال ایک جیسا ہے۔ ایک الہ آباد ہی نہیں، ہر شہر اداس ہے۔ یہی دکھ اوپندر ناتھ اشک کا تھا:

یہ شہر اب بہت اُداس ہے

سڑکیں گھائل پڑی ہیں
پیڑ یتیم کھڑے ہیں
نالے گندھار ہے ہیں
ڈاک نہ وقت سے آتی ہے نہ جاتی ہے
ٹیلی فون ڈیڈ پڑے ہیں
چوری ہو یا ڈاکہ
وقت سے خبر نہیں پہنچ سکتی
لیکن بل ہمیشہ بڑھے چڑھے ہیں
نل اچانک بند ہو جاتے ہیں
بجلی یکلخت چلی جاتی ہے
تیس برسوں سے شہر میں کوئی نیا اسکول نہیں کھلا
طلباء کی بھیڑ
داخلے پر رشوت
نہ کوئی ڈھنگ سے پڑھتا ہے نہ پڑھاتا ہے
اسکول کالج ہمیشہ بند رہتے ہیں
جن قدروں کے باعث شہری شہری کہلاتے ہیں
جو سہولتیں سماج کو سماج بناتی ہیں
ویسا کچھ اب اس شہر میں نہیں ہے
یہ شہر اب بہت بہت اداس ہے ۔

کل کی صبح کے خواب

یہ بنارس ہے ۔ اور یہ صبح بنارس!

میں کشتی میں بیٹھا گھاٹ گھاٹ چلا جارہا ہوں ۔ سورج ابھی نہیں نکلا ہے آسمان، فضا، دریا، سب سرمئی رنگت کے ہیں۔ یہاں دریا کی شکل پہلی دوسری کے چاند جیسی ہے اور بائیں کنارے پر گھاٹ، مندر اور پرانی عمارتیں قطار اندر قطار چلی جارہی ہیں۔ دریا کے کنارے بڑے بڑے چبوترے، پانی میں اتری ہوئی ان گنت سیڑھیاں، اوپر اونچی اونچی عمارتیں جو سب کی سب تقریباً چار سو سال پرانی ہو رہی ہیں، خستہ حال ہیں اور گری پڑ رہی ہیں۔

دریا کے کنارے گنگا اشنان کرنے والوں کا ہجوم ہے جو نہاتے جارہے ہیں اور رام بھجن کرتے جارہے ہیں۔ مگر اب وہ پجاریوں کی ٹولیاں نہیں جو آنکھیں میچے بھجن گایا کرتی ہوں گی اور ہاتھ جوڑے اشلوک پڑھا کرتی ہوں گی۔ اب تو گھاٹ گھاٹ لاؤڈ اسپیکر لگے ہیں اور کہیں ٹیپ ریکارڈر چل رہے ہیں اور اس طرح وارانسی کی فضاؤں میں دھارمک گیت گھُل تو رہے ہیں مگر جدید ٹیکنولوجی کے ذریعے۔

وارانسی بنارس کا پرانا نام ہے۔ یہاں دو دریا آکر گنگا میں گرتے ہیں۔ ورونا اور آسی اسی سے وارانسی بنا۔ کہتے ہیں کہ بنارس دنیا کا سب سے پرانا شہر ہے۔ مہابھارت اور

زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔ بعد میں بنارس کا نام بدل کر محمود آباد رکھا گیا۔ وہ نام ایک دن نہ چلا۔ اب دوبارہ اس کا نام وارانسی رکھ دیا گیا ہے لیکن بس کنڈیکٹر سے لے کر پوسٹ ماسٹر تک سب اسے اب بھی بنارس کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ سے چھ سو سال پہلے بنارس نہایت اہم مقام تھا۔ ساکیا مُنی اپنا بدھ مت قائم کرنے کے لئے گیا سے یہیں آئے تھے۔ پھر محمود غزنوی کے نائب معزالدین محمد نے بنارس پر حملہ کیا۔ اس کے بعد قطب الدین غوری نے قبضہ کیا۔ پھر علاؤ الدین خلجی نے مندر ڈھائے اور مسجدیں بنوائیں۔ پھر مغلوں کے زوال تک بنارس پر مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ بالآخر یہ انگریزوں کے ہاتھ لگا۔ اب وہ بھی جا چکے ہیں۔ بنارس ایک بار پھر وارانسی ہو گیا ہے۔

یہاں گنگا میں قدم رکھتے ہی جو چیز سب سے الگ، مختلف اور نمایاں نظر آیا کرتی تھی وہ سامنے تمام گھاٹوں اور مندروں سے اونچی اورنگ زیب کی چھوٹی مسجد کے ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ اونچے دو مینار تھے۔ اب نہیں ہیں۔

چھوٹی مسجد اب بند پڑی ہے۔ میں نے جا کر دیکھنا چاہا تو میزبانوں نے مشورہ دیا کہ نہ جانا بہتر ہے۔ البتہ اورنگ زیب کی بڑی مسجد تک رسائی ممکن تھی۔ اس کے ۲۳۲ فٹ اونچے مینار صحیح سالم ہیں۔ اس کی دیواریں اور کہیں اور سے لا کر لگائے ہوئے بھوکور ستون سلامت ہیں۔ مسجد میں رونق ہے۔ جا نمازیں بچھی ہیں۔ قرآن اور رحل رکھے ہیں۔ نمازیوں کے لئے ٹوپیاں رکھی ہیں۔ باہر پولیس کا پہرا ہے۔

اس کے علاوہ گنجِ شہدا کی مسجد ہے، اڑھائی کنگورے کی مسجد ہے۔ تیس کھمبے کی درگاہ ہے اور عیدگاہ بھی ہے جس کے درمیان اشوک کی ایک لاٹ تھی۔ ۱۸۰۹ء کے فسادات میں اُسے مسلم مینار سمجھ کر ڈھا دیا گیا۔ ڈھائے جانے اور بنائے جانے میں بنارس کو یوں بھی بڑی شہرت حاصل رہی ہے۔

اس وقت ہماری کشتی شمشان گھاٹ کے قریب ہے۔ گنگا کے کنارے چتائیں جل رہی ہیں اور اپنی باری کے انتظار میں میتیں قطار میں رکھی ہیں۔ یہ لوگ جو یہاں مرے ہیں، یہیں جلے ہیں اور جن کی راکھ یہیں گنگا میں بہی ہے، سیدھے سورگ کو سدھاریں گے۔

راجا ہرلش چندر اپنے بال بچوں کو بیچ کر اور فقیری اختیار کر کے اس شمشان گھاٹ پر آ رہا تھا۔ کیسے کیسے قصے منسوب ہیں ان گھاٹوں سے۔ مثلاً مُنی کرنیکا گھاٹ ہے جس کے پیچھے تالاب ہے۔ اس جگہ پاروتی کے کان کا بالا کھو گیا تھا جسے ڈھونڈنے کیلئے مہادیو نے زمین میں بھالا مارا تھا تو یہ کُنڈ بن گیا تھا۔

یہیں تُلسی گھاٹ ہے جہاں مشہور شاعر تلسی داس رہتے تھے جنہوں نے ہندی میں رامائن لکھی تھی۔ ۱۶۲۳ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ کہتے ہیں کہ ان کے جوتے، تکیہ اور وہ کھڑاؤں اب تک محفوظ ہیں جنہیں پہن کر وہ گنگا کی سطح پر چلے تھے۔

جہاں تک نگاہ جاتی ہے، وہاں تک گھاٹ ہی جاتے ہیں۔ ہر گھاٹ پر اس کا نام بھی لکھا ہے مثلاً اسی گھاٹ۔ من مندر گھاٹ۔ جانکی، مان سرور اور سندھیا گھاٹ پنچ گنگا گھاٹ جس کے اوپر اورنگ زیب کی مسجد کے مینار نظر آتے تھے۔ ان کے علاوہ میر گھاٹ بھی ہے جہاں عموماً مسلمان غسل کیا کرتے تھے۔ اور سب سے مقدس گھاٹوں میں جل سائیں گھاٹ بھی ہے جہاں مردے جلائے جاتے ہیں اور جہاں بیویاں اپنے شوہروں کی میتوں کے ساتھ زندہ جل جایا کرتی تھیں۔ ستی کے پتھر یہاں اب تک موجود ہیں۔

صبح بنارس کے اس منظر میں ایک اور منظر اُبھر رہا ہے۔ وہ دور سے جو سفید سی شے پانی سے نکلی ہوئی نظر آ رہی تھی، قریب آ کر دیکھا ہے تو وہ گنگا میں سیر لئے جانے والے کسی مُردے کا اکڑا ہوا گھٹنا ہے جو پانی سے باہر نکلا ہوا ہے اور اُس پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ اپنی چونچ سے اُسے نوچ رہا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ نگاہیں پھیروں یا اُس کی قسمت پر رشک کروں جو یہاں سے سیدھا سورگ کو گیا ہوگا اور جیون کے دکھوں

سے نجات پاکر اب مرتیو کے سکھ بٹور رہا ہوگا۔

بنارس کی گنگا میں جیسے جیسے میری کشتی آگے بڑھ رہی ہے، میرا ذہن پیچھے لوٹ رہا ہے۔ وہ یہی گنگا تو ہے جہاں ایسی ہی گرمیوں میں رت جگے ہوتے تھے۔ رئیسوں کے بجرے سجائے جاتے تھے اور شب کے پہلے حصے میں یہ بجرے گھاٹوں سے روانہ ہوتے تھے۔ جیسے جیسے رات بھیگتی جاتی تھی، بجروں پر روشنیوں کے ہیولے بنتے جاتے تھے۔ پھر یہ بجرے منجدھار میں جاکر ٹھہر جاتے تھے اور پھر جو موسیقی کی تانیں اٹھتی تھیں تو کلس اور میناروں سے اونچی جاتی تھیں۔ کسی بجرے پر رسولن بائی کی مرکیاں دل کو لُبھا رہی ہیں اور کسی پر سدھیشوری اور بنارس والی بتّن کی گٹکریاں سحر گھول رہی ہیں۔ کہیں تو لن اور اشرفی والی مُنّی کی تانوں سے دریا گونج رہا ہے اور کسی بجرے پر بڑی موتی اور بدیا دھری کی پلٹوں سے ہوا میں موسیقی رقصاں ہے۔ پھر جب صبح کی کوری روشنی افق کی دیوار کے اوپر سے دریا کے آنگن میں جھانکتی تو بھیروی چھڑ جاتی اور نئی نویلی کرنوں کے ساتھ ساتھ یہ بجرے گھاٹوں کو واپس آتے۔

اُس صبح کے سارے خواب آج کی صبح ٹوٹ گئے۔

میری کشتی گھاٹ کو لوٹ رہی ہے اور فضا میں بھیروی کی تانیں نہیں، لاؤڈ اسپیکر پر ٹیپ ریکارڈ کی اونچی صدائیں ہیں۔ کلس خاموش کھڑے ہیں۔ مینار کبھی کے ڈھے گئے ہیں۔ گھاٹ پر غیر ملکی سیاحوں کے غول کے غول چلے آرہے ہیں۔ اب یہ لوگ اپنے بجرے بیچ منجدھار لے جائیں گے۔

میری کشتی کو ایک نوعمر لڑکا چلا رہا تھا۔ ساحل سے ایک بزرگ نے باندھا۔ ان کا نام کنہیا تھا، وہ بنارس کے پرانے باشندے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کتنے عرصے سے کشتی چلا رہے ہیں؟ جواب ملا "چلا رہے ہیں۔ کوئی بیس برس سے۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ کے بڑے کشتی نہیں چلاتے تھے؟"

"وہ بھی چلاتے تھے۔"

"یہاں جب پانی زیادہ ہوتا ہو گا تو آپ کا کاروبار کم ہو جاتا ہو گا؟"

"نہیں۔ تھوڑا بہت کم ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی کشتی میں ہندوستان کے لوگ زیادہ جاتے ہیں یا باہر کے لوگ؟"

"سبھی لوگ جاتے ہیں۔"

اب میں نے کنہیا سے پوچھا "یہ جو بچہ ابھی ناؤ چلا رہا تھا، یہ صرف ناؤ چلاتا ہے یا اسکول میں بھی پڑھتا ہے؟"

"نہیں۔ ناؤ ہی چلاتا ہے۔"

مطلب یہ کہ ملاحوں کی نئی نسل تیار ہو رہی ہے۔

بنارس اپنے پان، خوشبو اور پیتل کے دیوتاؤں کی وجہ سے مشہور ہو گا مگر جو شہرت بنارس کو ساڑیوں کی وجہ سے ملی وہ کم شہروں کو نصیب ہوتی ہے۔ اکبر کے زمانے میں یہاں کمخواب کا اتنا عمدہ کام ہوتا تھا کہ اکبر بنارس کا وہ کپڑا یورپ کے بادشاہوں کو بھیجا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ آج بھی بنارس میں کئی لاکھ آدمی کپڑا بننے کی صنعت سے وابستہ ہیں اور اگر وہ سارے کے سارے نہیں تو بہت سارے مسلمان ہیں۔

تانے اور بانے میں دلکشی سمیٹنے والی اس تاریخی صنعت کو قریب سے دیکھنے کی خواہش ہوئی تو میں ساڑیوں کے ایک کارخانے میں جا پہنچا۔ ہر طرف کرگھے چل رہے تھے اور کھٹ پٹ کے تکلیف دہ شور کے اندر سے ایسے نازک اور نفیس پھول بوٹے نکلے چلے آ رہے تھے کہ کان جتنے تنگ تھے، عقل اُس سے کہیں زیادہ دنگ تھی۔

ایک صاحب کام کی نگرانی کر رہے تھے، میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا "آپ کا کیا نام ہے؟"

"محمد ابراہیم۔"

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"بنائی کرتے ہیں۔"

"بتائیے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ سب بنائی کا کام ہو رہا ہے۔ اور یہ ڈیزائن ہے اس سے پھول پتی پڑ رہی ہے۔ پہلے مشین بھی نہیں تھی، یہ ڈیزائن ہاتھ سے اٹھایا جاتا تھا۔ ۴۸ء سے پہلے یہ سب مشین نہیں تھی۔ اب جو ہے، تو یہ مشین چل گئی ہے تو ڈیزائن ایسے اُٹھ رہی ہے۔"

اب ہم آگے بڑھے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

محمد ابراہیم نے بتایا "یہ بھی وہی کام ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "اس میں ایک تو کاریگر کام کر رہا ہے، ایک اُس کے ساتھ چھوٹا لڑکا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ تو برابر ہوتا ہے۔"

"تو اس طرح یہ لڑکا کام سیکھ بھی رہا ہے؟"

"ہاں۔ اسی طرح سکھایا جاتا ہے۔ پہلے تو بچے آتے ہیں تو کچھ ڈھنگ نہیں رہتا ہے، پھر دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ اس کو سکھایا جاتا ہے۔"

اب ایک اَور کاری گر نے لقمہ دیا "یہ بچہ جو ہے، تو اسٹارٹنگ جب ساڑی ہوتی ہے تب ہی سے کام کرنے لگتا ہے۔ جو بُوٹی اس میں کڑھائی جاتی ہے، وہ چھوٹی بُوٹی، وہ بچہ شروع سے اس میں کام کرتا ہے۔ اور جب ہاف ہو جاتا ہے تب اُدھر بیل کاڑھنے لگتا ہے۔"

میں نے پوچھا "ایک عام قسم کی ساڑی کتنے وقت میں تیار ہو جاتی ہے؟"

محمد ابراہیم بولے "اب اس ساڑی میں کم سے کم دس روز لگے گا۔"

میں نے پوچھا "جب یہ ڈیزائن اٹھانے والا پتا نہیں تھا اُس وقت ایک ساڑی کتنے

دنوں میں بنتی تھی ؟ ''

انہوں نے بتایا '' اس وقت تو آپ لوگوں کو کیا خبر کیسے اور کیا بنتی تھی۔ ۴۸ء سے پہلے تو دوسری طرح کی ڈیزائن تھی۔ دوسری طرح کا سب کچھ تھا ''

محمد ابراہیم نے ''سب کچھ'' کی وضاحت نہیں کی۔ میں نے دوبارہ پوچھا '' تو آپ کا خیال ہے کہ اب دس دن میں ساڑی تیار ہو جاتی ہے ؟ ''

انہوں نے کہا '' ہاں محنت کرنے سے دس دن میں تیار ہو جاتی ہے ''

'' اور روز کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں ؟ '' میں نے پوچھا۔

'' روز آٹھ گھنٹہ کام کرتے ہیں '' جواب ملا۔

اب میں نے حساب لگاتے ہوئے کہا '' یعنی ایک ساڑی پر اسی گھنٹے لگتے ہیں ''

محمد ابراہیم نے کہا '' اسی گھنٹے بھی بہت مشقت سے۔ یعنی کہ مزدور اپنی پوری محنت سے کام کرتا ہے اُس مشقت کے بعد یہ کام ہوتا ہے اور دس روز میں ایک ساڑی تیار ہوتی ہے ''

محمد ابراہیم کی زبان سے ''مشقت'' جیسا لفظ سن کر میں شاید مرعوب ہو گیا چنانچہ اپنا اگلا سوال یوں پوچھا '' اچھا فرمائیے کہ بہت عمدہ کام والی ساڑی تقریباً کتنے پیسوں میں فروخت ہوتی ہے ؟ ''

انہوں نے کہا '' ہم لوگوں کے ہاں تو یہ آرگنزا کی ساڑی چھ سو سات سو روپے تک کی ہوتی ہے۔ ساٹن وغیرہ کی تو کئی کئی ہزار روپے کی ہوتی ہے ساڑی۔ نفع تو سارا بیوپاری کماتا ہے ''

میں نے پوچھا '' آپ کو پتہ ہے وہ کتنا نفع لیتا ہے ''

محمد ابراہیم نے کہا '' وہ کیا خبر۔ کسی کو نہیں پتہ چلے گا۔ ہم کو کیا خبر رہے گی۔ ہم لوگ اپنا مزدوری کیا۔ پیسہ ملا۔ اب وہ بیوپاری جانے کہ اس میں کتنا نفع بنائے ''

میں نے پوچھا "ایک کاری گر کو روز کتنی آمدنی ہوتی ہے؟"

"بس، پچیس تیس روپیہ ہوتی ہے۔ بس۔ محنت کے اوپر ہے۔ زیادہ محنت کیا تو پچیس تیس ہوا، نہیں تو اگر کچھ بگڑ گیا تو وہ بھی گیا۔"

اب میں نے پوچھا "یہ ساتھ میں جو چھوٹا لڑکا مدد کرتا ہے۔ اس کو بھی کچھ پیسہ ملتا ہے؟"

"ہاں۔ اس کو ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ دینا پڑتا ہے۔"

"آپ کو کچھ پتہ ہے بنارس میں یہ کام کتنے عرصے سے ہو رہا ہے؟"

"یہ تو بہت زمانہ ہو گیا۔ جب سے بنارس پیدا ہوا ہوگا تب سے یہ کام ہوا ہے؟"

میں نے پوچھا "آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ بنارس شہر کے اندر کتنے آدمی اس صنعت میں کام کر رہے ہیں؟"

محمد ابراہیم بولے "ایک لاکھ سے زیادہ ہوں گے۔"

میں نے پوچھا "کیا اس میں عورتیں بھی کام کرتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ جو زری وغیرہ ہے، یہ سب عورتیں بھرتی ہیں۔"

اس روز مجھے احساس ہوا کہ تانوں بانوں میں الجھے ہوئے یہ غریب کس مشکل سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ بھرتے ہوں گے۔

بنارس کا کیا کہنا

الہ آباد سے بھی آگے تک جہاں جہاں جی ٹی روڈ چلی ، ساتھ ساتھ سیدھے سپاٹ کھیت چلے۔ تپتی دھوپ میں آنکھیں سائے کے منظر کو ترس گئی تھیں کہ اچانک درختوں کے جھنڈ آگئے۔ باغوں کی ٹھنڈی چھاؤں آگئی اور ان کے ساتھ کوئل کی وہ پکار جسے سن کر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ، آنکھ کا نشہ ، کا وہ گانا ذہن میں مچلا

کوئلیا مت کر پکار۔ کریجوا لاگے کٹار

اور پھر اچانک یاد آیا کہ یہی بنارس تو آغا حشر کا شہر ہے۔ ممبئی اور کلکتے کے تھیٹر سے نکل کر جس کی پکار ادب اور ناٹک کی دنیا کے کونے کونے تک گئی یہ اُسی آغا حشر کی بستی ہے۔ چلیں اور وہ گلیاں اور وہ در و دیوار ڈھونڈیں جن میں ایسا عہد ساز ذہن پروان چڑھا ہوگا کہ گنگا کی لہروں کے دھیمے دھیمے تھپیڑوں اور باغوں میں کوئل کی پکاروں نے جس کے دل میں کیسا کیسا سوز و گداز نہ بھرا ہوگا۔ چنانچہ ہم گئے اور نہ صرف آغا حشر کی گلیاں ڈھونڈ نکالیں بلکہ ان کے سوز و گداز کی داستانیں کہنے والی ایک شخصیت کو بھی پالیا، اور وہ تھے آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کے بھتیجے۔ آغا جمیل کاشمیری۔

یہ بنارس کے محلہ گووند پورا کلاں کا ناریل بازار تھا جہاں ایک تختی لگی نظر آئی: آغا حشر لین۔ اسی گلی میں وہ مکان ابھی جوں کا توں موجود ہے جہاں ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو

آغا حشر پیدا ہوتے تھے۔ ان کے کاغذات، ان کی تحریریں، ان کے ڈراموں کے مسودے وہ سب ابھی موجود ہیں۔ اور صرف یہی نہیں۔ وہ مسہری جس پر وہ سوتے تھے، وہ آرام کرسی جس پر وہ بیٹھتے تھے، وہ میز جس پر لکھتے تھے، وہ پیالیاں جن میں وہ چائے پیتے تھے، وہ سب بڑی احتیاط سے رکھا گیا ہے۔

دنیائے ادب کی یہ گرانقدر امانت سنبھالے آغا جمیل کاشمیری بے قدری کے اس دور میں ایسی شخصیت ہیں کہ اگر کسی کو دیکھنا ہو کہ امین کیسے ہوتے ہیں وہ جاکر آغا حشر کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کے بیٹے کو دیکھے اور انکی زبان سے آغا حشر کی باتیں سنے، بڑے ابا یوں تھے، بڑے ابا ایسے تھے۔ یوں اٹھتے تھے، یوں بیٹھتے تھے، یوں خوش ہوتے تھے، یوں خفا ہوتے تھے، یوں ٹہل ٹہل کر منشیوں کو ڈرامے لکھواتے تھے اور گھٹا گھر کر آئی ہو اور احباب کا جمگھٹا ہو تو یوں جام لنڈھاتے تھے اور یوں زبان کے تکلف اٹھا دیتے تھے۔

آغا حشر جیسے عظیم ڈرامانگار کی یہ یادگاریں بس اب آغا جمیل کاشمیری کے دم سے ہیں۔ جو استطاعت رکھتے ہیں وہ مدد کو نہ پہنچے تو کتابوں میں تذکرے کے سوا کچھ نہیں بچے گا۔

میں پہنچا تو دیر تک بڑے ابا کے زمانے کے ناٹک کی باتیں سناتے رہے۔ وہ ایک الگ موضوع ہے۔ میرے اصرار پر ناٹک کے بول سنا رہے تھے۔ اسٹیج پر ہیروئن کس طرح کہتی تھی: کوئی مت کر بیکار، کر بیچ الا کے کٹار، انہوں نے گا کر سنا دیا اور پھر وہ بیوی کی لڑکی۔ کا ایک گانا۔ اس کی طرز کس طرح بنی تھی اور اسٹیج پر کیسے گایا جاتا تھا، مجھ سے یہ وعدہ لے کر کہ میں ہنسوں گا نہیں، انہوں نے وہی تھیٹر کے انداز میں سنا دیا:

والی تو

جگ کا ہے والی تو

جھم جھم ترے نور کی تجلی

ڈالی ڈالی، اعلیٰ اعلیٰ، کوئلیا کوکے
تو
جگ کا ہے والی تو۔

بنارس علم و ادب کا شہر رہا ہے۔ یہ کبیر، تلسی، چندر بھان، پریم چند کا شہر ہے فارسی شاعر علی حزیں یہیں دفن ہیں۔ رجب علی بیگ سرور نے زندگی کے کتنے ہی برس یہاں گزارے۔ جگر مراد آبادی یہیں پیدا ہوئے اور غالب کلکتے جاتے ہوتے ایک مہینے بنارس میں رہے مگر وہ مہینہ عمر بھر یاد رکھا۔

علم و ادب اور درس و تدریس کے اس شہر پر اب بڑی افتاد پڑی ہے۔ سفید پوشی کے لئے اور دو وقت پیٹ بھرنے کی خاطر اب گھروں کے لڑکے جولاہے اور ٹھٹھیرے بن گئے ہیں اور سب سے برا حال مسلمانوں کا ہے۔ میں جن دنوں جرنیلی سڑک پر جا رہا تھا مجھ سے آگے آگے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد جا رہے تھے۔ ہر جگہ لوگ مجھے بتاتے تھے کہ وہ آئے تھے اور التجائیں کر رہے تھے کہ گھر کے لڑکوں کو دست کاری یقیناً سکھائیں مگر مدرسے کی تعلیم بھی دلوائیں۔ روزی کی خاطر انہیں علم کی دولت سے محروم نہ رکھیں۔ علم پانے کی ضرورت کا احساس ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہے۔ اگر یہ کڑی ٹوٹ گئی تو ہمارے ہاتھوں میں صرف جہالت کی ڈور رہ جائے گی۔

اس پر یاد آیا کہ علم کا حال دیکھنے میں کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا تھا۔ الٰہ آباد کے وائس چانسلر کی طرح وہاں کے اُس وقت کے وائس چانسلر سید حامد کے خلاف بھی بعض لوگوں نے ایک محاذ بنا رکھا تھا، لڑکے اس بات پر بھی خفا تھے کہ وہ اتنا زیادہ ڈسپلن کیوں لا رہے ہیں، اتنی سختی کیوں کر رہے ہیں، سینٹ کا اجلاس طلب کر لیا تھا اور سید حامد صاحب کو ان کے منصب سے ہٹانے کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔

اس روز میں علم کا حال دیکھنے بنارس ہندو یونیورسٹی پہنچا۔ شہر سے ذرا باہر، گنگا کے

کنارے نہایت صاف ستھرا اور آراستہ کیمپس۔ دائرے بناتی ہوئی عمدہ سڑکیں۔ اور باغوں اور روشوں کے کچھواڑے سلیقے اور ترتیب سے بنی ہوئی عمارتیں۔ خالص ہندو طرز کے در، ویسے ہی ستون اور ویسی ہی جالیاں۔ درس گاہوں، انتظامی دفتروں، رہائش گاہوں، یہاں تک کہ معمولی خدمت گاروں کے کوارٹروں کی عمارتیں بھی اُسی ہندو طرزِ تعمیر کا نمونہ تھیں

میں اردو کے نوجوان اور ہونہار استاد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بتایئے بنارس میں تعلیم کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا:

"چونکہ یہاں کی مسلم آبادی کے بیشتر طبقے کی معیشت کا دارومدار دستکاری پر ہے، اس لئے ان لوگوں کی توجہ تعلیم کی طرف نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہاں جو تعلیمی ادارے ہیں اور ان میں بنارس ہندو یونیورسٹی بہت بڑا ادارہ ہے، یہاں پر بھی مسلمان طلبا کی تعداد نسبتاً کم ہے اور خود بنارس شہر سے آنے والے طلبا کی تعداد اُس سے بھی کم ہے۔ اور پھر اوّل تو تعلیم کی طرف توجہ کم ہے، دوسرے اس علاقے کے مسلمان طلبا زیادہ تر علی گڑھ کا رخ کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر باہر مجھ سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ ہندو یونیورسٹی کے کس شعبے میں ہیں، میں جب ان سے یہ ذکر کرتا ہوں کہ شعبۂ اُردو سے متعلق ہوں تو بہت ہی حیرت کے ساتھ وہ یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا بنارس میں اردو کا شعبہ بھی قائم ہے؟ - میں ان کے سامنے اکثر و بیشتر یہ کہتا ہوں کہ صرف اردو ہی کا شعبہ نہیں یہاں فارسی اور عربی بھی ہے لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ آپ اس کی طرف آتے نہیں، توجہ نہیں کرتے۔ یہ صورتِ حال ہے۔"

چلئے مانا کہ ہندو یونیورسٹی کے نام میں کچھ ایسی تاثیر ہو گی کہ نوجوان ادھر کا رُخ نہیں کرتے، تو پھر شہر میں ایک مسلم جامعہ بھی ہے۔ چل کر اُسے دیکھا جائے۔

بنارس کا مرکزی دارالعلوم ریوڑی تالاب کے علاقے میں ہے۔ نہایت بڑی اور

شاندار عمارت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندہ، جیتی جاگتی عمارت ہے۔ جماعتیں لگی ہیں، امتحان ہو رہے ہیں، تحقیق ہو رہی ہے، کتابیں چھاپی جا رہی ہیں، جریدے نکالے جا رہے ہیں، کتب خانہ آراستہ کیا جا رہا ہے، اقامت گاہیں بن رہی ہیں، جامعہ کا اسپتال تعمیر ہو رہا ہے اور فتوے جاری ہو رہے ہیں۔

مگر یہ درس گاہ علمائے دین تو پیدا کر دے گی، آج کی دنیا کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والے نوجوان وہ کہاں سے لائے گی؟ میں نے مرکزی دارالعلوم کے استاد مولانا صفی الرحمٰن صاحب سے یہی پوچھا کہ اس اتنے بڑے ادارے میں پرائمری کے پانچ سال اور عربی تعلیم کے دس سال لگانے کے بعد لڑکے کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

"عام طور پر تو کسی نہ کسی جگہ وہ تدریس کا کام کرتے ہیں، یعنی بڑی تعداد ایسے طلبا کی ہے جو پڑھنے پڑھانے کا کام یا مساجد میں بعض بعض امامت اور خطابت کا بھی کام کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو تجارت میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو یہاں کی سند کی بنیاد پر کسی میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیتے ہیں اور وہاں سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ اور اب تو باقاعدہ ریسرچ وغیرہ کے شعبے کے لئے بھی راستہ ہموار ہو گیا ہے۔ سند منظور ہوئی ہے تو اُس منظوری کے تحت وہ ایم اے میں یا بی اے کے دوسرے یا تیسرے سال میں داخل ہوتے ہیں اور اس راستے سے وہ ریسرچ وغیرہ تک پہنچتے ہیں ایک خاصی تعداد ایسی ہے جو یہاں سے فارغ ہو کر کسی عرب ملک میں' خاص طور پر سعودیہ میں مزید تعلیم کے لئے پہنچی اور وہاں سے انہوں نے بہت کچھ آسانیاں اور سہولتیں حاصل کیں۔ کچھ لوگوں نے ایم اے کیا اور کچھ لوگ پی ایچ ڈی میں بھی پہنچے ہیں۔"

تو یہ تھا بنارس کا مرکزی دارالعلوم جس کی اعلیٰ جماعتوں میں تقریباً چار سو لڑکے ہیں۔

ان میں سے ساڑھے تین سو بستی، گونڈہ، بہار اور بنگال سے آئے ہیں، خود بنارس کے بمشکل پچاس لڑکے ہیں۔ اس شہر کے لئے یہ معمولی نہیں، بڑی تشویش کی بات ہے۔

اور پھر منظر بدلا۔

یہ بنارس کے مشہور علاقے مدن پورہ میں پارچہ بافی کے پرانے تاجروں کی قدیم لیکن شاندار کوٹھیوں میں ایک وسیع و عریض کمرہ ہے۔ اونچی اونچی چھتیں جن پر نقش و نگار اُبھرے ہیں، رنگین شیشوں کی کھڑکیوں میں لوہے کی نازک کام کی جالیاں لگی ہیں۔ دیواروں پر سبز روغن ہے اور سنہری بیلوں کے نقش و نگار بنے ہیں۔ اطالوی طرز کے ٹائل لگے ہیں جو کنول کے پھولوں اور شہتوت کے پتوں سے مزین ہیں۔ دیواروں پر الماریاں جڑی ہیں جن میں کپڑے کے تھان لپیٹے رکھے ہیں۔ ساڑیوں کے ہر ڈیزائن کا کوئی نام یا نمبر ہے۔ فرش پر سفید چاندنی بچھی ہے۔ ایک طرف مسند ہے جس پر لکڑی کا فرشی ڈیسک رکھا ہے، وہی جس پر بہی کھاتے لکھے جاتے ہیں۔

یہیں ایک چھوٹی سی شعری نشست آراستہ ہے اور اِن تاجر گھرانوں کے ایک بزرگ عبدالقدوس نسیمؔ صاحب اپنی غزل پڑھ رہے ہیں۔ یوں بنارس میں ایک روایت ہے جو غنیمت ہے کہ ابھی تک چلی آ رہی ہے۔

ہوش و خرد سے گزرے دیوانگی سے گزرے
کچھ بھی سمجھ نہ پائے اس برہمی سے گزرے

کس حال میں بتائیں تیری گلی سے گزرے
سب سے گزر گئے جب، تب اپنے جی سے گزرے

گر تم کو پوچھنا ہو، شام و سحر سے پوچھو
فرقت کے چار دن تھے کس بے کلی سے گزرے

آ کر نسیمؔ ان کے دل کی کلی کھلا دو
برسوں گزر گئے ہیں راہ خوشی سے گزرے

یہ تھے عبدالقدوس نسیم صاحب۔ نہایت شفیق، چھوٹوں کا بہت خیال رکھنے والے، بچوں سے بے پناہ محبت کرنے والے، نورانی ڈاڑھی اور اس پر ایک مسلسل مسکراہٹ جس میں سونے کے دانت جگمگ جگمگ کرتے ہیں مگر آنکھوں سے اور پیشانی سے جو نور پھوٹتا ہے اس کا کیف سب سے جدا ہے۔

شعروادب کی بات چلی تو ہم کو چہ آغا حشر کاشمیری چلے۔ ویسے تو ادھر کئی راستے جاتے تھے مگر میرا اصرار تھا کہ دال منڈی کے راستے چلیں گے۔ اہلِ بنارس کی جنس وہیں سے آتی تھی۔ اب وہاں رسولن اور بتولن نہیں، نہ سہی۔ وہ جھروکے تو دیکھیں گے جن پر گرے ہوئے پردے کبھی یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ آج کوئی نہ کوئی رئیس تشریف لائے ہوتے ہیں۔ ہم گئے تو دن کبھی کا ڈھل چکا تھا۔ سوچتے گئے کہ ہر طرف راگ راگنیوں کی جھڑی لگی ہوگی۔ مگر دال منڈی میں ہم ایسے سبز قدم نووارد نکلے کہ ہمارے وہاں جاتے ہی علاقے کی بجلی چلی گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ جو لوگ اُجالے میں ادھر جاتے ہوئے ڈرتے ہوں گے انہوں نے موقع غنیمت جانا اور لپکے مگر کچھ یوں کہ وہ جاتے تھے ہم نکلے۔

جہاں دال منڈی ختم ہوئی وہاں ناریل بازار شروع ہوا۔ اب آغا حشر کاشمیری مرحوم کی بیرونی بیٹھک تھی اور ان کے بھتیجے آغا جمیل احمد تھے جن کی باتوں میں دال یا ناریل کی نہیں، گلوں کی خوشبو تھی۔ پرانے بنارس کی ساری تہذیب سمٹ کر ان کی گفتگو میں چلی آئی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس رات شمع کی روشنی میں آغا جمیل احمد شاہ کاشمیری صاحب نے اب بڑے آبا کی طرح مکالموں سے وہ منظر کھینچا کہ مرزا غالب کے کسی خط کا وہ فقرہ جی اُٹھا۔ "بنارس کا کیا کہنا! ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا، اِدھر کو نہ آتا۔"

آغا صاحب بتا رہے تھے "یہاں پر کجری بنارس کی خاص چیز ہے اور کجری میں بھیرو ایک شخص یہاں کے اوپر بہت مشہور تھا، اُس کا اکھاڑ آتا تھا اور پھر یہ ہے کہ بندہ

اور مسلمانوں کی یک جہتی کا یہ عالم تھا کہ ہولی کے زمانے میں اِدھر ہولی کا جلی، اور آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی قسمت میں پتہ نہیں کیا تھا، میں نے جس شہر میں دیکھا یہی دیکھا کہ مسلمان رؤسا کے مکانوں کے قریب بازارِ حُسن ضرور ہے۔ تو لہٰذا یہ دال منڈی میری تو ہٹی ہے میرے اِس پھاٹک پہ جایئے تو دال منڈی اور اُس پھاٹک پہ جایئے تو دال منڈی تو اس زمانے میں بھی دال منڈی تھی اور دال منڈی بھی آجکل کی دال منڈی نہیں تھی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ آباد دال منڈی تھی۔ یہاں پر اس کا طریقہ یہ تھا ہم لوگوں کے بچپن میں کہ صبح کے وقت یہ تعلیم لیتی تھیں اپنے استادوں سے۔ اس کے بعد یہ آرام کرتی تھیں۔ شام کو ان کے یہاں اگر کسی رئیس نے کہلا دیا کہ میں آنے والا ہوں تو پردے ان کے گرے ہوئے تھے۔ کوئی دوسرا جا نہیں سکتا تھا۔ وہ رئیس آتے تھے۔ نو دس بجے سے ان کا گانا شروع ہوتا تھا اور اس کے بعد صبح بھیروی کے بعد ان کا گانا ختم ہو جاتا تھا۔

مجال نہیں کہ کوئی محلّے کا لڑکا اُن کے یہاں قدم رکھ دیوے۔ اور اگر رکھ دیا تو دوسرے دن جناب من اُن کے گھر شکایت آتی تھی کہ میاں آئے تھے۔ اب آپ کا یہ فرض ہے کہ صاحب زادے کو روکیے، میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تو گھر یہ خبر بھی آجایا کرتی تھی۔ تو لہٰذا سب محتاط رہتے تھے۔ یہ ہے کہ اُن کی تہذیب دیکھ کر کے ہم لوگوں میں تہذیب کا مادہ ضرور پیدا ہو جاتا تھا۔

تو اُس زمانے میں یہ تھا کہ جتنے اکھاڑے آتے تھے، اِس بازارِ حسن میں آتے تھے۔ تو ہولی جلی اور مسلمانوں کے اکھاڑے آنے شروع ہوئے۔ دَف ہوتے تھے اور ستار ہوتے تھے اور جناب من اسکے اوپر وہ گاتے تھے اور اُسکے اندر بہت اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے تھے اور فی البدیہہ! ایک اکھاڑے نے کچھ کہا۔ اُس کا جواب دوسرے اکھاڑے نے دیا، اس کا جواب تیسرے اکھاڑے نے دیا۔ اب سلسلہ جو ہے یہاں سے وہاں تک دال منڈی جو ہے وہ بھری ہوئی ہے اور یہ سلسلہ ہو رہا ہے۔

اور جناب من فجر کی اذان ہوئی اور یہ ختم ہو گیا۔ اور جب لوگ چلے گئے تب

اس کے بعد رنگ ہوا۔ اور رنگ بھی یہ نہیں کہ تارکول اور یہ اور وہ یہ تمام چیزیں نہیں اُس زمانے میں ہار سنگھار سُکھا کر رکھے جاتے تھے۔ زعفران کا رنگ یا بہت ہلکا رنگ۔ پھر اس کے بعد ٹکڑیاں نکلتی تھیں، گاتی ہوئی۔ یہ بھٹھیروں کی ہیں۔ یہ اِن کی ہیں۔ یہ اُن کی ہیں۔ آگے آگے شہنائی بج رہی ہے اور یہ جو بسم اللہ کا خاندان ہے اس میں سے بھی جو اِن کے ماموں وغیرہ اور اَور عزیز تھے اور وہ جنابِ من آگے آگے شہنائی بجا رہے ہیں اور یہ جنابِ من گاتے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ صورت ہوتی تھی اُس وقت بنارس میں !"

شیر شاہ کا لڑکا

دعاؤں کے معاملے میں اوپر والے کا حساب عجب ہے۔

مانگو تو کبھی بالکل نہیں دے گا اور کبھی دینے پر آئے گا تو طلب سے زیادہ دے گا۔ اور کبھی یہ کہ جتنا مانگو۔ ناپ تول کر بس اتنا ہی!

اس روز یہی ہوا۔ سہسرام کی بس مسافروں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی اور چلنے کو تیار تھی۔ ہم نے دل ہی دل میں دعا مانگی: بس ایک پیر ٹکانے کی جگہ مل جائے۔

وہ مل گئی۔ جب ہماری بس بنارس کے اڈّے سے نکلی، ہم اس کے اندر ایک ٹانگ پر کھڑے تھے۔ باہر کیسے منظر آئے، کیسے منظر گئے، ہمارے فرشتوں کو ہو تو ہو، ہمیں خبر نہیں۔ دوسرے مسافر بتاتے رہے کہ اب یو پی کا علاقہ ختم ہونے کو ہے، اب بہار کی سرحد قریب ہے۔ بہار کی سرحد کا نام لیتے ہوئے وہ کچھ خوف زدہ سے تھے ہم نے کسی سے پوچھا: کیا ڈاکوؤں کا ڈر ہے؟

کہنے لگے: جی نہیں پُل کا ڈر ہے۔

کچھ دور جا کر ہماری بس رُک گئی۔ کچھ تھکے ہوئے مسافر نیچے اترے اور درختوں کے سائے میں سستانے لگے۔ تب معلوم ہوا کہ سڑک پر آگے کوئی بہت تنگ پُل ہے جس پر سے بیک وقت دو بڑی گاڑیاں نہیں گزر سکتیں لہٰذا پُل کے اِدھر اُدھر کئی کئی

میل تک ٹریفک جام رہتا ہے اور کبھی کبھی سات سات آٹھ آٹھ گھنٹے بعد پار اترنے کی نوبت آتی ہے۔

روزمرہ کے آنے جانے والے مسافر اتنے مطمئن تھے کہ بس سے اتر کر ایک خالی پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ خواتین بس کی گرمی، ڈیزل کی بو اور جھٹکوں کی تاب نہ لاسکیں وہ نیچے اتر کر اطمینان سے قے کرنے لگیں۔

کہ اچانک بس کے ڈرائیور کے جی میں خدا جانے کیا آئی۔ اُس نے نعرۂ یاہو بلند کیا اور بس چلادی۔ خواتین اپنی قے اور مسافر اپنی نیند ادھوری چھوڑ کر بس میں چڑھ گئے اور اب جو جیالے ڈرائیور نے پینترے بدل بدل کر بس کو دوڑانا شروع کیا اور نشیب و فراز کو، یہاں تک کہ موت و حیات کو خاطر میں لائے بغیر گاڑی چلائی تو پُل پار کرکے ہی دم لیا۔

مسافروں نے اُس کو شاباش دی اور صحیح سلامت پار اتر جانے پر خود کو مبارک باد دی۔ یوپی پیچھے نکل گیا۔ بہار کا علاقہ آگیا۔ ہر ایک بولا: بہار آگیا۔

میں نے پوچھا: آپ کو کیسے پتہ چلا؟

جواب ملا: یہ جو سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے تار چل رہے ہیں، پہلے تانبے کے تھے، اب المونیم کے ہیں۔ اس کا مطلب ہے بہار آگیا۔

میں یہ دلیل سمجھ نہ سکا۔ کہیں یہ سرزمین کا اثر تو نہیں۔ مگر فوراً ہی ایک صاحب نے وضاحت کردی۔ کہنے لگے: ارے صاحب، یہ علاقہ چوروں کا علاقہ ہے۔ آئے دن بجلی کے میلوں لمبے تار کاٹتے رہتے تھے اور تانبے کے بھاؤ بیچا کرتے تھے۔ حکومت نے تنگ آکر امریکی ماہروں کے مشورے سے المونیم کے تار کسوا دیئے ہیں۔ المونیم حقیر اور سستا ہوتا ہے اس لئے چور اب زحمت نہیں کرتے۔

میں نے کہا: چلو اچھا ہوا۔

کہنے لگے ؛ خاک اچھا ہوا۔ ذرا تیز جھونکا آئے تو یہ تار ٹوٹ جاتے ہیں اور بہار اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔

میں سمجھا کہ یہ صاحب جھوٹ بول رہے ہوں گے۔

مگر بدقسمتی سے اسی رات تیز آندھی آئی۔

وہ صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے، خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہے تھے۔

پھر بہار کے چوروں کا ایک کارنامہ شیر شاہ کے مقبرے پر دیکھا۔

ہاں تو سہسرام آ گیا۔ شہر والوں نے کبھی جی ٹی روڈ کے کنارے گاندھی جی کا مجسمہ لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی نے چھوٹا سا سر بنا دیا، وہ ایک بڑے سے مینار کے اوپر لگا دیا گیا۔ نووارد پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ہے اور شہر والے بتا رہے تھے کہ گاندھی جی ہیں۔

ہم شہر کے بازار میں داخل ہوئے تو راہ میں ایک شفا خانہ پڑا۔ اُس پر اُردو میں بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا: آیے بابو کا چیر پھاڑ گھر! کوئی بھلے سے عطائی معالج تھے۔ آلِ احمد یا شاید آلِ حسن۔ یہ اُن کا شفا خانہ تھا۔ علم و ادب کا ذوق رکھتے تھے، اپنے ذاتی کتب خانے کے مالک تھے اور سادہ لوح مریض ان کو بہت مانتے تھے لہٰذا ان کے شفا خانے کو "آیے بابو کا چیر پھاڑ گھر" کہتے تھے چنانچہ یہی شفا خانے کا نام پڑ گیا۔

راہ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مندر اور دیول پڑے۔

"ایک سڑک پر اتنے بہت سے مندر؟" میں نے حیران ہو کر کسی سے پوچھا۔

اُس نے کہا کہ اس علاقے میں ہندو دھرم کی لہر اچانک اٹھی ہے، جیسے لوگ کسی زمانے میں کہیں مسجد بنا لیا کرتے تھے اور پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ اُسے گرا دے، اسی طرح اب لوگ جہاں چاہتے ہیں ایک پتھر رکھ جاتے ہیں، اُس پر گیروا رنگ پھیرتے

ہیں، تیل کے چند قطرے ٹپکاتے ہیں، تلسی کے پتے اور گیندے کے کچھ پھول رکھ جاتے ہیں اور بس! ۔ مندر بن کر تیار ۔ اب کوئی اُسے گرا نہیں سکتا۔

سہسرام میں ایسے بہت سے مندر دیکھتے ہوئے ہم ہندوستان کے عظیم افغان بادشاہ شیر شاہ کے پرشکوہ اور باوقار مقبرے پر پہنچے جس کے گرد نہایت شاندار جھیل تھی، اور جھیل کے کنارے پوجا پاٹھ کا سلسلہ جاری تھا۔ کسی نے کہا" یہاں بھی ایک رات آکر لوگوں نے مندر بنا لیا ہے۔ شیر شاہ کے تالاب کا نام بدل کر ہنومان تلیّا رکھ دیا گیا ہے اور تالاب کے گھاٹ پر مندر بنایا گیا ہے اس کا نام شیو گھاٹ رکھا گیا ہے" تاریخ کی اس عظیم یادگار میں قانون کے مطابق ذرا سی بھی تبدیلی کرنے کی اجازت نہیں مگر کسی کو جرأت نہیں کہ ان پجاریوں کو اٹھائے اور مورتیوں کو ہٹائے۔

خیر ۔ وقت کبھی تھما نہیں، حالات، واقعات اور مقامات بدلنے سے کبھی رُکے نہیں۔ ایک مزار پر کیا موقوف، یہ حال کُل سنسار کا ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں اور پربھو بھی۔

اب وقت آن پہنچا تھا شاہراہ اعظم کے معمار، میاں حسن خاں سوری کے ہونہار فرزند فرید خاں سوری اور ہماری داستان کے مرکزی کردار شیر شاہ کے مرقد پر حاضری دینے کا۔

نیلگوں پانی کے درمیان، آسمان کو چھوتی ہوئی برجیوں اور تاج محل سے بھی بڑے گنبد کی ایسی عمارت کہ جس کا رواں رواں پکارے کہ ہندوستان کا شیر یہیں ٹھنڈی خاک پر آنکھیں موندے سو رہا ہے۔

گیارہ سو فٹ لمبی اور ایک ہزار فٹ چوڑی جھیل کے بیچ میں یہ عمارت جزیرہ نہیں بلکہ نور کا مینارہ نظر آتی ہے۔ ایک باندھ پر چل کر عمارت تک پہنچا جاتا ہے۔ وہاں تین سو فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا چبوترہ ہے جس پر مقبرے کی ہشت پہل عمارت

کھڑی ہے۔

ایک بہت بڑے ہال کے بیچوں بیچ شیر شاہ کی قبر تھی۔ اُس پر سرخ چادر بچھی تھی جس پر ۷۸۶ اور کلمۂ توحید لکھا تھا۔ میں نے مقبرے کے رکھوالے سے پوچھا کہ قبر پر یہ چادر کس نے چڑھائی؟ اُس نے کہا "چادر تو یہ کانگریس آئی کے سیکرٹری دسر تھ دوبے کا ہے۔ اور ویسے قانون میں ہے کہ یہاں پر کسی قسم کا پوجا پاٹھ کرنا منع ہے۔"

اب میں مقبرے کے وسیع و عریض ہال میں اس کے بہت اونچے عظیم الشان گنبد کے نیچے کھڑا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا گنبد ہے۔ اس سے بڑا گنبد صرف بیجاپور میں ہے۔ اس وقت وہاں مرمت کا کام ہو رہا تھا اس کے لئے بانسوں کے اونچے مچان باندھے گئے تھے جو گھومتی ہوئی سیڑھیوں کی طرح نیچے فرش سے شروع ہو کر اوپر چھت تک جاتے تھے۔ مرمت کی ضرورت یوں پڑی کہ گنبد کے کچھ پتھر ڈھیلے ہو کر گرنے لگے تھے۔

اس گنبد کے وسط میں لٹکی ہوئی وہ مشہور زنجیر مچان میں کہیں چھپ گئی جس میں کوئی چیز آویزاں ہے۔ کسی زاویے سے یہ چوکور، کسی سے تکونی، کسی زاویے سے گول نظر آتی ہے۔ یہ بھی غالباً ان عظیم الشان عمارتوں کے نقشے بنانے والے مہندسوں کے فن کا کمال رہا ہو گا۔

گنبد کے عین نیچے اور عمارت کے بالکل وسط میں شیر شاہ کی تنہا قبر ہے جس پر سرخ چادر چڑھائی گئی ہے اس کے چاروں کونوں کو پتھروں سے دبا دیا گیا ہے۔ وہیں شمع جلانے کے لئے ایک اونچا پتھر نصب ہے۔ اس قبر کے پینتانے تقریباً پچیس قبریں ہیں جو نہ تو باقاعدگی سے بنی ہیں نہ کسی خاص ترتیب سے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کافی بعد میں اور وقتاً فوقتاً بنائی گئی ہیں۔ کچھ قبریں اونچی ہیں، کچھ نیچی ہیں، کچھ سپاٹ ہیں، کچھ پر قلم دان بنے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مرد دفن ہیں۔

جو قبریں نیچی اور سپاٹ ہیں ان میں عورتیں دفن ہیں۔ یہ سب شیر شاہ سوری کے خاندان کے افراد ہیں۔ وہ جیسے جیسے مرتے گئے یہاں لا کر دفن کئے جاتے رہے۔

شیر شاہ کے مقبرے کی اس عمارت میں اوپر دو منزلیں اور ہیں۔ پہلی منزل کی بڑی بڑی کھڑکیاں اندر بڑے ہال میں کھل رہی ہیں۔ یہ تعداد میں سولہ ہیں اور ان میں پتھر میں تراشی ہوئی بڑی بڑی جالیاں لگائی گئی ہیں۔ آمنے سامنے والی کھڑکیوں کی جالیوں کے نقش ملتے جلتے ہیں۔ اِس طرح اس میں آٹھ قسم کے نقش و نگار تراشے گئے ہیں۔

اسی طرح عمارت میں ہر طرف در کھلتے ہیں لیکن آٹھ پہلوؤں کی عمارت میں سات در ہیں، آٹھویں پہلو میں محراب ہے۔ اس محراب میں پتھر میں آیاتِ قرآنی اور پیغمبر اسلام کا نام نامی تراشا گیا ہے اور بہت نفیس کام ہے۔ اس محراب کے اندر کبھی ٹائلوں کا کام رہا ہو گا جو اب اکھڑ گئی ہیں لیکن کہیں کہیں نیلے ٹائل اب بھی نظر آتے ہیں۔ جب کبھی یہ ثابت ہوں گے، کتنے دلکش ہوں گے۔

اب ہم عمارت کے بالائی حصّے کی طرف چلے۔ ہم دیر تک سیڑھیوں پر چڑھتے رہے۔ برجیوں سے دور دور کے مناظر کی سیر کرتے رہے۔ انگریزوں کے زمانے میں عمارت کی بڑے پیمانے پر مرمت کرائی گئی ہوگی۔ اُس کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔

آسمان کو چھونے والی اس عمارت پر کہیں بجلی نہ گرے، اس خیال سے گنبد کی پھنگل سے لے کر نیچے زمین تک تانبے کی ایک پٹی لگائی گئی تھی تاکہ اگر بجلی گرے تو اس کی راہ زمین میں سما جائے۔ چوروں نے کسی دن موقع پا کر دھات کی وہ پٹی نوچ لی اور تانبے کے بھاؤ بیچ کھائی۔ پھر کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ویسی نئی پٹی لگوائے۔ اب اگر برق گری تو شاید کوئی شیر شاہ کو بے چارا، بھی نہ کہے۔

مقبرے کے اندر ہم نے کسی کو یہ کہتے سنا تھا کہ شیر شاہ کے مرقد پر جو چادر چڑھی

ہے اور جس پر کلمہ توحید لکھا ہے وہ شہر کے ایک صاحب دسرتھ دوبے نے چڑھائی ہے۔ آخر یہ دسرتھ دوبے کون ہیں جو شیر شاہ کے اتنے عقیدت مند ہیں۔ کسی سے پوچھا تو اُس نے کہا "آپ دسرتھ دوبے کو نہیں جانتے؟ یہی تو ہیں جنہوں نے دلی جا جا کر اور حکام سے لڑ جھگڑ کر جی ٹی روڈ کا نام شیر شاہ سوری مارگ رکھایا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ ہم مچل گئے۔ ہم دسرتھ دوبے سے ضرور ملیں گے۔ چنانچہ لوگ دوڑائے گئے، پیغام بھجوائے گئے اور کچھ دیر بعد ایک صاحب کاغذوں کا پلندا اٹھائے چلے آئے۔ یہی دسرتھ دوبے تھے۔

درمیانہ قد، بھرا بھرا بدن، چہرے پر اچھی ترشی ہوئی داڑھی جس پر نور بھی تھا۔ سر پر نمازیوں جیسی ٹوپی، بس ماتھے پر سجدوں کے نشان کی کمی تھی۔ سنا ہے کہ ایک مرتبہ مندر میں پوجا کرنے گئے تو شناختی کارڈ دکھانا پڑا، تب داخلے کی اجازت ملی۔

"یہ ہیں دسرتھ دوبے" کسی نے کہا۔

پتہ چلا کہ سہسرام کے قدیم ہندو باشندے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا صرف ایک مقصد بنا لیا ہے اور وہ یہ کہ تاریخ میں شیر شاہ کو اس کا جائز مقام دلا کر دم لیں گے۔ سہسرام میں شیر شاہ، اس کے باپ، اس کے بیٹے اور اس کے جرنیل اور معمار کے جو مقبرے اور دوسری یادگاریں ہیں انہیں بچا کر رہیں گے کیونکہ بدلتا ہوا وقت ان کا حلیہ اس بری طرح بدل رہا ہے کہ کچھ عرصے بعد شناختی کارڈ سے بھی نہیں پہچانے جائیں گے۔

دسرتھ دوبے آئے دن اپنا بستہ اٹھا کر دہلی پہنچ جاتے ہیں اور حکام سے لڑ جھگڑ کر کبھی رقم منظور کرا لاتے ہیں، کبھی مرمت کی منظوری لے آتے ہیں اور کبھی تعمیر کا پروانہ لکھا لاتے ہیں مگر کام کی رفتار اب بھی اتنی سست، اور حکام کی توجہ اب تک اتنی کم ہے کہ دسرتھ دوبے کی تشفی نہیں ہوتی۔

سرکاری افسر اُن سے کہتے ہیں: تم شیر شاہ کے کچھ لگتے ہو؟

اور یہ اپنے مخصوص بہاری لہجے میں جواب دیتے ہیں: ہاں، ہم ان کالڑکا ہیں۔

میں نے کہا: دسرتھ دوبے جی۔ بتایئے سہسرام میں سوری خاندان کی تاریخی یادگاروں کی کیا حالت ہے؟ ان کا جواب: ان ہی کی زبان:

"اُس کا حالت ابھی لگتا ہے کہ بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ شیر شاہ سہسرام کے رہنے والے حسن سور شاہ کے بیٹے تھے۔ پانچ برس تو ہندوستان میں راج کیئے۔ سب سے پہلے وہ جی ٹی روڈ کا نرمان کیئے۔ اور مُلک میں سب سے پہلے ڈاک وِوَستھا لاگو کرنے والے شیر شاہ تھے جو بھارت میں ڈاک وِوستھا کا شروعات کیئے۔ جو آدمی دنیا میں حکومت کیا آج اس کے سمپتی کو بھی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ سرکار کی طرف سے اسواسن ملتا ہے۔ آج تک کوئی کارروائی نہیں ہوتا ہے۔ شیر شاہ مقبرے تک جانے کے لئے جی ٹی روڈ سے جو راستہ کے دونوں طرف سے اَکرمجمینٹ کر کے مکانات بنائے گئے ہیں۔ شیر شاہ کا مقبرہ جہاں دیس کے بدیس کے پرتیک لوگ دیکھنے کے لئے آتے ہیں اُس مقبرے کے چاروں طرف سے اَتی کرمن کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک طرف اتی کرمن کر کے لائنز کلب کے مادھیَم سے بال وکاش ودیالیہ کا نرمان کیا گیا ہے، تو دوسری طرف مندر کا نرمان کیا گیا ہے۔ تیسرے طرف ایک بیر کا بغیچہ ہے اور کچھ لوگ اتی کرمن کرتے جا رہے ہیں۔ یدی اتی کرمن کا یہی سلسلہ جاری رہا، سرکار کے طرف سے صرف اسواسن ملتا رہا تو شیر شاہ کے اتہاسک اسمارگ کا نام و نشان آگے چل کر مٹ جائے گا۔

شیر شاہ کا اتہاسک حمام جو سہسرام میں تھا اُسے راتوں رات

توڑ دیا گیا ہے۔ وہی استھتی ان کے پتا حسن سور شاہ کے مقبرے کا ہے۔ شیر شاہ کا جو پرانا قلعہ سبزی بازار سہسرام میں شیر گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس قلعے کے چاروں طرف سے آکرمن نگرپالیکا دوارا کیا گیا ہے اور اُس میں سبزی منڈی لگایا جاتا ہے۔ پرانے قلعے کے پھاٹک کو توڑ دیا گیا ہے۔

وہی حالت ہے شیر شاہ کے مقبرے کا۔ شیر شاہ کا مقبرہ چاروں طرف تالاؤ کے بیچ میں اوستھت ہے۔ کینال سے ایک طرف سے پانی آنے کا راستہ ہے۔ دوسرے طرف سے نکاس کا راستہ ہے۔ نکاس کا راستہ جو دلّی دروازہ، بادشاہی پُل ہوتے ہوئے جاتا ہے، اُس نکاس کے راستے کی صفائی میں قریب ایک ڈیڑھ لاکھ روپئے لگ چکے مگر آج تک وہ صفائی کا کام پورا نہیں ہوا۔ پانی کا نکاسی آج تک نہیں ہو رہا ہے۔ جو کینال سے آنے کا راستہ ہے اُس میں بھی پیسے خرچ کر کے صفائی کئے گئے مگر آج بھی اس کا جل بھی جیوں کا تیوں ہے۔ کینال سے پانی اُس میں پرویش نہیں کر رہا ہے۔ اُس کا جل آج بھی دُرگندھ دے رہا ہے۔ میں باری باری بھارتیہ پُراتت وبھاگ کے پری پد ادھیکاری، ڈائرکٹر جنرل، مونومنٹس، دلّی سے لے کر کے بہار تک بات کرتا رہا۔ لوگوں سے کہتا رہا۔ آپ سب کے سہیوگ سے میں اِس لڑائی کو آج بھی لڑ رہا ہوں اور یہ سلسلہ، میرا پتہ گیا ہے، کہ میں جب تک زندہ رہوں گا یہ میرا لڑائی چلتا رہے گا، سرکار سے!"

یہ تھے سہسرام کے دسرتھ دوبے۔

میں آواگون کا کچھ زیادہ قائل نہیں مگر جب دسرتھ دوبے حکام سے اُلجھتے

ہیں اور کہتے ہیں "ہاں، ہم شیر شاہ کا لڑکا ہیں" تو میں ایک لمحے کو سوچتا ہوں۔
شیر شاہ کے جتنے کام ادھورے رہ گئے تھے، اس کے بیٹے اسلام شاہ نے وہ سارے کام پورے کرنے کا عزم کیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو دسر تھڑ دوبے ہیں وہ ——

خیر — جانے دیجئے۔

ٹھیکری بولتی ہے

شیر شاہ کا شہر سہسرام پہاڑیوں کی گود میں آباد ہے۔
قریب کے پہاڑ نیچے ، دور کے پہاڑ اونچے۔
شاید ایسا نہ ہو، شاید یہ نظر کا فریب ہو لیکن نظر یوں ہی آتا ہے۔

ایسے ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر رُہتاس کا وہ قلعہ ہے جس کے بارے میں طے تھا کہ اس پر قبضہ کرنا تو دور کی بات ہے، حملہ آوروں کا اُس تک پہنچنا بھی ناممکن ہے۔ پھر یہ ہوا کہ شیر شاہ نہ صرف اس تک پہنچا بلکہ اس پر قبضہ کرلیا اور پھر اتنا عزیز جانا کہ کوئی ایک ہزار میل دور جہلم میں دوسرا قلعہ بنوایا تو اس کا نام بھی رُہتاس رکھا۔

میں نے سہسرام پہنچ کر اپنے میزبانوں سے اصرار کیا کہ جہلم کا رُہتاس دیکھ آیا ہوں، سہسرام کا رُہتاس بھی دیکھوں گا۔ پتہ چلا کہ اب اُس قلعے میں کوئی نہیں جاتا کیونکہ اس میں اب ڈاکو رہتے ہیں۔ وہیں کتھے کے جنگل ہیں۔ وہ بھی ڈاکوؤں کے تصرف میں ہیں، اس لئے لوگ اب جان کے خوف سے قلعہ رُہتاس نہیں جاتے۔

اُدھر سے مایوسی ہوئی تو سامنے کیمور کی پہاڑیوں پر چڑھنے کی ٹھانی۔ اوپر چوٹی پر کسی بزرگ کا سفید مقبرہ دور سے نظر آتا ہے۔ وہیں ایک آرام گاہ بھی بنی ہے۔ برسات کی جھڑی لگتی ہے تو شہر والے اپنے گھر چھوڑ کر وہاں اوپر پہنچ جاتے ہیں، برساتی جھرنوں

کے شور سے آواز ملاکر بارہ ماسہ گاتے ہیں اور نوجوانوں کی ٹولیاں رات دہیں رہ جاتی ہیں اور ساون کی گھن گرج اور کڑکتی بجلیاں ان کے دلوں میں اُدر جولانی بھرتی ہیں۔ میں نے بھی طے کیا کہ اب آیا تو برسات میں آؤں گا۔

ہم جو پہاڑی پر چڑھے تو موسم گرما کی کڑی دھوپ تھی۔ اِدھر اُدھر وہ غار تھے جن میں بیٹھے بودھ راہب بظاہر دنیا کے پہاڑوں کی چوٹی پر لیکن دراصل دھیان کے سمندر کی تہہ میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ میں جو وہاں پہنچا تو ساڑھے چار سو سال پیچھے جا پہنچا۔ نیچے دور دور تک وہ میدان پھیلے تھے جن میں وقت کے اجلے ورق پر شیر شاہ کی تاریخ رقم ہوئی ہوگی۔

جہاں تک نگاہ جاتی تھی بہار کی سرزمین نظر آتی تھی۔ بڑے بڑے کارخانے نئی نئی آبادیاں، دھوپ میں چمکتی ہوئی ریل کی پٹریاں، نیچے تاڑ کے باغوں میں بیٹھی ہوئی بے کاروں کی نشے میں دھت ٹولیاں، دور شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ کا ادھورا مقبرہ جو ابھی بنیادوں سے دو چار ہاتھ اونچا اٹھا تھا کہ اسلام شاہ دنیا سے اٹھ گیا اور پھر کوئی عظیم الشان عمارت کو بنوانے والا بھی نہ رہا جو اگر مکمل ہو جاتی تو بڑی جھیل کے بیچ میں وہ ایک شاندار روضہ ہوتا جس کے چار کونوں پر تاج محل جیسے چار مینار ہوتے اور دنیا کے سیاح اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی تصویریں اترواتے۔ اب تو حسرت و یاس کی تصویر بنی اُس کی ادھوری دیواریں ہر صبح گاؤں دیہات کی عورتوں کے لئے پردے کی آڑ فراہم کرتی ہیں۔

پہاڑی کے اوپر سے سہسرام کی وہ پتھریلی گلیاں بھی نظر آئیں جن میں جیالے افغانوں کی نسلیں آج تک آباد ہیں اور گھنی مونچھوں اور چوڑے چکلے سینوں والے وہ بھوج پوری جوان رہتے ہیں جن کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ وہ بڑے لڑیا، ہیں اور ہمیشہ فوج میں بھرتی ہوتے رہتے ہیں۔ کیسا اتفاق ہے کہ ضلع جہلم کے قلعہ رہتاس

کے آس پاس کے میدانوں میں بھی ایسی ہی فصل اُگتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور میں کڑا وقت پڑا تھا تو سہسرام ہی کے کنور سنگھ، نشان سنگھ، دلاور خان اور پردہ دار خاتون حاجی بیگم نے وطن کے نام پر اپنی جانوں کا سودا کیا تھا۔ سہسرام کے ایک بزرگ اور ایس پی جین کالج کے پرنسپل رامیشور سنگھ کشیپ صاحب نے بتایا:

"ہندوستان کی آزادی میں بھی سہسرام کا بہت ہی شاندار حصہ رہا، اور یہاں کے نشان سنگھ، جو کنور سنگھ کے سپہ سالار تھے، یہاں کے دلاور خان، ان لوگوں نے کافی انگریزوں سے ٹکر لی اور بڑی بڑی قربانیاں دیں اور آزادی کی لڑائی میں سہسرام کا اپنا خاص استھان ہے، اس میں کوئی سندیہہ نہیں ہے۔"

میں جب سے سہسرام پہنچا تھا، حاجی بیگم کی دلاوری کے قصے سن رہا تھا اور شرمندہ تھا کہ ان کے نام نامی سے واقف تک نہیں چنانچہ شہر میں اس مجاہد خاتون کے خاندان کے لوگوں کو ڈھونڈ نکالا۔ محمد عبدالقدیر خاں کی وہ پرنانی کی والدہ تھیں۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ حاجی بیگم کون تھیں:

"حاجی بیگم بنگش قبیلے کے ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُس کے بعد غدر کا جب زمانہ آیا تو برٹش فوج کے خلاف انہوں نے بھی کنور سنگھ کے شانہ بشانہ بغاوت کا علم سربلند کیا اور جب کنور سنگھ اپنے جگدیش پور سے بھاگے تو اسی محلہ پٹھان ٹولی میں، جس کو پہلے افغان ٹولی بھی کہا جاتا تھا اس مکان میں چھپے۔ وہ مکان اس وقت ہمارے ماموں صاحب کے قبضے میں ہے۔ وہاں وہ چھپے جس کے بعد حاجی بیگم صاحبہ نے خود باہر آکر فوجیوں کو اور اپنے آدمیوں کو بھی للکارا کہ میں عورت ہو کر باہر نکلوں مقابلے کیلئے؟

تو اُن لوگوں کو بھی ہمت ہوئی اور وہ بھی باہر نکل آئیں۔ لیکن وہ پردے میں رہتی تھیں اور جہاں جاتی تھیں پردے سے تلوار باہر کر دیا کرتی تھیں۔ پھر انہوں نے مقابلہ کیا اور برٹش فورس کو پسپا کر دیا۔"

یہ تھے سہسرام کے محمد عبدالقدیر خان۔ ہاں تو رامیشور سنگھ کشیپ صاحب ہر چند کہ کالج کے پرنسپل ہیں مگر رہتاس کے علاقے کی ثقافت سے انہیں بڑا لگاؤ ہے۔ ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھتے لکھتے انہوں نے لوہا سنگھ کا مزاحیہ کردار تخلیق کیا اور اس کی وہ دھوم مچی کہ خود رامیشور سنگھ جی کو شہر والے لوہا سنگھ کہتے ہیں۔ ڈرامے میں لوہا سنگھ کا کردار نہ صرف وہ لکھتے ہیں بلکہ خود ہی ادا بھی کرتے ہیں۔ اُس روز مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے رامیشور سنگھ جی سے پوچھا کہ اچھا فرض کیجئے میں جی ٹی روڈ پر بس سے اترا اور وہیں آپ کے لوہا سنگھ سے میری بھینٹ ہو گئی تو وہ اپنے مخصوص بھوجپوری لہجے میں کیا کہیں گے ؟

"وہ آپ سے پہلے تو گلے ملیں گے اور کہیں گے : آپ سے مِل کر کے ہمارا دل جو ہے بہوت کھوش ہوا۔ آپ تو میم اور میمن کا مُلک سے آتا ہے۔ ہم بھی اپنا زمانہ میں کابُل کا مورچا پر ہائی گلوٹی کا میم اور میمن کا ساتھ، سارجنٹ اور جرنیل کے ساتھ بسکٹ کا مربہ کھاتا تھا۔"

رامیشور سنگھ کشیپ جی سہسرام کے علاقے کے رسم و رواج، ناچ گانے اور شادی بیاہ کے بارے میں مجھے بتا رہے تھے۔ انہوں نے شادی کی ایک دلچسپ رسم کا حال مجھے بتایا۔ ایسی رسم جس کا حال خود انہیں بھی معلوم نہ تھا اور شاید کسی مرد کو معلوم نہیں :

"یہاں شادیوں میں ایک ڈومکچ ہوا کرتا ہے۔ تو اس میں عورتیں مردوں کو وہ ناٹک نہیں دیکھنے دیتیں۔ یعنی جب بارات چلی جاتی ہے تو عورتیں

وہ ڈراما کرتی ہیں اور اُس ڈرامے میں کچھ فحش باتیں بھی شاید ہوتی ہیں، یا یہ کہ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کو عورتیں بہت ہی چھپا کر اپنے تک محدود رکھتی ہیں۔ اور ایک آدھ بار میں نے بہت لوگوں سے خوشامد بھی کی کہ ہم کو تھوڑا سا ڈو پکج دیکھنے کو ملے تو ہم کو اس کی اجازت ملی نہیں۔"

سہسرام کے ایک اور بزرگ فصیح الدین صاحب نے بھی شادی بیاہ کی دلچسپ باتیں بتائیں۔ اس علاقے کے بھانڈ بہت مشہور تھے اور امیر امراء کی شادیوں میں بلائے جاتے تھے۔ ان کا ایک دلچسپ واقعہ فصیح الدین صاحب نے سنایا:

"ہوتا یہ تھا کہ امرا کے ہاں بھانڈ بلائے جاتے تھے۔ دو دو دن ناچ ہوتی رہتی تھی۔ اور کافی انعام و اکرام ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک صاحب حاضرِ مجلس تھے انہوں نے خوش ہو کر بھانڈوں کو اپنا دوشالا دے دیا انعام میں۔ تھا پرانا وہ۔ تو اب بھانڈوں نے اپنا نقل کرنا شروع کر دیا۔ کہا کہ اس میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ دوسرے کو بلایا۔ تیسرے کو بلایا۔ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ چوتھا آیا۔ اس نے کہا اچھا چشمہ لاؤ ہم پڑھ دیتے ہیں۔ لائے چشمہ۔ پڑھا گیا۔ سو اُس میں لکھا تھا: لا الٰہ الا اللہ۔ کہا کہ کچھ اور لکھا ہوگا۔ اَور لکھا ہوگا۔ اور لکھا ہوگا۔ دوسرے نے، تیسرے نے، پھر چوتھے نے پڑھا۔ کہا کہ نہیں اس کے بعد کچھ اور نہیں لکھا ہے۔ کہا کہ محمدؐ رسول اللہ نہیں لکھا ہے؟ کہا کہ نہیں یہ کیسے لکھا رہے گا۔ یہ تو انؐ کے وقت سے پہلے کا ہے۔ یہ عالم تھا بھانڈوں کی حاضر جوابی کا۔"

فصیح الدین صاحب پیشے کے اعتبار سے درزی ہیں لیکن شہر میں بہت معزز اور معتبر ہیں۔ سہسرام کے پرانے رسم و رواج کے بارے میں بتا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے زمانے میں یہاں صاحبِ حیثیت کس قسم کی پوشاکیں پہنتے تھے؟

„ اچکن، چپکن، شیروانیاں چلتی تھیں۔ بغیر شیروانی کے کوئی باہر نکلتا نہیں تھا۔ بغیر ٹوپی کے ننگے سر تو کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اوسط درجے کے لوگ بھی، شرفا۔ بھی بغیر ٹوپی کے تو بازار تو کیا محلے میں بھی نہیں نکلتے تھے۔ اب تو تہ بند باندھ کے نکل آتے ہیں۔ کوئی اصول ہی نہیں ہے۔ عجیب معاشرہ بگڑ گیا۔"

میں نے پوچھا "خواتین کا کیا ہوتا تھا۔ پردے میں بیٹھتی تھیں؟ گھروں میں رہتی تھیں یا نکلتی تھیں؟"

انہوں نے کہا "خواتین کا یہ عالم تھا کہ محلے میں بھی جانا ہوتا تھا، کسی عزیز کے ہاں یا پڑوس میں بھی۔ تو ڈولیاں ہوتی تھیں۔ ڈولی میں بیٹھ کے جاتی تھیں۔ کوئی بھی پیدل گھر سے باہر قدم نہیں نکلتا تھا خواتین کا۔ یہ عالم تھا۔ دوسرے محلے کی تو بات ہی چھوڑدیجیے کہ محلے میں پڑوس میں بھی جانا ہوتا تھا تو ڈولی ہی سے جانا ہے، پیدل جانے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔"

میں نے پوچھا "اچھا آپ کو یاد ہیں کچھ اب سے چالیس پینتالیس پچاس برس پہلے مشاعرے یا اس قسم کی محفلیں آپ کے شہر میں ہوتی تھیں؟"

کہنے لگے "ہاں۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ مشاعرے خاص طور سے ہوتے تھے۔ ہم نے بھی کئی مشاعرے کرائے تھے۔ خاص اہتمام سے ہوتے تھے۔"

میں نے پوچھا "آپ کے شہر میں کافی شاعر تھے یا باہر سے بھی آتے تھے؟"

وہ بولے "نہیں۔ یہیں کافی شاعر تھے۔ یہاں تو گلی گلی میں شاعر بھرے ہیں۔ یہاں کا عجیب عالم ہے۔ یہاں کی ٹھیکری بولتی ہے۔"

یہ سچ ہے کہ اس شہر کی ٹھیکری بھی بولتی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ بُرا نہیں بولتی۔ سہسرام والے اچھے شعر کہتے ہیں۔ وہ شاعری کی جدید روایتوں سے کٹے

ہوئے نہیں۔ اس کا احساس مجھے اس شام ایک شعری نشست میں ہوا۔ اور بنارس سے بھی پرے اچھے اچھے شعر سنے تو ویرانوں میں پھولوں کے کھلنے کا گمان ہوا۔

حکیم انیس الزماں صاحب کی قیام گاہ پر شعر کی محفل تھی اور سہسرام کے شاعر کیمور کے برساتی جھرنوں سے تان اور بودھ راہبوں کی گپھاؤں سے دھیان لے آئے تھے جن کی آمیزش ہوئی تو شعر ہوئے:

ہو جائیں ختم مجھ پہ ستم کاریاں تمام
اے وقت، انتظار نہیں چاہیئے مجھے
کانٹوں کی دوستی پہ مجھے ناز ہے ظفرؔ
پھولوں کا اعتبار نہیں چاہیئے مجھے

یہ تھے ظفر رضوی ظفر۔ ان کے بعد جناب عبد الرب نشترؔ صاحب نے شعر کی قدیم روایت کے رنگ میں اپنے دَور اور اپنے وقت کی بات کہی تو پرانی روایتوں پہ نیا نکھار آگیا:

کوئی نہیں ہے شہر میں دشمن میرا مگر
میرے ہی سر پہ آئے ہیں پتھر نئے نئے
اس شہرِ بے اماں میں نشترؔ نہیں ہے خیر
قاتل نئے نئے ہیں، ستم گر نئے نئے!

آخر میں شمع سہسرام کے بڑے شاعر جناب سیف سہسرامی کے سامنے پہنچی یہی سہسرام تو ہے جہاں بان بھٹ نے کادمبری لکھی تھی۔ یہ پھگوا، چیتیا، کجری اور بارہ ماسہ کی سرزمین ہے۔ بدلتے موسموں نے یہاں اشعار کو نئی نئی تانیں اور بدلتے وقتوں نے نئے نئے معنی عطا کئے ہیں۔ سیف سہسرامی کے شعر بھی یہ سارے حسن سمیٹے ہوئے تھے۔ ایسی محفلیں ایسے ہی اشعار پر ختم ہو جایا کرتی ہیں سو وہ نشست بھی یوں تمام ہوئی:

چہرہ ٹکڑوں میں بٹ گیا اپنا
آئینہ جب گرا دیا میں نے
چند لمحوں کی روشنی کے لئے
اپنے گھر کو جلا دیا میں نے
اُس نے ہاتھوں میں جب لیا پتھر
خود کو شیشہ بنا دیا میں نے

جہاں نور جہاں رہتی تھی

مَیں سہسرام سے کلکتے کی طرف روانہ ہوا تو میرے میزبانوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے بار بار قرآن کے نیچے سے گزاریں، داہنے بازو پر درجنوں امام ضامن باندھیں اور مجھ پر خدا جانے کتنی دعائیں دم کریں۔

"یہ سب کیوں ہے؟" مَیں پوچھے بغیر رہ نہ سکا۔

جواب ملا "آگے ڈاکو بہت ہیں۔ راستے میں جگہ جگہ ڈاکے پڑتے ہیں اور مسافر لُوٹے جاتے ہیں۔"

مَیں نے حیران ہو کر کہا "اِس زمانے میں؟۔ رہ زنی؟"

انہوں نے کہا "مگر جی ٹی روڈ پر رہ زنی بند کس زمانے میں ہوئی تھی؟"

ٹھیک کہا انہوں نے۔ مجھے یاد تھا کہ مغلوں کے زمانے میں بھی یہاں مسافر لٹا کرتے تھے۔ وہ ٹھگوں کا دَور تھا جب راہ گیروں کے گلے میں رومال کا پھندا ڈال کر انہیں مارا جاتا تھا۔ صدیوں کے اس پھیلاؤ میں صرف شیر شاہ کے پانچ برس سُکھ چین کے برس نظر آتے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ شیر شاہ کا زمانہ ایسا تھا کہ ایک بڑھیا راستے میں سونا اُچھالتی چلی جاتی تھی اور رہزن کا کھٹکا نہ تھا۔ پھر پچھلی صدی میں انگریزوں نے ٹھگوں کے گاؤں کے گاؤں پھانسی پر چڑھائے تو امن ہُوا مگر ادھر حکومت غافل ہوئی ادھر راہ گیر لٹنے لگے۔

بہار تو یوں بھی سدا کا بدنام ہے۔ یہیں تو کرنل ڈالٹن نے ۱۸۷۲ء میں لکھا تھا کہ ہزاری باغ کے علاقے میں اتنے زیادہ ڈکیت ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اور یہیں حکام نے تنگ آکر مجرموں سے ہمیشہ کے لئے نجات پانے کی خاطر اُن کی آنکھوں میں تیزاب چوانا شروع کر دیا تھا۔ یہ تو ابھی حال کی بات ہے۔ مگر ان لوگوں کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ بجلی کے تاروں سے لے کر آسمان کے تاروں تک ہر چیز لُوٹ لینا چاہتے تھے۔

تو یوں سہسرام سے آگے کا یہ سفرِ پُر خطر شروع ہوا۔ بس کے ڈرائیور نے موقع کی مناسبت سے اپنے لاؤڈ اسپیکر پر حسب حال گانا لگا دیا:

محبّت کی راہوں میں چلنا سنبھل کے

اور اب آگے کے شہروں کی داستان سُنئے جو سراسر مر کر جینے اور جی کر مرنے کی داستان ہے۔

شہر بھی ہماری طرح ہوتے ہیں۔ ان کی بھی تقدیر ہُوا کرتی ہے۔ وہ بھی اپنی قسمت ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر جی ٹی روڈ کو زندگی کی ریکھا مان لیا جائے تو برصغیر کی ہتھیلی سے اس کا یہ حصّہ ایک بار مٹ چکا ہے جس پر اب ہم رواں ہیں۔ اس کے کنارے آباد یہ شہر ایک بار مر چکے ہیں۔

اورنگ آباد، شیر گھاٹی، چوپارن، بارہ کھتا، بارھی، ڈمری۔ یہ سارے شہر جی ٹی روڈ کے دم سے تھے۔ اگر تاریخیں آپ کے لئے کوئی معنی رکھتی ہیں تو اس علاقے میں جی ٹی روڈ ۱۸۳۸ء میں مکمل ہوئی تھی۔ دس سال بعد کوئی ڈاکٹر ہوکر سورج کنڈ کے گرم پانی کے چشموں پر گئے تھے تو اُس وقت بارہ کھتا کا پُل بن رہا تھا۔

اُس وقت جرنیلی سڑک بے حد اہم تھی۔ انگریزوں نے کلکتے سے ریل گاڑی نکالی تھی جو ۱۲۱ میل چل کر رانی گنج پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد سارا کاروبار جی ٹی روڈ کے راستے چلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک یہی حال رہا۔ کابل پر چڑھائی ہویا اودھ یا دہلی پر، فوجیں

اِسی راستے دوڑائی جاتی تھیں۔ جگہ جگہ تھانے بنائے گئے تھے، گھوڑ سوار پولیس گشت کیا کرتی تھی۔ سارے راستے دوطرفہ بازار تھے، پڑاؤ تھے، سرائیں اور خیمہ گاہیں تھیں۔ مگر ۱۸۵۸ء میں ریل گاڑی چل پڑی اور اس دوڑ میں ہماری جرنیلی سڑک پیچھے رہ گئی۔ اس کے کنارے جو شہر آباد تھے وہ اُجڑنے لگے۔ اورنگ آباد کے بارے میں پرانی کتابوں میں لکھا ہے۔

"عرصہ ہُوا اس شہر کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اس میں کوئی عمارت قابلِ ذکر نہیں۔ ایک کچہری ہے، کچھ سرکاری دفتر ہیں، ایک سب جیل ہے جس میں پندرہ قیدیوں کی گنجائش ہے۔ ایک دواخانہ ہے، ایک ڈاک بنگلہ تھا وہ گر گیا ہے، تجارت اور کاروبار کوئی خاص نہیں۔"

یہ بہار کے پُرانے اورنگ آباد کا حال تھا۔ مگر خدا نے اس سڑک اور اس کے شہروں کے دن پھیرے۔ اس پورے خطے میں زمین نے معدنیات کی ایسی دولت اُگلی کہ کوئلے نے غریبی کی کالک مٹا دی اور لوہے نے تنگ دستی کی زنجیریں توڑ دیں۔ جی ٹی روڈ پر روزانہ لاکھوں ٹن مال اور ہزارہا مسافر اِدھر اُدھر آنے جانے لگے اور اورنگ آباد پھر سے آباد ہو گیا۔

اس کے بعد مُرہر دریا آتا ہے۔ اُسی کے کنارے مشہور شہر شیر گھاٹی ہے۔ ہو نہ ہو شیر شاہ کی نشانی ہے۔ اکبر نے شہروں کے نام بدلنے اور نئے نام رکھنے کا دستور بھی شیر شاہ سے سیکھا ہوگا۔ البتہ اس میں شیر شاہ کی خود پسندی کو زیادہ دخل تھا۔ وہ شہروں کے نام خود اپنے نام پر رکھتا تھا۔ دہلی کے پُرانے قلعے کی ایک عمارت کو اُس نے شیر منڈل کہا اور اس کے بڑے در پر ایک تصویر بنوائی جس میں ایک شخص کو شیر سے لڑتے ہوئے دکھایا گیا۔ بہار اور بنگال میں کم سے کم درجن بھر شیر پور اور شیر گڑھ اب بھی باقی ہیں۔

شیر گھاٹی بھی کسی زمانے میں جیتا جاگتا شہر تھا۔ یہاں کول راجاؤں کا قلعہ ہے جس کے پتھر کے ستونوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ شیشے کی طرح چمکا کرتے تھے۔ شیر گھاٹی پیتل، لکڑی اور لوہے کے کاریگروں سے آباد تھا۔ ضلع گیا کا سب ڈویژن تھا۔ شہر میں یورپین

آبادی بھی تھی جس کے بنگلے بہت عرصے موجود رہے، شاید اب بھی ہوں۔ شیر گھاٹی کے قبرستان میں برطانوی قبضے کے بالکل شروع کے دنوں کی یادگاریں آج تک ہیں۔

یہ علاقہ اتنا خوشحال تھا کہ دور دور کے جرائم پیشہ لوگ سمٹ کر اِدھر ہی آگئے تھے چنانچہ ۱۸۱۴ء میں یہاں خصوصی جوائنٹ مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تھا مگر پھر اس شہر کو ڈاکوؤں سے بڑھ کر ریل گاڑی نے مارا۔ ۱۸۵۸ء میں ٹرین چلی تو جی ٹی روڈ کی طرح شیر گھاٹی بھی اُجڑ گئی۔

لیکن وقت بدلا تو دریائے مُرہر کے کنارے یہ بستی پھر سے جی اُٹھی۔ میں پہنچا تو وہاں ایک دنیا آباد تھی، محلّے محلّے باراتیں چڑھ رہی تھیں اور بیاہ ہو رہے تھے۔

اسی جی ٹی روڈ پر بارھی ہے۔ اب تو یہ علاقے کوئلے اور معدنیات کی وجہ سے آباد ہیں۔ بارھی میں پہلے افیون کی کاشت ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۱ء تک چلا مگر اس کے بعد بند کر دیا گیا تو یہ نگر بھی پھر آباد نہ رہ سکا اور ہر طرف کھنڈر رہ گئے جن کے درمیان کرنل نی وَٹ کی قبر بھی تھی جو ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب دَور میں جی ٹی روڈ کا نگراں تھا۔ اپنوں کو پناہ دینا اور غیروں کو تباہ کرنا اس کا کام تھا۔ جنگجوؤں کی دیکھ بھال کرنے والا یہ فرنگی بالآخر امن اور شانتی کے پیغمبر گوتم بُدھ کی زمینوں میں دفن ہُوا۔

مجھے پتہ نہ چل سکا کہ بارھی میں کرنل صاحب کی قبر اب بھی موجود ہے یا نہیں البتہ یہ ضرور پتہ چلا کہ یہ شہر بھی اب جی اُٹھا ہے۔ رونقوں نے دوبارہ اس طرف کا رُخ کیا ہے۔

اس پورے علاقے میں اب زندہ زمینوں کے سینے میں دھڑکتا ہُوا دل صاف سُنائی دیتا ہے۔ یہاں سڑک سے کبھی گیا کے نشیبی میدان نظر آتے ہیں، کبھی یہ شاہراہ پرس ناتھ کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بے شمار یاتری مدھوبن کی طرف چلے جا رہے ہیں، اور اونچے سرسبز پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر چڑھتی ہُوئی ان کی قطاریں دُور سے نظر آ رہی ہیں۔

کہیں سورج کنڈ کے چشموں کی نشانیاں ہیں جہاں کھولتا ہوا پانی اُبلتا ہے۔ کہیں صاف پتہ چلتا ہے کہ جنوب میں کہیں دُور ہزاری باغ ہے اور کہیں پاس ہی دھنباد ہے۔ راستے بھر دریا ہی دریا، نہریں ہی نہریں، دریائی بند، بڑی بڑی جھیلیں، پن بجلی گھر، کارخانے، چمنیاں، مال گاڑیوں کی پٹریاں، دولت، فراوانی اور کیا نہیں ؟

مگر عام لوگ اب بھی غریب ہیں۔ پریشان حال لوگ اور فاقہ زدہ بچے اب بھی نظر آتے ہیں۔ راہ میں راتوں کو پڑاؤ ڈالنے والے ٹرک ڈرائیوروں کے لئے نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے بدن اب بھی فروخت ہوتے ہیں۔ افراط کی اس سرزمین سے تنگ آکر نوکریوں کی تلاش میں لوگ آج بھی کلکتے جا رہے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے ؟

شاید پُرانے ٹھگ البتہ نئی صورتیں۔

یہی دیکھتے دیکھتے خدا جانے کب بہار پیچھے چھوٹا اور منظر بدل گیا۔ کھیت زیادہ ہرے ہو گئے۔ فضا میں پھوہار نے زیادہ دھند بھر دی، تالابوں کے پانی کو ہری بیلوں نے ڈھانپ لیا اور کیلے کے جھنڈ زیادہ گھنے ہو گئے۔

یہ بنگال تھا۔

بنگال کے آجانے کی تصدیق اُس وقت ہُوئی جب آسنسول آیا۔ ہر طرف لوہے اور فولاد کے کارخانے، ریلوے انجن بنانے کا کارخانہ چترنجن یا درگاپور تک صنعت کا یہی عالم تھا اس علاقے کی زمینیں کوئلے سے بھری پڑی ہیں جس کا علم ۱۸۰۰ئہ میں ہو گیا تھا۔ رانی گنج، جھریا، گریدیہہ، بوکارو، رام گڑھ اور ڈالٹن گنج میں کانیں کوئلے سے مالامال ہیں۔

اس کے بعد بنگال کا اور تاریخ کا مشہور شہر بردوان ہے۔ مجھے بردوان کی ایک جھلک دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ یہاں نورجہاں رہتی تھی۔ یہیں شیر افگن رہتا تھا۔ یہیں شیر افگن کا قتل ہُوا تھا۔ یہیں اپنے دَور کی سب سے خوش شکل اور ہونہار خاتون کی قسمت میں ہندوستان

کے فرماں روا جہانگیر کی بیوی بننا لکھا تھا۔

کہتے ہیں کہ بردوان کے ریلوے اسٹیشن کے قریب وہ جگہ موجود ہے جہاں شیر افگن مارا گیا تھا اور جہاں مرنے سے پہلے اُس کے قاتل یعنی جہانگیر کے دودھ شریک بھائی قطب الدین کو بھی مارا گیا تھا۔ شہر میں دونوں کی قبریں بھی ہیں۔

یہیں حضرت بہرام شاہ دفن ہیں جو بہرام سقّہ کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ مکّہ اور نجف کی گلیوں میں راہ گیروں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ۹۷۰ھ میں ان کی وفات ہوئی یہیں حضرت انوار شاہ کا مزار ہے۔ وہ ۱۱۲۶ھ میں لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ اسی بردوان پر شہزادہ خرم نے قبضہ کیا تھا۔ پھر سوبھا سنگھ نے بغاوت کرکے یہ شہر چھین لیا تھا لیکن اس جنگجو باغی کے سینے میں راجا بردوان کی بیٹی نے اپنی عفت بچانے کی خاطر خنجر اُتار دیا تھا یہیں نواب ہاٹ میں شیولنگم کے ایک سو آٹھ مندر ہیں اور اسٹار آف انڈیا کا وہ مشہور دروازہ ہے جو لارڈ کرزن کی آمد کے موقع پر بنوایا گیا تھا۔ اسی کے قریب شانتی نکیتن ہے۔

اسی بردوان میں ۱۸۶۳ئہ میں وہ قیامت کا بخار پھیلا تھا کہ جس نے گھر کے گھر خالی کر دیئے۔ اُس کے بعد سے آج تک بیماریوں نے اس شہر کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

سچ ہے۔ شہر بھی ہماری طرح ہوتے ہیں۔ عشق سے لے کر بخار تک ہر بلا میں وہ بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے بھی دل تیز دھڑکتے ہیں۔ ان کی بھی نبض تیز چلتی ہے۔ میں یہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ شہر آ گیا جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اس کا دمِ آخر ہے۔ آج نہیں تو کل، اس کا چل چلاؤ قریب ہے۔

کلکتہ !!

دم توڑتا ہُوا شہر

پشاور سے کلکتے تک جی ٹی روڈ کا سفر پورا کرنے کے لیے جس روز میں ہندوستان پہنچا۔
اُسی دن اخباروں میں وزیر اعظم راجیو گاندھی کا ایک بیان چھپا:

"کلکتہ مر رہا ہے"

اپنی آخری منزل کے بارے میں یہ سُرخی پڑھی تو میرا رنگ اُڑ گیا۔ تو کیا مجھے ایک مرتے ہوئے دم توڑتے ہوئے شہر کو جانا ہوگا۔ کیا پھر وہی لاشوں سے اَٹی ہوئی سڑکیں، گردنیں ڈالے ہُوئے کتے اور موت کے سناٹے میں شور مچاتے کوّے دیکھنے ہوں گے؟ بنگال کے قحط کی ساری تصویریں میرے سامنے آئینہ سا بن گئیں۔

بالآخر میں کلکتہ پہنچا۔

کیسا شہر تھا وہ۔ کلکتہ انسانوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس کی رگوں میں انسان دوڑ رہے تھے، اس کی سانسوں میں انسان آ رہے تھے جا رہے تھے، اس کی نبضوں میں انسان چل رہے تھے، اس کے سینے میں انسان دھڑک رہے تھے۔

اُس روز کلکتہ مجھے اَن گنت بچّوں کی ماں جیسا لگا۔ ماں جو نقاہت کے مارے پُرانی چٹائی پر یوں لیٹ رہی ہو جیسے اب کبھی نہیں اُٹھ سکے گی۔ ماں جس کے بچّے اس کی چھاتیوں سے چمٹے دودھ کے بچے کھچے قطرے نچوڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ سوکھے سوکھے ہاتھ

پیروں اور پھولے ہُوئے پیٹوں والے کالے کالے بچے جن کے بدن پر اُس تعویذ کی ڈوری کے سوا کچھ نہیں جو ماں نے کبھی ڈالا تھا کہ انہیں زمانے کی نظر نہ لگے۔

دریا کیچڑے پٹ گئے تھے، بستیاں پناہ گزینوں سے اَٹ گئی تھیں۔ جیسے دل کو جانے والی رگیں بند ہونے لگی ہوں اور جیسے جراحت کا کوئی سامان نہ ہو۔ جیسے شام ڈھلے دکان کے پٹ بند ہونے لگے ہوں لیکن خریدار مال مال کا شور مچا رہے ہوں۔ کلکتہ خود بے دم ہو چلا تھا مگر سوا کروڑ انسانوں کو زندگی عطا کر رہا تھا،

پھر وہی نقاہت کی ماری ہوئی ماں،

پھر وہی چھاتیوں سے چمٹے ہُوئے بچے،

یہ تھا کلکتے کا منظر!

یہ کون لوگ ہیں جن سے کلکتے کی آبادی ہے۔ دُنیا کے اس پانچویں سب سے بڑے شہر میں یہ اتنے بہت سے لوگ کب آئے، کیوں آئے؟

یہ بات میں نے مغربی بنگال کی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کلیم الدین شمسی صاحب سے پوچھی۔ انہوں نے کہا:

"کلکتہ مشرقی ہند میں واحد صنعتی اور ساحلی شہر ہے۔ ملک کے دوسرے علاقوں میں نوجوان جب روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا تو آخر کلکتے آتے ہیں اور ملازمت کی کوشش کرتے ہیں تاکہ گزارہ کر سکیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس شہر میں خود کلکتے کے باشندوں کی آبادی کم ہے۔ یہاں مقامی آبادی صرف چالیس فی صد ہے، باقی بہار، یوپی، مہاراشٹر، اڑیسہ، آسام، ناگالینڈ، میزورام، نیپال، ہر علاقے کے لوگ آباد ہیں۔ یہ ایسا شہر ہے جس میں آنے کے تو بے شمار دروازے ہیں، جانے کا دروازہ نہیں۔ کلکتہ صحیح معنوں میں غریب پرور شہر ہے:

یہ تھے کلیم الدین شمسی صاحب۔

کلکتے کو انگریزوں نے بسایا تھا۔ یہ بات ۱۶۹۰ء کی ہے۔ کچھ روز میں یہ شہر تین سو سال پُرانا ہو جائے گا۔ انگریزوں نے اسے اپنا صدر مقام بنایا اور اتنی ترقی دی کہ یہ محلوں کا شہر کہلایا جانے لگا۔ ایک وقت تھا، جب کہتے تھے کہ سرکار انگلیشیہ میں بس دو بڑے شہر ہیں، ایک لندن دوسرا کلکتہ۔ کلکتے کا ڈلہوزی اسکوئر تو آج بھی وکٹورین یورپین شہر کہلاتا ہے۔

یہی باتیں سُن کر یورپی شہروں کے سیاح بڑی للک کے ساتھ کلکتے پہنچ جاتے ہیں اور مشہور ہے کہ شہر کی حالت دیکھ کر اگلے ہی روز سر پر پاؤں رکھ کر واپس بھاگتے ہیں۔

مَیں سیاحوں کی جس بس میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو نکلا اُس میں اگر کسی شخص کو غیر ملکی کہا جا سکتا تھا تو وہ مَیں تھا۔ باقی سب ہندوستانی تھے۔ ہمارا گائیڈ بنگالی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا: "وہ سامنے جو سفید عمارت ہے وہ بڑا ڈاک خانہ جی پی او ہے۔ یہ رائٹرز بلڈنگ ہے، کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے رائٹرز یعنی کلرکوں کی قیام گاہ تھی، اب بنگال سرکار کا دفتر ہے جو بابوؤں اور فائلوں سے بھرا پڑا ہے، اُس طرف کلکتہ میڈیکل کالج ہے، ملک کا سب سے پُرانا میڈیکل کالج جو ۱۸۳۵ء میں قائم ہُوا تھا، یہ وکٹوریہ میموریل ہے، بڑے محل جیسی اس عمارت کے گنبد کے اوپر لگا ہُوا امر کیوری کا مجسمہ اَب دوبارہ اپنے دُھرے پر گھومنے لگا ہے۔ اس کے سامنے میدان ہے، ایک ہزار دو سو اسّی ایکڑ۔"

پھر گائیڈ نے کہا: وہ دُور فورٹ ولیم ہے۔

فورٹ ولیم کا نام سُنتے ہی مَیں اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ آج کی سیدھی سادی سلیس اُردو یہاں پیدا ہُوئی تھی۔ مَیں نے اُس عمارت کو سلام کرنا چاہا مگر ہاتھ پیشانی تک نہ جا سکا۔ شہر والوں کا مطالبہ ہے کہ فورٹ ولیم کا نام بدل کر سراج الدولہ کے نام پر رکھا جائے۔ کاش ایسا ہو جائے تاکہ مَیں دوبارہ آؤں تو ہاتھ پیشانی تک لے جا سکوں۔

سیاحوں کی بس چلتی رہی۔ عمارتیں آتی گئیں، جاتی گئیں۔ دوہرے دوہرے ستونوں کی

تین تین منزلہ عمارتیں، محرابی دروازے اور کھڑکیاں، سامنے چھجّے اور کٹہرے، اوپر گنبد۔ سڑکوں پر دورویہ دکانیں، ان کے سامنے برآمدے۔ لوگ سڑک کنارے بیٹھے شیو بنوا رہے ہیں، گنّے اور بیل کا رَس اور ناریل کا پانی پی رہے ہیں، پتھر کی سیڑھیوں پر سو رہے ہیں، بچّے کوڑا کرکٹ چُن رہے ہیں۔ نلکے پر مرد نہا رہے ہیں اور عورتیں بال دھو رہی ہیں، بچوں کو دُودھ پلا رہی ہیں اور کنستر بھر کر پانی گھر لے جا رہی ہیں۔ بسوں اور ٹراموں سے مسافر لٹکے پڑ رہے ہیں اور دنیا زمانے سے بے نیاز گائیں اور بیل سڑک کے بیچوں بیچ دراز ہیں اور محوِ استراحت ہیں۔ سامنے سینکڑوں ستونوں کا جنگل سا کھڑا ہے جس کے اوپر پانی کا اتنا بڑا ٹینک ہے جس کی چھت پر فٹ بال کا میدان بن سکتا ہے۔ اس میں چھ کروڑ گیلن پانی سما سکتا ہے۔

جہاں کلکتہ کارپوریشن کا علاقہ ختم ہوتا ہے وہاں سائیکل رکشاؤں کا ہجوم ہے، یہ رکشا شہر کے اندر لانے کی اجازت نہیں۔

یہاں قدم قدم پر تالاب اور جوہڑ ہیں جن میں پانی کے اوپر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سبز بیلیں ایسے پھیلی ہیں کہ پانی کہیں نظر نہیں آتا۔ پورے بنگال میں سارے تالابوں کو اِن ہری بیلوں نے ڈھانپ لیا ہے۔ یہ بیلیں کہاں سے چلی آئیں؟ کہتے ہیں کہ کمپنی بہادر کے دور میں ماریا نام کی کوئی لڑکی برازیل سے اپنے ساتھ ان کی چھوٹی سی شاخ لے آئی تھی۔ یہ اُسی کی نسل ہے۔ لڑکی کی نہیں، شاخ کی۔ اب ان بیلوں کو سُکھا کر ان کی کھاد بناتے ہیں۔

راہ میں جین دھرم کا شیتل ناتھ جی کا مندر ہے جو سرکار انگلیشیہ کے درباری جوہری نے بنوایا تھا۔ اس پر سنگِ مرمر کی سو سال سے زیادہ پُرانی تختی لگی ہے جس پر نہایت خوش خط اُردو میں لکھا ہے: "سری مندر جی و باغ، تعمیر کردہ و منصوبہ رائے بدری داس بہادر، لاٹ صاحب، گورنمنٹ کے کورٹ جویلر ۱۲۸۳ھ" یعنی سنہ اٹھارہ سو سٹرسٹھ عیسوی۔

ایسا دلکش باغ، ایسی دل فریب عمارت کہ اُسے کلکتے کا تاج محل کہتے۔ اندر چھتوں پر جو فانوس آویزاں ہیں وہ چین، اٹلی اور بلجیم سے لائے گئے تھے۔ سارا باغ اور تمام عمارت اتنی صاف ستھری ہے کہ ذہن کچھ دیر کو دلّی اور فتح پور سیکری کی مسجدیں بھول گیا جن کی دیواریں، جہاں تک انسان کا قد جاتا ہے وہاں تک چکّٹ ہو چکی ہیں۔

مندر کے اندر سنگِ مرمر کے ایک صاف شفاف طاق میں ایک سو اٹھارہ سال سے ایک چراغ جل رہا تھا اور طاق کے اندر دھویں کی کالک کا ایک ریزہ تک نہیں تھا۔ دعوےٰ ہے کہ وہ چراغ ایک روز بھی نہیں بجھا۔ یہ دعویٰ ٹھیک ہی ہوگا۔ مندر کا چراغ جو ہُوا۔

مندر کے اندر پجاری اپنی ناکوں پر رومال باندھے بیٹھے تھے تاکہ ہَوا کے ساتھ کوئی ننھا منّا کیڑا ان کی سانس کی لپیٹ میں آکر مر نہ جائے۔ اس دَور کے انسان سے یہ کیڑے اچھے۔

مندر کے باہر فٹ پاتھ پر سونے والے کتنے ہی بچّوں کے جگر بڑھ گئے تھے، بانہیں اور ٹانگیں سوکھ گئی تھیں، پیٹ باہر کو نکل آئے تھے، کھال سوکھ کر اُتر رہی تھی، بینائی جا رہی تھی اور وہ موت کے فرشتے کی سانسوں کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔

ایک مدر ٹیریسا ہیں جو گندی نالیوں میں دم توڑتے بچّوں کو اُٹھا اُٹھا کر لا رہی ہیں اور انہیں مرنے سے بچا رہی ہیں۔ نیلی کناری کی سوتی ساڑی میں ملبوس، البانوی نسل کی یہ خاتون ٹمٹماتی شمعوں کی روشنی میں کسی مصلوب مسیحا سے گڑگڑا کر ادھ موئے بچّوں کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ اپنے بوڑھے ہاتھوں سے چادر اُڑھا کر، کانپتی انگلیوں سے بچّوں کی آنکھیں بند کر کے انہیں تھپکتے ہُوئے کہہ رہی ہیں: اب سو جاؤ۔

کوڑے کے ڈھیر پر پھینکے جانے والے بچّوں کو اس سے پہلے یہ راحت کب نصیب ہوئی ہوگی۔

ہمارا اگلا پڑاؤ دریا کنارے کالی دیوی کا مندر ہے جو زائرین سے بھرا پڑا ہے۔ علاقے کے غریب بچّے بھی اندر آ گئے ہیں اور ایک ایک سے خیرات مانگ رہے ہیں۔ میرے سوا

کسی نے کسی کو پیسہ نہیں دیا ہے۔ کوئی وکیل بڑا مقدمہ جیت گئے ہیں۔ انہوں نے بکری کے بچّے کی قربانی دی ہے۔ چھرے کے ایک ہی وار سے بچّے کی گردن دُور جا گری ہے۔ بھیک مانگنے والے بچّے سہم کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ مندر میں شور ہے۔ یاتریوں کے جوتوں کی دیکھ بھال کرنے والوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے کیونکہ زیادہ تر یاتری اپنے جوتے سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی کے پاس رکھوا رہے ہیں۔ ان سب سے بے نیاز کوئی پجاری دیوی کے ہیبت ناک مجسمے کے مقابل بیٹھا، آنکھیں موندے اپنے پربھو کے گن گائے جا رہا ہے۔ بس کبھی کبھی آنکھ کھولتا ہے، بھیک مانگنے والی ایک چھوٹی سی لڑکی کو ڈانٹتا ہے اور پھر گانے لگتا ہے۔ لڑکی ڈر کر پیچھے ہٹتی ہے، گلے میں پڑی ہوئی کالی ڈوری کو اپنی اُنگلی پہ دو چار بار بل دیتی ہے اور پھر خیرات مانگنے لگتی ہے۔

یہ تو ہوئی کلکتے کے مندروں کی بات۔

اَب میں کلکتے کی مشہور مسجد دیکھنے چلا۔ مسجد ناخُدا۔

میرے میزبان اور رہبر طاہر ایاز صاحب تھے۔ کیننگ اسٹریٹ پر اُن کا کل پرزوں کا کاروبار ہے۔ کہنے لگے کہ زکریا اسٹریٹ رکشا پر چلیں گے۔ مگر شہر کے اندر تو رکشا چلانے کی اجازت نہیں۔ تب پتہ چلا کہ سڑکوں پر جو رکشا انسان کھینچا کرتے تھے کلکتے میں وہ اب بھی چلتی ہیں۔ ان کے بہت بڑے بڑے پہیے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بارشوں میں جب سڑکیں دریا بن جائیں اور پانی رکشا کھینچنے والے کی سوکھی سوکھی ٹانگوں سے بھی اونچا ہو کر اس کے دھنسے ہوئے پیٹ تک آ جائے، اس کی رکشا کے مسافر پانی کی زد سے محفوظ رہیں۔

رکشا والے نے دو روپے مانگے۔ طاہر ایاز صاحب نے ڈیڑھ روپے پر اصرار کیا۔ مَیں نے ان کے کان میں کہا کہ دو روپے ہی ٹھیک رہیں گے۔ کہنے لگے، نہیں ان لوگوں کا بھاؤ نہ بگاڑیئے۔ آخر وہی ہُوا جو ہونا تھا، رکشا والا مان گیا اور ہم دونوں کا بوجھ کھینچنے لگا۔ رکشا دوڑاتا ہُوا وہ زکریا اسٹریٹ جا پہنچا۔ ہر طرف ایک رونق تھی۔ ہوٹلوں میں قوالیوں

اور غزلوں کے ریکارڈ اور قورمے کے دیگ بج رہے تھے۔ لوگ بیٹھے اُردو اخبار پڑھ رہے تھے۔ پنواڑی اپنے گاہکوں کو شعر سُنا رہے تھے اور ایک حویلی کی دہلیز کے قریب گیارہ بارہ سال کا ایک لڑکا سرِ شام ہی ایک میلی سی چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟" مَیں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے سر سے چادر ہٹائی، مجھے غور سے دیکھا اور دوبارہ اوڑھ لی۔

زکریا اسٹریٹ پر مسجد ناخدا کی عمارت نہایت شاندار ہے۔ دو منزلہ صاف ستھری مسجد ہے، وضو کے لئے پانی کے فوارے، جُوتے قرینے سے رکھنے کا بندوبست، ہر طرف چھڑکاؤ، نمازوں اور عبادتوں کا عمدہ انتظام۔

طاہر ایاز صاحب مجھے اوپر پیش امام صاحب کی نشست گاہ میں لے گئے۔ ان کا نام محمد صابر صاحب تھا۔ چہرے بشرے سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، باتوں میں بلا کی لطافت، اپنے وقت اور اپنے دَور کے حالات و معاملات سے باخبر۔

وہ مجھے مسجد کے بارے میں بتا رہے تھے۔ مَیں نے مولانا محمد صابر صاحب سے پوچھا کہ مشرقی ہندوستان کے اس گوشے میں، آپ کے ہاں نماز کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ وہ بتانے لگے:

"مغرب میں نمازی کثرت سے آتے ہیں۔ ظہر میں بھی ان کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ دوسری نمازوں میں چار پانچ صفیں بھر جاتی ہیں۔ نمازِ جمعہ کی کیفیت جُدا ہوتی ہے۔ ٹھیک بارہ بجے اذان ہو جاتی ہے۔ سوا بارہ بجے خطبہ ہوتا ہے۔ حافظ مطیع اللہ آ کر امام کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک عصا امام کو دی جاتی ہے۔ اب وہ منبر پر بیٹھتے ہیں اور پندرہ منٹ خطبہ ہوتا ہے۔ پھر نماز، جو مختصر پڑھی جاتی ہے۔ ہم نمازِ جمعہ کو طول نہیں دیتے کیونکہ لوگ صبح دس بجے سے آ کر صفوں میں بیٹھ چکے ہوتے ہیں۔ ان میں بیمار اور ضعیف بھی ہوتے

ہیں، اس لئے خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ نماز مختصر پڑھائی جائے۔ ہر نمازِ جمعہ میں پینتیس چالیس ہزار لوگ آجاتے ہیں اور رمضان کے ہر جمعہ پر، عیدین پر اور جمعۃ الوداع پر اتنی کثیر جماعت مشرقی ہندوستان میں شاید کہیں نہ ہوتی ہو۔ محمد علی پارک تک لوگ بھر جاتے ہیں اور گلیوں میں بھی جماعت کھڑی ہوتی ہے۔"

مولانا محمد صابر صاحب کی باتوں سے جی خوش ہوا۔ خدا کے گھر سے ہم بہت مسرور نکلے۔ راہ میں دیکھا، حویلی کی دہلیز کے قریب وہی چھوٹا سا لڑکا میلی سی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ میں نے اس کے قریب رُک کر دوبارہ پوچھا "تمہارا کوئی گھر نہیں ہے ؟"

اس بار اُس نے چادر سرکا کر مجھے نہیں دیکھا۔ اس بار وہ سوچ چکا تھا۔ شاید۔

پانی گلے گلے آپہنچا

لیجئے۔

میرا جرنیلی سڑک کا ڈیڑھ ہزار میل کا سفر تمام ہُوا۔

سیّاحوں کی بس میں بیٹھا مَیں کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن، یعنی پھول پودوں کے عجائب گھر سے واپس شہر کی طرف لَوٹ رہا ہوں۔ اس باغ کے صدر دروازے کے سامنے جی ٹی روڈ ختم ہو جاتی ہے۔

مَیں نے وہاں ایک صاحب سے پوچھا: کیوں صاحب! کیا جی ٹی روڈ اس جگہ ختم ہوتی ہے؟۔ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولے: ختم نہیں ہوتی۔ جی ٹی روڈ یہاں سے شروع ہو کر پشاور تک جاتی ہے۔

خوب ہے یہ بھی۔ شمال والوں کو بتایا گیا کہ جی ٹی روڈ پشاور سے شروع ہو کر کلکتے تک جاتی ہے اور کلکتے والوں کو بتایا گیا کہ یہاں سے شروع ہو کر پشاور تک جاتی ہے۔

لُوٹنے والوں نے دونوں دنیاؤں کے ثواب لُوٹ لئے۔

یہ سڑک ہاوڑا کے پُل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ ٹوٹی پھُوٹی، خستہ، بدحال! دونوں طرف فیکٹریاں، کارخانے، ورک شاپ، گودام، لوہا لاٹھ، کاٹھ کباڑ — اور درمیان میں ہماری جی ٹی روڈ۔

راہ میں انگریزوں کے زمانے کے بنگلے نظر آ رہے ہیں۔ بڑے بڑے برآمدوں، غلام گردشوں اور صحنوں والے بنگلے، جنہیں اونچے اونچے گول ستونوں پر اُٹھایا گیا تھا۔ اب ان ستونوں کا پلاسٹر اُکھڑ چکا ہے اور اندر کی وہ گول اینٹیں نظر آ رہی ہیں جو اِن ستونوں کیلئے خاص طور پر پکائی جاتی ہوں گی۔

میں نے ایک ایسا بنگلہ دیکھا ہے جو کبھی محل جیسا رہا ہوگا۔ اس کے ستونوں کے سائے میں ایک خاتون کا نہایت دل کش مجسمہ آج تک کھڑا ہے جنہوں نے اپنے بال سمیٹ کر جوڑا سا بنا لیا ہے۔ ایک ہاتھ میں سیب ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ جو تھوڑا سا لباس تھا، اُسے سنبھال رکھا ہے۔

اس کی چاروں طرف گائیں بندھی ہیں، بچھڑے کھڑے ہیں، مرغیاں دانہ دُنکا چن رہی ہیں اور مجسّمے کی ٹانگوں کے قریب ایک بلی اونگھ رہی ہے۔

میری بس چلی جا رہی ہے۔ نہایت گنجان آباد علاقہ ہے۔ سڑک پر ہر قسم کا ہجوم ہے۔ اپنا راستہ بنانے کے لئے موٹر گاڑیاں اگر ہارن بجائیں تو کلکتے میں بھونچال آجائے لہٰذا ہماری بس کا کنڈکٹر اگلے دروازے سے باہر جھانک رہا ہے اور ایک ہاتھ سے اپنی بس کے اگلے حصّے کو پیٹ رہا ہے۔ راہ گیر راستہ دے رہے ہیں۔ گائے بیل بُرا سا منہ بنا کر اُٹھ گئے ہیں۔

اب دونوں طرف اینٹوں کے مکان آ گئے ہیں جن پر سفیدی پوت کر الیکشن کے اشتہار لکھے گئے ہیں "دیپتر نجن بالو کو ووٹ دیجئے"۔ انہیں ووٹ دینے میں کیسے کیسے فائدے ہیں۔ یہ سب اُردو میں لکھا ہے۔ دکانوں کے، خصوصاً عطائی ڈاکٹروں اور طبیبوں کے سائن بورڈ اُردو میں ہیں۔ لوگوں کے ہاتھوں میں اُردو اخبار نظر آ رہے ہیں اور کیوں نہ آئیں۔ اِسی کلکتے میں اُردو کا پہلا قاعدہ چھاپا گیا تھا۔ یہیں قرآن کا پہلا ترجمہ شائع ہوا تھا، یہیں کلیاتِ میر اور باغ و بہار پہلے پہل چھپے تھے، یہیں سے اُردو کا پہلا اخبار جامِ جہاں نما

نکلا تھا۔

سامنے ہاوڑا جنکشن نظر آنے لگا۔ پورے ہندوستان کا سب سے بڑا آخری اسٹیشن۔ آج منگل ہے اور اسٹیشن کے سامنے منگل ہاٹ لگی ہے، یعنی منگل کے منگل لگنے والا وہ بڑا بازار جس میں خریداری کے لئے سارے مشرقی ہندوستان کے چھوٹے بڑے دکان دار کلکتے آتے ہیں اور ہر منگل کو لاکھوں سلے سلائے کپڑے، لنگیاں، پلاسٹک کی چیزیں، بناؤ سنگھار کا سامان، جوتے اور کھلونے اپنی دکانوں کے لئے لے جاتے ہیں۔

اور وہ سامنے ہاوڑا کا پُل ہے۔ یہاں سے روزانہ پانچ لاکھ ملازم اور کاروباری لوگ دریائے ہگلی پار کر کے کام پر جاتے ہیں اور پھر گھروں کو لوٹتے ہیں۔ اس پر بسیں بھی چل رہی ہیں، کاریں اور ٹرک بھی اور ٹرامیں بھی۔ لیکن سب سے زیادہ ہجوم پیدل چلنے والوں کا ہے۔

نیچے دریائے ہگلی بہہ رہا ہے۔ اسی دریا پر کلکتے کی بندرگاہ ہے جو اب مرحوم ہوا چاہتی ہے۔ کہتے ہیں، خدا جانے سچ ہے یا نہیں، کہ اس بندرگاہ کی خاطر دریا کی تہہ سے مٹی نکالی جاتی تھی، اب چالیس سال سے وہ مٹی نہیں نکالی گئی ہے۔ ادھر شمال میں فرخا بیراج بن گیا ہے لہٰذا پانی کا وہ ریلا آنا بند ہوگیا جو دریا کی مٹی بہائے جاتا تھا۔ اب دریا کیچڑ سے بھر گیا ہے اور کلکتے کی بندرگاہ کا حال اُس شخص جیسا ہے جس کا گلا بھی گھٹ رہا ہو اور دم بھی۔ اس کی جگہ جنوب میں ہلدیا کی نئی بندرگاہ بنائی جا رہی ہے جس کا حال آگے چل کر شہر والوں سے پوچھیں گے۔

مگر کلکتے کا اب جو حال ہے اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ کبھی دنیا بھر کے سمندری جہاز آکر یہاں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ امریکہ سے جہاز سنگترے لے کر آتے تھے تو شہر بھر کے بنگلوں کوٹھیوں کے خانساماں، آیائیں اور نوکر بندرگاہ پر دھاوا بول دیا کرتے تھے۔ سنگترے خریدنے کے لئے نہیں۔ وہ برف خریدنے کے لئے جس میں لگ کر یہ سنگترے امریکہ سے آتے تھے۔

یہی تو وہ کلکتہ ہے جہاں واجد علی شاہ نے مٹیا برُج میں رہ کر دوسرا لکھنؤ بسایا تھا اور گومتی کی اعلیٰ تہذیب یہاں ہُگلی کے کنارے پروان چڑھی تھی۔

وہ سب ختم ہُوا۔ کہنے والے تو مُصر ہیں کہ خود کلکتہ ختم ہو رہا ہے۔

مَیں نے سوچا کہ چل کر خود شہر والوں سے پوچھا جائے۔

احمد سعید ملیح آبادی صاحب کلکتے کے اُردو روزنامے 'آزاد ہند' کے ایڈیٹر ہیں۔ مَیں ان سے ملنے گیا تو ان کے دفتر میں کلکتے کے اُردو اخباروں کی فائل دیکھنے لگا۔ مَیں نے خبریں پڑھیں، تصویریں دیکھیں اور اشتہاروں کا بھی مطالعہ کر ڈالا۔ ذرا دیر میں ایک علاقے کے باشندوں، ان کے معاملوں، مسئلوں اور ان کے اندازِ فکر کی شکل میرے ذہن میں اُبھرنے لگی۔ اِدھر اُدھر کچھ ایسی تحریریں بکھری نظر آئیں:

—— گارڈن ریچ اور مٹیا برُج کے علاقے میں کوئی ہسپتال نہیں۔ ۱۹۶۲ء سے مطالبہ چل رہا ہے۔ بہت وعدے بھی ہوئے۔ لوگوں نے پوسٹ کارڈ مہم بھی چلائی اور بنگال سرکار کو ہزاروں خط لکھے۔ ڈاک خانے کا تو فائدہ ہو گیا مگر ہسپتال ندارد۔ گارڈن ریچ میں آپ کو قبرستان تو ضرور ملے گا، ہسپتال نہیں ملے گا۔

—— کلکتہ یونیورسٹی کی اقبال چیئر خالی پڑی ہے۔

—— قرآن مجید کو دنیاوی عدالتوں میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں دائر مقدمے میں حکومت مغربی بنگال کا جواب۔

—— چاندنی چوک سے شبراتی ٹرک —— باشندگان چاندنی چوک اسٹریٹ کی خدمت کے لئے چاندنی ینگ بوائز فورم نے ٹرک کا انتظام کیا ہے تاکہ لوگ شب برات کے موقع پر قبرستانوں میں جا کر فاتحہ خوانی کر سکیں۔ ٹرک چاندنی چوک مسجد سے روانہ ہوگا۔

—— قومی ہوزری کے برُقعے۔ حیا، فیشن اور وقار کا مجموعہ۔ گنجی، موزے اور ہر قسم کے ریڈی میڈ کپڑوں کے علاوہ اب برقعوں کی خریداری بھی آپ کی تشفی اور

اطمینان کی ضامن ۔

روزنامہ 'آزاد ہند' کا دفتر صاف ستھرا اور جدید ہے۔ اس کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی صاحب خوش اخلاق، ملنسار اور معاملہ فہم ہیں۔ مَیں نے اُن سے پوچھا کہ کلکتے کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے :

"کلکتہ اپنی جگہ ہے۔ اس کا حال اچھا ہے۔ پچھلے دنوں یہ بحث اُٹھی تھی کہ کلکتہ مر رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ اِس شہر کے اپنے مسائل ہیں جو اگر حل نہ ہوں تو ایسے روگ بن جاتے ہیں جن سے جان خطرے میں پڑتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ شہر زندہ ہے۔ صرف اپنی عمارتوں، ٹریفک اور آبادی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس شہر کا اپنا کلچر ہے جو اسے زندہ رکھے گا۔"

کلکتے کا ایک اور بڑا اُردو روزنامہ "اخبار مشرق" ہے۔ خوبصورت آفسٹ پر چھپتا ہے اور دیدہ زیب اخبار ہے۔ بنارس، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن تک جاتا ہے۔ صوبائی حکومت پر نکتہ چینی بھی کرتا ہے چنانچہ سرکاری اشتہار کم ملتے ہیں۔ اخبار مشرق کے ایڈیٹر وسیم الحق صاحب کی رائے مختلف ہے۔ کہنے لگے :

"حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ مر رہا ہے۔ اگر ملک کے دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ یہ شہر سُکڑ رہا ہے اور سمٹ رہا ہے جو مرنے کی علامت ہوتی ہے۔ کاروباری اعتبار سے ملکی پیداوار میں کلکتے کا حصہ بہت کم ہو گیا ہے۔ یہاں جو بڑی بڑی تقریبات ہوا کرتی تھیں، اب نہیں ہوتیں۔ لوگ شام کو دیر تک گپ شپ کیا کرتے تھے۔ اب وہ کیفیت نہیں رہی۔ اہلِ کلکتہ خاص قسم کی ٹینشن میں رہ رہے ہیں جو ترقی معکوس ہے۔"

مَیں نے پوچھا کہ کیا اس میں مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کے آپس کے تعلقات بھی کارفرما ہیں ہے۔ اُنھوں نے کہا :

"اس کی ذمہ دار ریاستی حکومت ہے۔ اُس نے مزدوروں کی اُمنگوں کو اتنا اُبھا دیا کہ ان کی توقعات اتنی زیادہ بڑھ گئیں کہ معیشت اس کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مالکان اور مزدوروں میں ہم آہنگی نہیں اور ایک کشمکش جاری ہے۔"

وسیم الحق صاحب کے بعد مَیں مغربی بنگال اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کلیم الدین شمسی صاحب سے ملنے پہنچا۔ وہ خضر پور کے علاقے میں رہتے ہیں جو بندرگاہ کے قریب ہے۔ گارڈن ریچ اور مٹیا بُرج بھی دُور نہیں۔ تا حدِ نگاہ لال کھپریلوں کے نیچے نیچے مکان۔ سڑک کے کنارے دکانیں اور چائے خانے جن میں فلمی گانے بج رہے تھے۔ بیچ میں کلیم الدین شمسی صاحب کا نسبتاً نیا اور آرام دہ مکان جو دو منزلہ تھا اس لئے سب سے نمایاں تھا۔ وہ اپنے اُس کمرے میں بیٹھے تھے جسے دفتر کہا جاتا ہے اور علاقے کے لوگ اپنی اپنی شکایتیں لے کر ان کے پاس آ رہے تھے۔ کلکتے کے معاملات کو کلیم الدین صاحب خوب جانتے ہیں۔ شہر کی آبادی کے مسئلے اور بگڑتی ہوئی اقتصادی حالت کے بارے میں انہوں نے کچھ صاف طور پر اور کچھ ڈھکے چھپے لفظوں میں سب کچھ بتا دیا :

"کلکتے کی بندرگاہ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مرکز اور دیگر اداروں کی غفلت سے پورٹ کی حالت خراب ہے مگر یہ کہنا درست نہیں کہ یہ علاقہ مر چکا ہے۔ ہاں، نظر انداز ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ کلکتے کی بندرگاہ میں ابھی سات سال پہلے بیالیس ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اب وہاں صرف اُنیس ہزار کو روزگار ملتا ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستان کے اس علاقے کو بندرگاہ کی سخت ضرورت ہے لہٰذا دریا سے ہٹ کر سمندر کی طرف ہلدیا پورٹ بنایا گیا ہے۔ اب سارا کام وہاں سے ہونے لگے گا لیکن وہاں مشکل یہ ہے کہ نئی بندرگاہ میں تمام ملازمتیں صرف مقامی باشندوں کو دی جا رہی ہیں۔ حکومت نے بہت کوشش کی کہ کلکتے کے باشندے وہاں پر

جا سکیں لیکن ٹریڈ یونین نے سخت رویّہ اختیار کیا لہٰذا یہ نئی بندرگاہ کلکتے والوں کے لئے بند ہے۔"

تو یہ ہے صورتِ حال۔ ہلدیا میں نئی بندرگاہ کھل رہی ہے اور نوکری صرف بنگال کے پُرانے باشندوں کو ملے گی۔ کلکتے والے اپنی ہی انگلیوں سے ٹٹول کر اپنی ڈوبتی نبضیں دیکھا کریں گے۔

کلیم الدین صاحب نے یہ بھی بتایا کہ کلکتے کی ایک پُرانی رسم یہ تھی کہ جب کوئی ملازم بوڑھا ہو کر ریٹائر ہونے لگتا تھا تو اپنی جگہ اپنے بیٹے کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ اب یہ رسم اُٹھا دی گئی ہے۔ نیا ملازم صرف اور صرف دفترِ روزگار سے آئے گا۔ غیر صوبے کے لوگ، جن کا گزارہ صرف ملازمت پر تھا، ریٹائر ہو کر واپس اپنے دیس کو سدھاریں گے۔

کلکتے کے بارے میں کلیم الدین صاحب نے ایک اور دلچسپ بات کہی :

"اِس شہر کی آبادی دن میں ایک کروڑ بیس لاکھ اور رات میں ایک کروڑ ہوتی ہے۔ بیس لاکھ افراد باہر سے شہر میں آتے ہیں اور دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو باہر چلے جاتے ہیں۔ یہ بیس لاکھ افراد جو سارا پیسہ اس شہر سے کماتے ہیں لوکل اتھارٹی کو ٹیکس اور محصولات کا ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ شہر کی آمدنی پہلے ہی محدود تھی۔ اوپر سے بنگلہ دیش کے پناہ گزین اور ان کے بعد آسام کے بے شمار پناہ گزین آئے۔ شہر نے ان کی میزبانی کی، مگر بدقسمتی سے ان سے پیسہ ملنا تو درکنار، الٹا انہیں دینا پڑتا ہے۔ آبادی بڑھ گئی شہری سہولتیں گھٹ گئیں۔ اب ان سہولتوں میں توسیع ہونا بے حد ضروری ہے لیکن پیسے کی قلّت ہو اور شہر کی باضابطہ آمدنی نہ ہو تو ترقّی کا انتظام نہیں ہو سکے گا اور زندگی وبالِ جان بن جائے گی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر معقول رقم کا

انتظام نہ ہُوا تو کلکتے کو بچانا مشکل ہے۔"

کلیم الدین شمسی صاحب کے لہجے اور چہرے سے پریشانی صاف ظاہر تھی۔ اُس وقت مجھے کالی مندر کا وہ پُجاری بہت یاد آیا جو دیوی کے سامنے آنکھیں موندے، دُنیا زمانے سے بے نیاز گائے چلا جا رہا تھا اور اُسے ایسی کوئی دُبدھا نہیں تھی کہ کلکتہ رہے گا یا کہ نہیں رہے گا۔ اِس میں قوم بسے گا یا بلا رہے گی۔

ہگلی کیچڑ سے بھر چکی تھی۔

پانی گلے گلے آچکا تھا۔

کل کیا ہوگا؟

سیاحوں کی بس جی ٹی روڈ پر چلی جارہی تھی اور ایک سانولا سا نوجوان گائیڈ، جس کے سر کا سارا تیل ماتھے پر پھیلتا ہُوا بھنوؤں تک آچکا تھا، اس تاریخی سڑک کا حال کہہ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے ایک دلچسپ بات کہی اور شاید میرے سوا کسی نے اس بات پر دھیان نہ دیا۔ اُس نے کہا کہ جی ٹی روڈ اور دریائے گنگا، دونوں کی لمبائی برابر ہے۔

مَیں سوچنے لگا کہ دونوں میں بہت کچھ اور بھی تو مشترک ہے۔ دونوں قدیم ہیں۔ دونوں وقت کے ساتھ اپنے راستے بدلتی رہی ہیں۔ دونوں کا حال اُن رگوں جیسا ہے جن میں زندگی دوڑتی ہے ——— اور میرے نزدیک دونوں مقدس بھی ہیں۔

مقدس وہی تو ہوتا ہے جو زندگی دے، جینے کے اسباب دے اور وہ جہاں بھی جائے، اُمنگیں، ولولے اور جولانیاں ساتھ ساتھ جائیں، وہ چاہے دریا ہو، چاہے سڑک اور چاہے ماں۔

کلکتے پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ بوٹینکل گارڈن کے چائے خانے سے چائے کا پیالہ لے کر میں ہگلی کے کنارے جا بیٹھا اور دُور اُفق تک دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر میری نظر سے میری فکر تیز نکلی۔ پندرہ سو میل کی راہ جو میں نے کتنے دکھ اُٹھا کر مہینے بھر میں طے کی تھی، اس وقت دل اور دماغ نے ایک لمحے میں طے کر لی۔ راہ کے سارے منظر اور سارے پڑاؤ

ایک بار یوں نظر آنے لگے جیسے مَیں فضا میں بلند ہو کر دُور تک دیکھنے لگا ہُوں۔ سفر کے سارے تجربے اور احساس ایک قطار میں یُوں دکھائی دیئے جیسے شیر شاہی سڑک کے کنارے کنارے کھڑے ہُوئے کوس مینار۔ وہ شہر، وہ گلیاں، وہ لوگ اور ان کی وہ اُمنگیں اور وہ اُداسیاں سب یوں لگے جیسے ایک لمبی ڈوری میں پروئی ہوئی مالا۔

کوئی مجھ سے پوچھے کہ احساس اور شعور کے اس سارے تجربے کو ایک جملے میں کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے تو مَیں کہوں گا کہ پشاور سے کلکتے تک لہجے مختلف اور زبانیں جُدا مگر بات ایک ہی تھی۔ پُرانی نسل کو گزرے ہُوئے کل کی یاد ستا رہی تھی اور نئی نسل کو آنے والے کل کی خبر نہ تھی۔ دونوں نسلیں ایک دوسرے سے دُور ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس کے گئے دنوں کے دکھڑے اِس کی سمجھ سے باہر تھے۔ اِس کی کھلی فضا میں بے روک ٹوک جھوم جھوم جانے کی اُمنگ اُس کی عقل سے بالاتر تھی۔ بستیوں کی پُرانی حدیں مٹ چکی تھیں۔ ذہن کے دریچے کھل چکے تھے جن کے راستے دنیا بھر کا ادب، ایک زمانے کی کتاب، کُل ثقافتوں کے رسالے، تمام منظروں کا ٹیلیویژن اور سارے نظریوں کا ریڈیو ایک سیلاب بن کر اندر چلا آیا تھا۔

وقت نے زندگی کے انداز کو بالکل ڈھال ڈالا تھا۔

پاکستان میں دولت برس رہی تھی۔ معاشیات سے لے کر منشیات تک مختلف وسیلوں سے امارت چلی آئی تھی۔

ہندوستان میں دولت اُبل رہی تھی۔ ستر کروڑ کا یہ ملک غلّے کے معاملے میں اتنا خود کفیل ہو گیا تھا کہ پانی پت میں ٹرک ڈرائیوروں نے مجھے بتایا کہ اب گوداموں میں غلّہ رکھنے کی جگہ نہیں رہی، ہم تمام بوریاں باہر کھلے آسمان کے نیچے ڈال آتے ہیں۔

مگر اس ظاہری خوشحالی سے زندگی میں کیا داخل ہوا ہے اور زندگی سے کیا نکل گیا ہے، اس کا میزانیہ بناتے ہوئے جی گھبراتا ہے۔

جو چلا گیا وہ سکون ہے ، جو داخل ہوا وہ اضطراب ہے۔

جس سرزمین پر کبھی صرف محلے کے مکان ، لائبریری کی کتاب اور بائیسکل ، یہ تین چیزیں کرائے پر ملا کرتی تھیں اب وہاں اچھے بُرے ویڈیو کیسٹ اور کلاشنکوف رائفلیں کرائے پر دستیاب ہیں۔ گھر کی چار دیواری محفوظ ہے نہ باہر کی کھلی فضا۔ اب لوگ مارنے مرنے پر نہیں، صرف مارنے پر آمادہ ہیں۔ اب جو طاقتور ہے وہ عدالتی کارروائیوں کا قائل نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ شام کے جھگڑے کا فیصلہ صبح سے پہلے پہلے ہو جائے۔ اندھیر ہے !

اضطراب کا یہ حال کہ جیسے صبر کا یارا جاتا رہا۔ جیسے اچھے دنوں کے انتظار کی سکت جاتی رہی۔ انسان کا جی کب نہ چاہا کہ یوں ہو اور یوں ہو مگر آج کا انسان چاہتا ہے کہ یوں ہو اور ابھی ہو۔ پیسہ ، کار ، رنگین ٹیلیویژن ، ویڈیو ، اے سی ، جو کچھ آتا ہے راتوں رات آجائے۔ اگلی صبح نمودار ہو تو گھر آنگن غیر ملکی چیزوں سے بھرے نظر آئیں۔

خواہشوں کی رفتار اور ہوتی ہے فطرت کی چال اور۔ اس مرتبہ اس دَوڑ میں فطرت ہار گئی ہے اور رشوت جیت گئی ہے۔ دہلی میں کسی نے کہا کہ دیکھئے کیسا زمانہ آگیا ہے۔ اب اسکول کالج کے استاد بھی رشوت لینے لگے ہیں۔ اسلام آباد کے ایک ڈرائیور نے کہا کہ میں ۱۴ سال سے گاڑی چلا رہا ہوں ، آج تک کسی پولیس والے کو میں نے اپنا لائسنس نہیں دکھایا۔ اُسے بیس تیس روپے دے کر دن آرام سے گزر جائے تو لائسنس وغیرہ دکھانے کی کھکیڑ میں کوئی کیوں پڑے۔

جی ٹی روڈ پر ایک سرکاری افسر کاریں روک روک کر ان کی تلاشیاں لے رہے تھے اور تلاشیوں سے زیادہ رشوت لے رہے تھے۔ کسی خر دماغ نے اُن افسرِ صاحب سے ان کا شناخت نامہ طلب کر لیا۔ پتہ چلا کہ معمولی سے ملازم تھے جن کا کام کاروں کی تلاشی لینا نہیں بلکہ یہ دیکھنا تھا کہ کار میں لگے ہوئے ریڈیو کا لائسنس بنوا لیا گیا ہے یا نہیں۔

امتحان پاس کرنے کے لئے نوجوان رشوت دے رہے ہیں۔ لڑکیاں بیاہی جا رہی

ہیں تو سسرال والے رشوت مانگ رہے ہیں۔ کرنال میں ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ اِس معاشرے میں لڑکی کا باپ ہونا بھی گناہ ہے۔

داستانوں کے خاتمے پر اب یہ نہیں کہا جاتا کہ جیسے خدا نے اُن کے دن پھیرے، سب کے دن پھیرے۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا دن پھیرے اور راتوں رات پھیرے۔

سبب سیدھا سادا ہے۔ کل کی کسی کو خبر نہیں۔ گزرتے ہوئے پل کے رکھوالوں پر کسی کو اعتبار نہیں اس لئے ذہن اندر سے کچوکے لے رہا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے، ابھی کر لو۔

وہ جو منصوبے بنا کرتے تھے، وہ جو مشورے ہوا کرتے تھے باہم۔ وہ سب ختم ہوگئے۔ اب ہر روز کے معاملے اُسی روز نمٹاتے کی حکمت اختیار کر لی گئی ہے۔ نئے دن کی فکر نئی صبح سے پہلے شروع نہیں ہوتی۔

پھر ایک نفسا نفسی بڑے غضب کی آئی ہے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی طبیعت پر گراں گزر رہی ہے۔ ایک کی ترقی پر دوسرے کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ جیسے قسم کھائی گئی ہو کہ کسی دوسرے کو خوش نہیں ہونے دیں گے۔ گوجرانوالہ میں ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ جب کبھی کہیں سے اُس کی شادی کا پیغام آتا ہے، محلّے والے دوڑے دوڑے جاتے ہیں اور لڑکے والوں کے کان میں لڑکی کے خلاف سو باتیں پھونک آتے ہیں۔

پھر یہ کہ کوئی کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ ذرا کسی کے حق میں کلمۂ خیر کہہ کر دیکھئے، کتنی ہی پیشانیوں پر بل آجائیں گے۔ کبھی کسی سے کسی دوسرے کے بارے میں رائے لے کر تو دیکھئے۔

مَیں ایک شہر سے ٹرین میں سوار ہُوا۔ ریلوے کے ایک افسر بھی میرے پاس آ بیٹھے۔ وہ بھی اُسی شہر کے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ نے اپنے ریڈیو پروگرام کے لئے شہر میں کس کس کو انٹرویو کیا ؟

مَیں نے خوش ہو کر ایک صاحب کا نام بتایا۔ کہنے لگے، وہ ؟ وہ تو علاقے کے ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے شہر کے ایک اور بزرگ کا نام لیا۔ کہنے لگے: وہ؟

سخت بے ایمان، خدا جانے کس کو دھوکا دے کر اس کا مکان نیلام کروایا اور فریب سے خود خرید لیا، حیرت ہے آپ کو انٹرویو کے لئے کوئی معقول آدمی نہیں ملا۔

کل کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے لوگ اب مذہب کا دامن تھام رہے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک مذہب کی ایک نئی لہر اُٹھی ہے۔ بے شمار مندر بن رہے ہیں، بے شمار مسجدیں بن رہی ہیں جنہیں ائرکنڈیشن کر کے وال ٹو وال کارپٹ، ڈالے جا رہے ہیں۔

بہار میں ایک پہاڑی کے اوپر مسجد تھی اور ذرا نیچے مندر تھا۔ پچاس سال بعد اچانک کسی کو خیال گزرا کہ مسجد اونچی ہے اور مندر نیچا، چنانچہ مندر کی عمارت اتنی اونچی کی گئی کہ وہ مسجد سے اونچا ہوگیا۔ پنجاب میں مسجدوں پر لکھ دیا گیا ہے کہ یہ فلاں مسلک کی مسجد ہے، یہ فلاں مسلک کی۔ ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ دوسرے مسلک والے حضرات اندر نہ آئیں۔

پیروں فقیروں کے مزاروں پر خوب رونق ہے۔ مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم چڑھاوے چڑھا رہے ہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی داستانوں سے مایوس ہو کر لوگ کب کے سوئے ہوؤں کے آستانوں پر جا پہنچے ہیں۔

کہیں رات رات بھر قوالی ہو رہی ہے اور غیر مسلموں کے محلے میں اونچائی پر لاؤڈ اسپیکر لگا دیئے گئے ہیں کہ کہیں کوئی چین سے نہ سو جائے۔ کہیں رات رات بھر دھارمک اور دیش بھگتی کے گیت گائے جا رہے ہیں اور سارا شہر کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹ رہا ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے موجد کو پانی پی پی کر کوس رہا ہے۔

انسان جیسے زمین سے پھٹ پڑا ہے۔ بعض شہروں میں راہ چلنا مشکل ہے۔ ایک کھوا نہیں سارا وجود چھلا جا رہا ہے۔ پوری پوری آبادیاں نقل مکانی کر رہی ہیں۔ کچھ کو سیاست نے مجبور کیا ہے کچھ کو معیشت نے۔ اس پر یہ آواز اُٹھنے لگی ہے کہ یہ ہماری زمین تھی، تم اس پر کیوں آئے؟ یہ ہمارا علاقہ تھا، یہاں تمہارا کیا کام؟

ایک بہت بڑے شہر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ اُس میں

دوسرے خطوں کے لوگ آ بسے ہیں۔ اس کی جگہ ایک دوسرا شہر بنایا جا رہا ہے جس میں باہر والوں کو آباد ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یوں اب نئی نئی دیواریں اُٹھائی جا رہی ہیں جن میں سے باہر جانے کا دروازہ ہو یا نہ ہو، اندر آنے کا اب کوئی روزن تک نہیں۔

پندرہ سو میل کی اس سڑک پر ایک داستان تعلیم کی بھی ہے۔

زیادہ تر کو نصیب نہیں۔ جن کو ہے اُن کے بارے میں یہ طے نہیں کہ سات مضمون پڑھائے جائیں یا نو یا گیارہ۔ یہاں کی زبان میں پڑھائے جائیں یا وہاں کی زبان میں۔ کہیں ہندی ہندی کا نعرہ ہے کہیں اُردو اُردو کا، مگر بچے کے ماں باپ کو نہ ہندی کی فکر ہے نہ اُردو کی پروا۔ اُن کا بس ایک ہی خواب ہے کہ بچہ کسی طرح انگریزی پڑھ جائے۔ زندگی کے سارے انٹرویو، ٹیسٹ اور اچھی ملازمتیں اسی ایک انگریزی کے دم سے ہیں۔ جس کی انگریزی کمزور رہ گئی اس کے مقدر میں فاقے لکھے گئے۔

لاہور میں ایک گھرانا ایسا دیکھا جس میں نوکر کے سوا سب لوگ صبح و شام صرف انگریزی بول رہے تھے۔ گفتگو انگریزی میں، خط و کتابت انگریزی میں، ڈانٹ ڈپٹ، ٹیلی فون پر بات چیت، معاشقے اور خواب، سب انگریزی میں۔

ہندوستان کے ایک ہوائی اڈے پر ایک میاں بیوی کو دیکھا جو آپس میں ہندی بول رہے تھے مگر شریر بیٹے کو انگریزی میں سمجھا رہے تھے کہ وہ باز آ جائے۔ دلّی کے اُردو بازار کے پچھواڑے ایک گھرانے میں بچوں کی تعلیم کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ انگلش میڈیم کے جتنے بھی اسکول ہیں ان سب میں بچے اس بُری طرح بھر چکے تھے کہ اب جگہ نہیں رہی تھی اور نئے بچوں کے والدین سے مختلف ناموں اور بہانوں سے بڑے بڑے عطیے اور چندے مانگے جا رہے تھے: ایک نیا کلاس روم بنوا دیجئے۔ ہم آپ کے بچے کو داخل کر لیں گے۔

ٹیلی وژن نے ذہنوں کو بدلنا شروع کر دیا ہے۔ جس چیز کا اشتہار آتا ہے لوگ اُسے خریدنے بازار کی طرف دوڑ پڑتے ہیں چنانچہ گلی گلی، محلّے محلّے مارکیٹیں، سوپر مارکیٹیں، شاپنگ

سنٹر، شاپنگ پلازا اور خدا جانے کیا کیا بن رہا ہے۔ لوگ اپنے مکانوں کو فلم کے سیٹ کی طرح سجانے کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ کنبے کے کنبے سرِ شام ٹیلی ویژن کے آگے دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں اور قومی ترانے تک جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ شام کی ملاقاتیں، وہ گلی کی موڑ پر کھڑی ہوئی دوستوں کی ٹولیاں، وہ محفلیں، وہ خوش گپیاں، یہ ایک چوکور ڈبہ اُن سب کو نگل گیا۔

اس طویل سفر میں کتنے تھوڑے سے لوگ ملے جن کی زندگیاں شمع کی صورت تھیں۔ کوئی اسپتال کھول رہا تھا۔ کوئی اسکول اور تربیتی مرکز کھول رہا تھا۔ کوئی غریبوں، اپاہجوں اور معذوروں کے لئے کچھ کر رہا تھا اور کوئی غریب لڑکیوں کی شادیاں کرا رہا تھا اور یتیموں کو سہارا دے رہا تھا۔

مگر خدا کے ایسے نیک بندوں کو انگلیوں پر گِن جا سکتا تھا اور وہ بھی ایک ہاتھ کی۔

دوسری طرف غریبوں کے تھکے ہوئے ذہن اور چور چور بدن ہار گئے تھے۔ اب کیا ہوگا؟ انہیں خبر نہ تھی۔ شاید کبھی یوں ہو کہ اُن کے دن پھریں۔ وہ خوش گمانیوں میں مبتلا تھے۔

دونسلوں کی بات کانپور کے گیارہ بارہ برس کے قائم رضا اور سادات کی پُرانی قبروں کی دیکھ بھال کرنے والی اس کی بوڑھی نانی نے کہہ ڈالی۔

قائم رضا کئی مہینے سے کسی مستری سے اسکوٹر کی مرمّت کا کام سیکھ رہا تھا۔ وہ روز صبح کام پر خالی ہاتھ جاتا تھا اور روز شام کام سے خالی پیٹ آتا تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا تھا "یہ مستری تمہیں پیسے کب دیں گے؟"

"جب دیں!"

"کتنے پیسے دیں گے؟"۔

"جتنے دیں!"

اور پھر مَیں نے قائم رضا کی ضعیف نانی سے پوچھا تھا "اب کیا ہوگا؟"۔

"مولا آئیں گے بیٹا۔ ہمیں خود انتظار ہے کب آتے ہیں مولا"

1547

ایک تاریخی شاہراہ کے بدلتے منظر

رضا علی عابدی نے کیا کتاب لکھی ہے۔ ہر صفحے پر جیسے رنگا رنگ شگوفے کھل رہے ہوں، دھیمے مزاح کے، لطیف نکتوں کے اور جذب میں ڈوبے ہوئے مشاہدات کے۔ کیسی سادہ زبان میں کتنی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔ کتاب پڑھ کر مصنف کے ایک تاریخی شاہراہ سے جذباتی لگاؤ کا اندازہ بھی ہوا اور یوں لگا جیسے پشاور سے کلکتے تک تمام راستے زندگی بھر کی یادیں بھورے بادلوں کی طرح ساتھ چلی آرہی ہوں۔

رضا علی عابدی لکھنے سے ایک تار چھیڑ دیتے ہیں اور ذہن میں پورا ساز ینہ جھنجھنا اٹھتا ہے، بول سکنے لگتے ہیں، خیال لہراتے ہیں اور دھوپ میں جلتی ہوئی شاہراہ یادوں کا ایک سلسلہ بن کر دہکنے لگتی ہے۔

کس محبت اور کاوش سے رضا علی عابدی نے صدیوں پرانی عمارتوں کو نہ صرف پہچانا ہے بلکہ ایک بار پھر ان کو آباد کر دیا ہے۔ مکان اور مکین، بازار اور گلیاں، دکاندار اور خریدار، رکشہ والے، بسوں کے ڈرائیور، شاعر، ادیب، استاد، طالب علم اور پرانی روایتوں کے امین ایک ایک کر کے آپ کے گرد جمع ہونے لگتے ہیں اور آپ بھی ان میں شامل ہو کر تاریخ کے ایک باب اور تہذیب کے ایک دور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

الطاف گوہر

سعد پبلی کیشنز۔ کراچی